قوم کی آواز

مہاتما گاندھی کی تقریریں جو انہوں نے گول میز کانفرنس

میں کیں اور ان کے سفر لندن کے حالات

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے۔ پی ایچ، ڈی

☆

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

قوم کی آواز

مہاتما گاندھی کی تقریریں جو انھوں نے گول میز کانفرنس میں کیں

اور ان کے سفر لندن کے حالات

مرتبہ۔ سی راج گوپال اچاریہ و جے سی کمار اپا

مترجمہ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱۹۳۳ء

عرض ناشر

اردو داں لوگوں کو مہاتما گاندھی کی تصانیف کے ترجمہ کا جس قدر اشتیاق ہے اس کا ثبوت "تلاش حق" کی مقبولیت سے مل گیا۔ مکتبہ جامعہ ملیہ نے مہاتما جی کی کل تصانیف کے ترجمہ کا انتظام کر لیا ہے اور امید ہے کہ ایک سال کے اندر کئی کتابیں چھپ کر شائع ہو جائینگی "قوم کی آواز" اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے اسکی اشاعت اس لیے مقدم رکھی گئی کہ اس کا مضمون نہایت اہم مسائل سے متعلق ہے جو آج کل چھڑے ہوئے ہیں۔ سیاسی اصلاحات کے معاملات میں مہاتما جی کی وہ تقریریں جو انھوں نے گول میز کانفرنس میں کیں ہندستانیوں کے حقیقی خیالات و جذبات کا آئینہ ہیں جس شخص کی بدولت برطانیہ جیسی سلطنت کو گول میز کانفرنس کرنی پڑی جس کے راضی کرنے پر کانفرنس کی کامیابی منحصر تھی اور ہے اسکی تقریریں کوئی عارضی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ہندستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اسکے علاوہ انگلستان کے مختلف طبقے اور مختلف خیال کے لوگوں سے مہاتما جی کی ملاقات و گفتگو کا ذکر ہر لحاظ سے دلچسپ ہے اس سے ایک طرف یورپ اور ایشیا کی ذہنی اور روحانی خصوصیات میں مقابلہ کرنیکا موقع ملتا ہے تو دوسری طرف ہندوستان اور انگلستان کے آیندہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب بھی "تلاش حق" کی طرح قبول عام کی سند حاصل کریگی۔

قومی مطالبہ

یہ بیں آپ سے پہلے ہی عرض کردوں کہ آپ حضرات کے سامنے ہندوستانی قومی کانگریس کا نقطۂ نظر پیش کرنے میں مجھے بڑی الجھن کا سامنا ہے۔ میں جس نیت سے اس سب کمیٹی میں اور گول میز کانفرنس میں، جو اپنے وقت پہ ہوگی شرکت کرنے آیا ہوں وہ سراسر یہی ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کروں اور مجھ سے جہاں تک بن پڑے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر وہ باتیں نکالوں جن میں میری اور آپ کی رائے ایک ہے۔ میں ملک معظم کو یقین دلاتا ہوں کہ اوّل سے آخر تک نہ میری یہ خواہش ہے اور نہ ہوگی کہ ارباب اختیار کو الجھن میں ڈالوں۔

آپ سب حضرات بھی جو میرے رفیق کار ہیں مطمئن رہیں کہ چاہے میرے اور آپ کے خیالات میں کتنا ہی اختلاف ہو، میں آپ کے کام میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ اس لئے میرا یہاں رہنا یا نہ رہنا سراسر آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر کسی وقت میں نے یہ دیکھا کہ مجھ سے کانفرنس کی کوئی مفید خدمت نہیں ہوسکتی تو مجھے اس سے الگ ہو جانے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا۔ اور جن حضرات کے ہاتھ میں اس کمیٹی کا اور کانفرنس کا انتظام ہے ان سے بھی میری یہ گذارش ہے کہ جہاں میں نے آپ کی طرف سے ذرا سا اشارہ پایا میں بے تامل رخصت ہو جاؤں گا۔

مجھے یہ باتیں مجبوراً کہنا پڑیں کیونکہ مجھے معلوم ہے حکومت اور کانگریس کی رائے میں بنیادی اختلافات ہیں اور ممکن ہے کہ میری اور میرے رفیقوں کی رائے میں بھی اہم اختلافات موجود ہوں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ میں اپنے طرز عمل میں آزاد نہیں۔

بلکہ پابند ہوں۔ میں ایک ادنےٰ سا نمائندہ ہوں ہندوستانی قومی کانگریس کا۔ اس لئے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کانگریس کیا چیز ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔ مجھے آپ حضرات سے ہمدردی کی توقع ہے کیونکہ میرے کندھوں پر اس وقت بہت بڑا بوجھ ہے۔

کانگریس کیا چیز ہے اگر میرا خیال غلط نہیں تو کانگریس ہندوستان کی سب سے قدیم سیاسی انجمن ہے۔ اس کو قائم ہوئے تقریباً پچاس برس ہو چکے۔ اس عرصہ میں اس کے سالانہ جلسے بلاناغہ ہوتے رہے۔ وہ حقیقت میں اسم بامسمّٰی ہے یعنی قومی جماعت ہے۔ وہ کسی ایک فرقے یا طبقے یا اہم غرض گروہ کی نمائندہ نہیں ہے۔ اسے ہندوستان کے کل طبقوں اور گروہوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ اس کا خیال سب سے پہلے ایک انگریز کے ذہن میں آیا تھا۔ ہم لوگ ایلن آکٹیویس ہیوم کو کانگریس کا بانی سمجھتے ہیں۔ اس کی نشو و نما دو بزرگ پارسیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ جن میں سے ایک سر فیروز شاہ مہتا تھے اور دوسرے دادا بھائی نوروجی، جنھیں سارا ہندوستان فخر و مسرّت کے ساتھ اپنا "پیر کبیر" مانتا تھا۔ ابتدا ہی سے کانگریس کے ارکان میں مسلمان، عیسائی، دیسی انگریز غرض ہر مذہب و ملت کے نمائندے کم و بیش موجود تھے۔ بدرالدین طیب جی مرحوم دل و جان سے کانگریس کے ساتھ تھے۔ اس کے صدر مسلمان بھی رہے ہیں اور عیسائی بھی۔ ایک ہندوستانی عیسائی صدر کانگریس یعنی و۔ س۔ بنرجی کا نام مجھے اس وقت یاد آتا ہے۔ کالیچرن بنرجی بھی جن سے بڑھ کر پاک نفس ہندوستانی کی ملاقات کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا، کانگریس کے رُکن تھے۔ مجھے بہت افسوس ہے اور آپ کو بھی ہوگا کہ آج ک۔ ٹ۔ پال ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ وہ کانگریس

کے باضابطہ رکن تو نہیں تھے مگر سچے محب قوم تھے اور کانگریس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم جن کا آج موجود نہ ہونا بھی ہم سب کے لئے باعث تاسف ہے، کانگریس کے صدر رہ چکے تھے اور آج کل ہماری مجلس عاملہ میں پندرہ ارکان میں سے چار مسلمان ہیں۔ ہماری انجمن کی صدر عورتیں بھی رہی ہیں۔ پہلے ڈاکٹر اینی بیسنٹ ہوئیں اور ان کے بعد بیگم سروجنی نائیڈو جو ہماری مجلس عاملہ کی رکن بھی ہیں۔ غرض جہاں ہمارے یہاں ذات اور عقیدے کا امتیاز نہیں کیا جاتا وہاں جنس کا بھی امتیاز نہیں ہے۔

اس جماعت کی، جسے دنیا اچھوت کہتی ہے، کانگریس ابتدا ہی سے حمایت کرتی رہی ہے۔ ایک زمانہ میں کانگریس کے ہر سالانہ اجلاس کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر، انجمن اصلاح معاشرت (سوشل کانفرنس) کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اس انجمن کو منجملہ اور بہت سے کاموں کے رانا ڈے آنجہانی نے اپنی سعی کا مرکز بنا رکھا تھا۔ ان کی سرکردگی میں چھوت چھات کی اصلاح کی کوشش انجمن کے پروگرام میں بہت نمایاں حیثیت رکھتی تھی مگر ۱۹۲۰ء میں کانگریس اس سے کہیں آگے بڑھ گئی۔ اس نے چھوت چھات دور کرنے کے مسئلے کو سیاسی مسائل میں داخل کر دیا۔ اور اسے اپنے سیاسی پروگرام کا ایک اہم جز بنا لیا۔ جس طرح وہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کو جس سے مراد کل اعلیٰ مذاہب کا اتحاد ہے، سوراج حاصل کرنے کے لئے ناگزیر سمجھتی تھی اسی طرح سے چھوت چھات دور کرنے کو بھی کامل آزادی حاصل کرنے کی ناگزیر شرط سمجھنے لگی۔

جو نقطۂ نظر کانگریس نے ۱۹۲۰ء میں اختیار کیا تھا اس پر وہ بدستور قائم ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کانگریس کی ابتدا ہی سے یہ کوشش ہے،

کہ اہم باستثنے ثابت ہو یعنی ہر لحاظ سے قومی کہی جا سکے۔

اگر والیان ریاست اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ ابتدا ہی میں کانگریس نے آپ حضرات کی بھی حمایت کی تھی۔ میں اس کمیٹی کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ شخص جس نے کشمیر اور میسور کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہندوستان کا پیر کبیر تھا۔ میری عاجزانہ اور ناچیز رائے ہیں ان دونوں ریاستوں کے عالی مرتبہ فرمانروا خاندانوں کو دادا بھائی نوروجی اور کانگریس کی بدولت کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔ آج کل بھی کانگریس ہندوستان کے والیان ریاست کی خدمت اس طرح کر رہی ہے کہ ان کے اندرونی اور خانگی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرتی۔

مجھے امید ہے کہ اس مختصر تمہید سے جو میں نے مناسب سمجھ کر بیان کی سب کمیٹی کے ارکان اور دوسرے حضرات جو کانگریس کے مطالبات سے دلچسپی رکھتے ہیں، یہ اندازہ کرلیں گے کہ اس نے جو دعوے کیا اسے ثابت کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتی رہی مجھے معلوم ہے کہ وہ بارہا اس دعوے کے پورا کرنے میں قاصر بھی رہی لیکن اگر آپ اس کی پوری تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ دیکھیں گے کہ اس کی کامیابی کے موقعے ناکامی کے موقعوں سے زیادہ تھے اور یہ نسبت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندستان کے کروروں بے زبان، نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں، چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ہندی ہند[51] کے جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں ان سب پر مقدم ان کروروں بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ظاہر ہیں ایک دوسرے سے لڑتی نظر آتی ہیں اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض لڑ جائیں تو میں

---

[51] دیسی ریاستیں۔

کانگریس کی طرف سے بے دھڑک کہتا ہوں کہ کانگریس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اصل میں کانگریس کسانوں کی جماعت ہے یا رفتہ رفتہ ہوتی جاتی ہے۔ آپ حضرات کو یہاں تک کہ اس سب کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں کو بھی یہ سنکر تعجب ہوگا آج کانگریس نے اپنی ایک ماتحت انجمن چرخا سنگھ کے ذریعے سے تقریباً دو ہزار گانوؤں میں پچاس ہزار[1] عورتوں کو کام سے لگا رکھا ہے جن میں شاید آدھی عورتیں مسلمان ہوں گی۔ ہزاروں اُن میں سے ہیں جو اچھوت کہلاتے ہیں۔ اس طرح ایک تعمیری کام کے سلسلے میں ہم لوگ ان گانوؤں میں پہونچ چکے ہیں اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس سلسلہ میں سات لاکھ گانوؤں میں سے ہر ایک گاؤں شامل ہو جائے۔ یہ کام فوق البشر قوت کا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر انسانی سعی سے اس کا انجام پانا ممکن ہو تو آپ بہت جلد دیکھیں گے کہ کانگریس کا قدم ان سب گانوؤں میں پہونچ چکا ہے اور انہیں چرخے کا پیام بھیجا جا رہا ہے۔

کانگریس کیا چاہتی ہے | اگر یہ ثابت ہے کہ کانگریس قوم کے ہر طبقے کی وکیل ہے تو آپ کو میری زبان سے وہ ہدایتیں سُنکر تعجب نہیں ہوگا جو مجھے کانگریس سے ملی ہیں۔ خدا کرے آپ کو اُن کے الفاظ ناگوار نہ ہوں۔ شاید آپ کو کانگریس کا مطالبہ سراسر بے جا معلوم ہو۔ بہر حال وہ جیسا بھی ہو، میرا کام یہی ہے کہ اسے کانگریس کی طرف سے نہایت نرمی سے مگر پورے زور کے ساتھ پیش کر دوں۔ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ اس دعوے کی پیروی میں عقیدے اور عمل کی ساری قوت جو میرے اندر ہے صرف کر دوں۔

---

[1] چرخا سنگھ کے کل رکن جو کتائی کا کام کرتے ہیں اب تک ایک لاکھ اسی ہزار (۱۸۰۰۰۰) ہیں ؛

اگر آپ مجھے قائل کردیں کہ یہ دعویٰ کروڑوں بے زبانوں کے مفاد کے خلاف ہے تو میں اپنی رائے بدل دوں گا۔ میں آپ کی دلیلیں سننے کے لئے اور ماننے کے لئے تیار ہوں مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ جب میں رائے بدلوں تو کانگریس سے اس کی منظوری مانگوں ورنہ میں اس کے ایلچی کی حیثیت سے کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا اب میں آپ کو کانگریس کی ہدایتیں پڑھ کر سناتا ہوں تاکہ آپ کو ان قیود کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے جن کا میں پابند ہوں۔

یہ ایک تجویز ہے جو ہندوستانی قومی کانگریس کے اجلاس کراچی میں منظور ہوئی تھی "۔ کانگریس کا یہ جلسہ اس عارضی قرارداد پر غور کرنے کے بعد جو مجلس عاملہ میں اور حکومت ہند میں ہوئی تھی اس کی توثیق کرتا ہے اور اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ کانگریس کا مقصد بدستور "پورن سوراج" یعنی کامل آزادی ہے۔ اگر کانگریس کے لئے کوئی ایسی راہ باقی رہی کہ وہ حکومت برطانیہ کے نمائندوں کے ساتھ کسی کانفرنس میں شرکت کر سکے تو کانگریس کے نمائندے اس مقصد کے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے خصوصاً اس بات کی کہ قوم کو فوج، امور خارجہ، مالیات، محاصلات اور معاشی نظام پر پورا اختیار حاصل ہو اور ایک غیر جانب دار عدالت حکومت برطانیہ کی ان مالی کارروائیوں کو جو ہندوستان میں کی گئی ہیں جانچنے کے بعد یہ تشخیص کر دے کہ ان کی ذمہ داری کتنی ہندوستان پر ہونا چاہیئے اور کتنی انگلستان پر، اور طرفین کا یہ حق تسلیم کر لیا جائے کہ جب چاہیں شرکت سے دست بردار ہو جائیں۔ البتہ کانگریس کے نمائندوں کو ان ترمیمات کے قبول کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے جو ہندوستان کے مفید مطلب ثابت کی جا سکیں"۔

اس کے بعد وہ حصہ ہے جس میں نمائندے کے تقرر کا ذکر ہے۔ میں نے اس

ہدایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت غور سے ان عارضی تجاویز کا مطالعہ کیا ہے جو گول میز کانفرنس کی مختلف سب کمیٹیوں نے منظور کی ہیں۔ میں نے اس بیان پر بھی غور کیا ہے جس میں وزیر اعظم نے ملک معظم کی حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی کا اظہار کیا ہے۔ میں جو عرض کروں اس میں کوئی بات غلط ہو تو آپ حضرات اصلاح کر دیجئے مگر جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ بیان کانگریس کے مقصد اور مطالبے کو پورا نہیں کرتا - یہ سچ ہے کہ مجھے ایسی ترمیموں کے قبول کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جو ہندوستان کے مفید مطلب ثابت کی جاسکیں مگر ان کا اُن بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے جو کانگریس کی ہدایت میں بیان کئے گئے ہیں۔

اب میں اُس قرارداد کی شرائط کا ذکر کرتا ہوں جو میرے نزدیک ایک مقدس معاہدہ ہے یعنی وہ قرارداد جو حکومت ہند اور کانگریس میں ہوئی تھی۔ اس قرارداد کی رو سے کانگریس نے ایک تو وفاقی[۵۱] حکومت کا اصول تسلیم کر لیا ہے، دوسرے یہ اصول کہ مرکزی حکومت ذمہ دار حکومت[۵۲] ہو، تیسرے یہ اصول کہ بعض تحفظات[۵۳] رکھے جائیں بہ شرطیکہ ان کا ہونا ہندوستان کے مفاد کیلئے ضروری ہو۔

برابر کی شرکت

اِس کانفرنس کے ایک رُکن نے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا ایک فقرہ استعمال کیا تھا جو میرے دل میں بیٹھ گیا۔ انھوں نے کہا "ہمیں محض سیاسی دستور نہیں چاہیئے"۔ خدا جانے ان کا منشا اس سے وہی تھا یا نہیں جو فوراً میرے ذہن میں آیا مگر میں نے اسی وقت اپنے

---

۵۱ federal

۵۲ responsible

۵۳ safeguards

جی میں سوچا "مجھے اپنا مطلب ظاہر کرنے کے لئے بہت اچھا فقرہ مل گیا" حقیقت میں اس دستور سے کانگریس ہرگز مطمئن نہیں ہوگی اور میں بھی اپنی ذات سے کبھی مطمئن نہیں ہوں گا جو پڑھنے میں تو ایسا معلوم ہو کہ ہندوستان کو منہ مانگے سیاسی حقوق دیتا ہے لیکن اصل میں کچھ بھی نہ دے۔ ہم جو کامل آزادی حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اس میں غرور و تکبّر کو دخل نہیں ہے۔ اس کی غرض یہ نہیں ہے کہ ہم دنیا کے سامنے اس پر اترائیں کہ دیکھو ہم نے برطانوی قوم سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ اس کے برعکس خود اس ہدایت سے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس کے پیش نظر شرکت کا خیال ہے کانگریس برطانوی قوم سے تعلق رکھنا چاہتی ہے مگر یہ تعلق اس قسم کا ہونا چاہیئے جیسا دو برابر کے فریقوں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے برطانیہ کی رعایا ہونے اور کہلانے پر فخر تھا۔ اب سالہا سال سے میں اپنا شمار برطانوی رعایا میں نہیں کرتا۔ مجھے باغی کہلانا منظور ہے مگر رعیّت کہلانا منظور نہیں۔ البتّہ کچھ دن سے میری یہ آرزو ہے کہ مجھے شہری بننا نصیب ہو کسی سلطنت کا نہیں بلکہ دولت عامہ[1] کا اگر ہو سکے تو شرکت[2] اقوام کا۔ یہ شرکت اگر خدا کو منظور ہو تو ہمیشہ کے لئے ہو مگر ایسی نہ ہو کہ ایک قوم کی طرف سے زبردستی دوسری قوم پر عائد کی جائے۔ اسی لئے کانگریس کا مطالبہ ہے کہ فریقین کو یہ حق دیا جائے کہ جب چاہیں تعلق قطع کرسکیں، شرکت منسوخ کرسکیں۔ اس صورت میں ضرور ہے کہ یہ شرکت ایسی ہو جس میں دونوں کا فائدہ ہو۔ اس موقع پر ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں جس کا خواہ زیر بحث مسئلے سے تعلق ہو یا نہ ہو مگر مجھ سے ضرور

Commonwealth. [1]

Partnership. [2]

ہے۔ میں نے پہلے بھی کہیں پر کہا ہے میں ہمدردی کے ساتھ اس بات کی مصلحت کو سمجھتا ہوں کہ آج کل برطانوی مدبر اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں منہمک ہیں اور اپنا لیکھا جوکھا برابر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں ان سے یہی توقع ہونا چاہیئے۔ میں جب جہاز میں لندن آرہا تھا، تبھی سے مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ایسا نہ ہو ہم لوگ جو اس سب کمیٹی کے رکن ہیں، برطانوی وزیروں کے لئے بار خاطر ہوجائیں ہماری وجہ سے ان کے کاموں میں خلل پڑے۔ مگر پھر میں نے اپنے دل میں سوچا، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم لوگ مخل صحبت نہ ثابت ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ خود برطانوی وزراء گول میز کانفرنس کی کارروائی کو خاص اپنے اندرونی معاملات کے لئے نہایت اہم سمجھیں۔ بے شک ہندوستان تلوار کے زور سے قبضہ میں رہ سکتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ برطانیہ کی مرفہ الحالی برطانیہ کی معاشی آزادی میں کون سی چیز مددے گی وہ ہندوستان جو غلام بناکر رکھا جائے اور شورش سے معمور ہو یا وہ ہندوستان جو عزت کے ساتھ برطانیہ کا شریک کار ہو رنج والم میں اس کا ساتھ دے مصیبت میں اس کا ہاتھ بٹائے یہاں تک کہ ضرورت کے وقت اپنی مرضی سے اس کے دوش بدوش لڑے اس غرض سے نہیں کہ کسی جماعت کو یا کسی فرد کو لوٹ کر اپنی مصیبتیں بھری جائیں بلکہ شاید اس لئے کہ ساری دنیا کا بھلا ہو۔

میرا خواب آپ یقین کیجئے کہ جہاں تک میرے بس میں ہے میں اپنے ملک کی آزادی سے یہ کام نہیں لینا چاہتا کہ میری قوم جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے روئے زمین کی کسی دوسری قوم کو یا کسی خدا کے بندے کو

ٹوٹ کر اپنا بھلا کرے۔ اگر میں اپنے ملک کی آزادی چاہوں اور اس کے ساتھ اور سب قوی اور کمزور قوموں کے حق آزادی کا دل و جان سے خواہاں نہ ہوں تو میں ہرگز اس کا مستحق نہیں کہ میرا ملک آزاد ہو۔ اس لئے جب آپ کے خوش نما جزیرے کے قریب آتے آتے میں نے اپنے دل میں کہا ممکن ہے میں برطانیہ کے وزیروں کو قائل کر دوں کہ وہ ہندوستان جو آپ کا قابل قدر شریک ہو جسے آپ تشدد کی زنجیروں کی جگہ محبت کے ریشمی رشتہ سے باندھ کر رکھیں ایسا ہندوستان غالباً آپ کا میزانیہ[1] برابر کرنے میں سچ مچ کی مدد دے سکے گا صرف اسی سال نہیں بلکہ بہت دنوں تک۔ کیا کچھ نہیں کر سکتیں یہ دو قومیں مل کر ایک وہ قوم جس میں مٹھی بھر آدمی ہیں مگر بہادر، وہ قوم جس کی شجاعت کے افسانے اپنی نظیر نہیں رکھتے، وہ قوم جسے "غلامی سے" جنگ کا شرف حاصل ہے اور جس نے بارہا اور کچھ نہیں تو یہ دعوے ضرور کیا ہے کہ ہم کمزوروں کی حمایت کرتے ہیں۔ اور ایک دوسری قدیم قوم، جس کا شمار کروڑوں سے ہوتا ہے، جس کی شان دار تاریخ ہزاروں سال کی ہے، جو آج دنیا کی دو بڑی تہذیبوں، یعنی اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کی نام لیوا ہے، جس کے اندر اگر دیکھئے تو عیسائیوں کا شمار بھی خاصا ہے اور زرتشتی نسل پوری سمائی ہوئی ہے، جس کی تعداد کچھ ایسی کم نہیں اور خدمت خلق اور جرأت عمل کا تو یہ حال ہے کہ اس سے بڑھ کر کیا اس کے برابر بھی شاید ہی کوئی قوم نکلے۔ ہمارے ہندوستان میں یہ سب تہذیبیں جمع ہیں اور اگر خدا ان ہندوؤں اور مسلمانوں کو جن کے نمائندے یہاں جمع ہیں، یہ توفیق دے کہ وہ آپس میں مل کر باعزت مفاہمت کر لیں اور یہ قوم برطانوی قوم کے دوش بدوش کھڑی ہو، اگر ہندوستان آزاد ہو، برطانیہ عظمیٰ کی طرح بالکل

[1] budget

خود مختار ہو، تو میں آپ کے دل سے اور اپنے دل سے یہ پوچھتا ہوں، کہ ان دونوں قوموں میں با عزت شرکت دونوں کے لئے مفید ہوگی یا نہیں خواہ ہم اُن مصلحتوں کو چھوڑ کر محض برطانیہ عظمےٰ کی اندرونی مصلحتوں ہی کے لحاظ سے دیکھیں؟ یہ خواب کی سی امید دل میں لئے ہوئے میں جزائر برطانیہ میں داخل ہوا اور اب بھی یہ خواب مجھے دل سے عزیز ہے۔

مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ یہ ایک خاکہ ہے جس میں رنگ آپ خود بھریں گے اور مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں گے کہ میں تمام تفصیلات کا ذکر کروں اور آپ کو یہ بتاؤں کہ فوج پر، امورِ خارجہ پر، مالیات پر، محاصلی اور معاشی پالیسی پر اختیار ہونے سے میری مُراد کیا ہے اور مالی کارروائیوں کی جانچ میں کس طرح چاہتا ہوں۔ ان کارروائیوں کے متعلق کل ایک دوست کی رائے تھی کہ ان کی حرمت کرنا چاہیئے! انہیں ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ جب ایک شریک جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے اور ان میں حساب فہمی ہوتی ہے تو ان کی مالی کارروائیوں کی جانچ پڑتال بھی کی جاتی ہے اس لئے اگر کانگریس یہ کہے کہ قوم کو سوچ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے کون سی ذمہ داریاں قبول کرنا چاہئیں۔ اور کون سی نہ کرنا چاہئیں تو اس میں کونسی شرم کی بات ہے کونسا گناہ ہے؟ اس جانچ کی، اس تحقیقات کی، خواہش صرف ہندوستان کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ دونوں کے فائدے کے لئے ہے۔ مجھے پوری طرح یقین ہے۔ اہل برطانیہ کو ہرگز یہ منظور نہیں کہ ہندوستان کے سر ایسا بوجھ ڈالیں جو قانون کے مطابق اسے نہ اٹھانا چاہیئے۔ اور میں کانگریس کی طرف سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ کانگریس کبھی کسی مطالبے سے انکار نہیں کریگی جو انصاف کی رو سے اس پر عائد ہوتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم

عزت کی زندگی بسر کرے اور دنیا میں اس کی ساکھ ہو تو ہم اپنے واجبی قرض کا ایک ایک حبہ ادا کرنے کے لئے لہو پانی ایک کر دیں گے۔

میرے نزدیک اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کے سامنے کانگریس کی ہدایت پھر سے دُہراؤں اور ایک ایک فقرے کی تحلیل کر کے یہ بتاؤں کہ کانگریس والے اس کے کیا معنی سمجھتے ہیں۔ اگر خدا کو منظور ہے کہ میں ان مشوروں میں برابر شریک رہوں تو آگے چل کر مجھے ان فقروں کی شرح کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔ اسی طرح تحفظات کے متعلق بھی مجھے جو کچھ کہنا ہے ان مشوروں کے دوران میں کہتا رہوں گا۔

جناب لارڈ چانسلر، میں اپنے خیال میں کافی عرض کر چکا۔ آپ کی رعایت کی بدولت مجھے خاصی طویل تقریر کرنے کا موقع ملا اور حاضرین کا بہت وقت صرف ہوا۔ اصل میں میں اتنی دیر لگانا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں نے ابتدا ہی میں سچے دل سے اپنی قلبی آرزو کا اظہار نہ کر دیا تو میں اس مقصد کا جس کی تشریح کے لئے میں یہاں حاضر ہوا ہوں اس سب کمیٹی کا اور برطانوی قوم کا جس کے ہم ہندوستانی نمائندے مہمان ہیں حق ادا کرنے سے قاصر رہوں گا۔ میری یہی تمنا ہے کہ میں جب انگلستان سے یہ یقین دل میں لیکر جاؤں کہ برطانیہ عظمے اور ہندوستان میں باعزت شرکت قائم ہونے والی ہے۔

میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ جب تک میں یہاں ہوں۔ تہ دل سے اس مقصد کے حاصل ہونے کی دعا کرتا رہوں گا۔ جناب لارڈ چانسلر، میں آپکی اس عنایت کا شکر گذار ہوں کہ میں نے پینتالیس منٹ کے قریب تقریر کی مگر آپنے مجھے نہیں روکا۔ میں اس مراعات کا مستحق نہیں تھا۔ اور ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۲

مجالسِ وضعِ قوانین

ایک شکایت جناب لارڈ چانسلر، میں اس مباحثے میں بہت پس و پیش کے بعد شرکت کر رہا ہوں اور ان مسئلوں کو چھیڑنے سے پہلے جو بحث کے لئے تجویز کئے گئے ہیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اجازت سے میں اس بے چینی کا اظہار کر دوں جو میرے دل پر دوشنبہ کے دن سے چھائی ہوئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے۔ اس کمیٹی میں اب تک جو مباحثے ہوئے انھیں میں بہت توجہ سے سنتا رہا۔ میں نے نمائندوں کی فہرست کو بھی پہلے سے زیادہ غور سے دیکھا۔ پہلی بات جو میرے دل میں کھٹک رہی ہے یہ ہے کہ ہم لوگ جس قوم کی نمائندگی کے لئے آئے ہیں، اس کے چُنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہمیں حکومت نے چُنا ہے۔ جب میں اس فہرست کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس تجربے کی بنا پر جو ہندوستان کے مختلف فرقوں اور جماعتوں سے متعلق ہے، یہ نظر آتا ہے کہ اس میں سے بعض اہم نام جو ہونا چاہیئے تھے غائب ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ قلق ہے کہ یہ کمیٹی نمائندگی کے لحاظ سے اصلیّت سے خالی ہے۔

دوسری بات جس سے میرے دل میں، اصلیّت سے دور ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ کمیٹی کی کارروائی ختم ہوتی نظر نہیں آتی اور نتیجہ سچ پوچھئے تو کچھ بھی نہیں۔ اگر یہی رفتار ہے تو میرے خیال میں ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ اس کمیٹی کے سامنے جو مسائل پیش ہیں انھی میں اُلجھے رہیں۔

اور بیٹھے بال کی کھال نکالا کریں۔

جناب لارڈ چانسلر، مجھے تہ دل سے اعتراف ہے کہ آپ نے ہمارے سابقے میں نہایت صبر سے اور کمال خلق سے کام لیا اور اس کمیٹی کی کارروائی میں آپ جو زحمت برداشت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں مبارکباد کی مستحق ہے۔ مگر خدا کرے جب آپ کا اور ہمارا کام ختم ہو تو میں آپ کو اس بات پر مبارکباد دے سکوں کہ آپ کی مدد سے یا یوں کہی کہ آپ کی زبردستی سے ہم لوگ کسی معقول نتیجے پر پہنچ گئے۔

اجازت ہو تو میں اس موقع پر عاجزی اور نرمی سے ملک معظم کے مشیروں کی کچھ شکایت کروں۔ ان لوگوں نے ہمیں سمندر پار سے بلا یا ہے اور میرے خیال میں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم سب کے سب انھیں کی طرح کام کاجی لوگ ہیں اور اپنا اپنا کارمنصبی چھوڑ کر آئے ہیں۔ تو ہم لوگوں کو جمع کرنے کے بعد کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ہمیں آگے بڑھنے میں مدد دیں؟ کیا میں آپ کے توسط سے ان سے یہ التجا نہیں کر سکتا کہ ہمیں اپنے خیالات سے آگاہ کریں؟ مجھے نہایت خوشی ہوگی اگر وہ کوئی معینہ تجاویز ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری رائے معلوم کریں اور آپ کے سامنے یہ عرض کرنا خلاف ادب نہ ہو تو کہوں کہ میرے نزدیک کارروائی کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی صورت اختیار کی جائے تو یقیناً ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے خواہ وہ اچھا ہو یا برا، قابل اطمینان ہو یا ناقابل اطمینان۔ لیکن اگر ہم نے اس کمیٹی کو دارالمباحثہ بنا دیا جس کا ہر ممبر ہر ایک مسئلے پر دھواں دھار تقریریں کرتا ہے تو میرے خیال میں ہم جس مقصد سے جمع کئے گئے ہیں اسے پورا نہیں کر سکیں گے۔

غالباً یہ صورت مفید ہوگی کہ اگر آپ کو اس کا اختیار ہو تو آپ ایک سب

کمیٹی مقرر کردیں جو زیر بحث امور کی تنقیح کر کے فیصلے کے لئے آپ کے سامنے پیش کر دیا کرے تاکہ ہماری کارروائی ایک مناسب وقت کے اندر ختم ہو جائے۔ میں نے یہ باتیں اشارے کے طور پر محض اس لئے عرض کی ہیں کہ آپ اور کمیٹی کے ارکان ان پر غور کریں امید ہے کہ آپ ملک معظم کے مشیروں کو ان کی طرف توجہ دلا دیں گے۔

میری بہ اصرار گذارش ہے کہ یہ حضرات ہماری رہنمائی کریں اور یہ ظاہر کریں کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم اپنی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں دیدیں تو وہ کیا کریں گے۔ وہ ہم سے رائے اور مشورہ لینے کی ضرورت سمجھیں تو ہم اس کے لئے حاضر ہیں۔ میرے خیال میں یہ صورت کہیں بہتر ہو گی ہماری موجودہ حالت سے جس میں کسی بات کا ٹھور ٹھکانا نہیں اور بے انتہا دیر ہو رہی ہے۔

اس کے بعد میں دفعہ ۲ کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس معاملے میں مجھے بھی وہی دقت پیش آ رہی ہے جو سر تیج بہادر سپرو کو پیش آئی تھی۔ اگر میں ان کا مطلب صحیح سمجھا ہوں تو انھوں نے یہ کہا تھا میں اس الجھن میں ہوں کہ مجھ سے مختلف دفعات پر بحث کرنے کو کہا جاتا ہے اور مجھے ابھی یہی معلوم نہیں کہ حق رائے دہی[1] کی کیا نوعیت ہو گی۔ یہ دقت تو مجھے اور انھیں دونوں کو ہے مگر مجھے ایک اور مشکل کا سامنا ہے۔ میں اس کمیٹی کے سامنے کانگریس کی ہدایت پیش کر چکا ہوں اور مجھے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام دفعات پر بحث کرنا ہے۔ چنانچہ ان میں سے چند دفعات کے متعلق میں اپنی رائے یا اپنی تجویز اس ہدایت کی مناسبت سے پیش کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کمیٹی کو خبر نہ ہو کہ

---

[1] franchise

وہ کس منزل کی طرف بڑھ رہی ہے تو، جو رائے میں دوں گا وہ کمیٹی کے لئے بے کار ہوگی۔ میری رائے کی قدر و قیمت جو کچھ ہے وہ اس صورت میں ہے کہ یہ ہدایت قبول کرلی جائے۔ میرا مطلب اس وقت صاف ہو جائے گا جب میں ان دفعات پر نظر ڈالوں گا۔

ریاستیں اس دفعے کی ضمن ۲۔ کے بارے میں ہمدردی تو مجھے مجموعی حیثیت سے ڈاکٹر امبیڈکر کی رائے سے ہے لیکن میری عقل مسٹر گیون جونس اور سر سلطان احمد کا ساتھ دیتی ہے۔ اگر ہماری سب کمیٹی یک رنگ ہوتی اور اس کے ممبروں کو رائے دینے کا اور فیصلہ کرنے کا حق ہوتا تو میں ڈاکٹر امبیڈکر کا ساتھ بڑی دور تک دیتا لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔ اس کمیٹی میں ہر طرح کے لوگ جمع ہیں، اس کا ہر رُکن آزاد ہے اور یہ حق رکھتا ہے کہ اپنے طور پر رائے دے جب یہ حالت ہے تو میری ناچیز رائے میں ہمیں ریاستوں سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تم یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ ان ریاستوں نے فراخدلی سے خود ہی ہماری مدد کی اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ مل کر وفاقی نظام بنانے پر تیار ہیں۔ حالانکہ شاید انھیں اپنے بعض حقوق سے جو انھیں بلاشرکت غیرے حاصل ہوتے دست بردار ہونا پڑے۔ ایسی صورت میں مجھے چار و ناچار اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے جو سر سلطان احمد نے ظاہر کی ہے اور جس پر غالباً مسٹر گیون جونس نے اور بھی زور دیا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ ریاستوں کو سمجھائیں اور انھیں اپنی مشکلیں بتائیں مگر میرے خیال میں اسی کے ساتھ ہمیں ان کی مخصوص مشکلوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔

اس لئے میں اسی پر اکتفا کروں گا کہ رؤسائے نامدار کے سامنے دو ایک باتیں اشارۃً عرض کردوں کہ وہ ہمدردی کے ساتھ ان پر غور کریں۔ میں جو جمہور کا

آدمی ہوں جمہور میں سے ہوں اور ادنیٰ سے ادنیٰ طبقوں کی نمائندگی کرنا چاہتا ہوں انھیں یہ تاکید یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ وفاقی نظام کی جو تجویز مرتب کر کے اس کمیٹی، کے سامنے پیش کریں اس میں اپنے لئے بھی مناسب جگہ معین کر لیں۔ مجھے یہ احساس ہے اور یہ معلوم ہے کہ انھیں اپنی رعایا کی فلاح کا دل سے خیال ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ انھیں اس کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرنے کا دعویٰ ہے، لیکن اگر اس کانفرنس میں سب امور حسب مراد طے ہو گئے تو ریاستوں کی رعایا کا سابقہ عمومی ہندستے (اگر یہ نام برطانوی ہند کے لئے مناسب) ہو پڑھتا جائے گا اور دونوں باہم اشتراک عمل کرنا چاہیں گے۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کے ان دونوں حصوں میں کوئی حقیقی تفریق نہیں ہے۔ ہندوستان کے دو ٹکڑے کرنا ایسا ہے جیسے کسی جیتے جاگتے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ یہ ملک بہت پرانے زمانہ سے ایک چلا آتا ہے اور کسی مصنوعی سرحد سے اس کی تقسیم کرنا ناممکن ہے۔ والیان ریاست کی اس بات کی تعریف کرنا چاہیئے کہ جب انھوں نے جرائت سے کام لے کر صاف الفاظ میں وفاقی نظام کی تائید کی تو اسی کے ساتھ یہ دعوےٰ بھی کیا کہ ہمارا ان کا خون ایک ہے، ہم اور وہ بھائی بھائی ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ نہ کرتے۔ ہم میں اور ان میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ ہم معمولی آدمی ہیں اور وہ امیر ہیں، رئیس ہیں، انھیں خدا نے امیر اور رئیس بنایا ہے۔ میں ان کا خیر خواہ ہوں، میں ہر طرح سے ان کی فلاح کا طالب ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان کی صلاح اور فلاح میں ان کی پیاری رعایا کا بھی بھلا ہو۔

اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گا اور کہہ بھی نہیں سکتا۔ میں تو بس ان سے

التجا کرسکتا ہوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وفاقی نظام میں داخل ہونا یا نہ ہونا انکے اختیار کی بات ہے۔ ہمارا کام ہے انھیں اس طرح بلانا کہ وہ آسانی سے آسکیں۔ ان کا کام ہے اس طرح آنا کہ ہم بہ آسانی اُن کا خیر مقدم کرسکیں۔

جب تک کہ دونوں طرف سے مراعات کا لحاظ نہ رکھا جائے، میرے نزدیک کوئی باقاعدہ وفاقی نظام قائم نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو آپس میں جھگڑے پڑ جائیں گے اور سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے وفاقی طریق حکومت کو بیدلی سے اختیار کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ اس کی ابتدا ہی نہ کی جائے۔ اگر اسے اختیار کرنا ہے تو پھر پورے انہاک سے کرنا چاہیئے۔

رائے دہی کی شرائط

اب دفعہ ۳ یعنی اس مسئلے کو لیجیئے کہ ممبری کیلئے کوئی قید ہونا چاہیئے یا نہیں۔ گو میرا دعوٰے ہے کہ میں عمومی حکومت کا پکّا حامی ہوں لیکن مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ایسی قیود لگانا جن سے بعض اشخاص ممبر منتخب نہ ہوسکیں یا منتخب ہونے کے بعد ہٹائے جاسکیں، حق رائے دہی کے اصول سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس بحث کو کہ یہ قیود کیا ہونا چاہئیں، میں فی الحال چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس وقت تو میں صرف یہ کہتا ہوں کہ میں قیود لگانے کے اصول کا دل سے مؤید ہوں۔ مجھے "اخلاقی پستی" کی اصطلاح سے وحشت نہیں ہوتی۔ بلکہ میرے خیال میں یہ الفاظ اچھے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم چاہے کوئی الفاظ کتنی ہی غور و فکر کے بعد تجویز کریں ہمیں ان کی وجہ سے مشکلیں ضرور پیش آئیں گی۔ لیکن آخر ہمارے جج ان مشکلوں کو دُور کرنے کے لئے نہیں تو پھر کاہے کے لئے ہیں؟ جب کوئی ایسی مشکل پڑے گی تو جج ہماری مدد کریں گے اور یہ بتا دیں گے کہ "اخلاقی پستی" کا اطلاق فلاں چیز پر ہوتا ہے

اور فلاں پر نہیں ہوتا۔ فرض کیجیئے کہ میرا جیسا شخص جو مقاومت مدنی[^1] پر عامل ہو، "اخلاقی لستی" کا مجرم سمجھا ئے تو میں اس پر صبر کروں گا۔ اگر میں انتخاب سے خارج کر دیا جاؤں تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ ممکن ہے کہ بعض اور لوگوں کو بھی نقصان پہنچے مگر محض اس بات کی بنا پر میں یہ کہنے کہہ دوں کہ مطلق کوئی قید نہیں ہونا چاہیئے۔ اور اگر ہوئی تو یہ رائے دہندوں کے حقوق میں مداخلت ہوگی۔ جب قابلیت کی شرط اور عمر کی قید ہوگی تو سیرت کے متعلق بھی کوئی قید ضروری ہے۔

بالواسطہ انتخاب تیسرا بالواسطہ اور بلا واسطہ انتخاب کا مسئلہ ہے کاش لارڈ پیل یہاں ہوتے اور دیکھتے کہ بالواسطہ انتخاب کے اصول میں نفس امر کے لحاظ سے میں ان سے متفق ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں ان مسائل میں کورا ہوں اور عطائیوں کی طرح گفتگو کر رہا ہوں۔ بہر حال مجھے تو بالواسطہ انتخاب کے نام سے وحشت نہیں ہوتی۔ نہ جانے ان الفاظ کے کوئی اصطلاحی معنی ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو مجھے ان کا علم نہیں ہے۔ میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میری مراد ان سے کیا ہے۔ اگر بالواسطہ انتخاب وہی چیز ہو تو میں یقیناً اسکی حمایت کروں گا اور غالباً رائے عامّہ کے بہت بڑے حصّے کو اس طریق انتخاب کا موید بنا دوں گا۔ میں بالغوں کے حق رائے دہی کا اصول اختیار کر چکا ہوں۔ اب جو کچھ بھی ہو کانگریس والے تو اسی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

یہ اصول کئی وجوہ سے ضروری ہے اور ایک سب سے اہم وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ نام نہاد اچھوتوں کے، اور ہر قسم اور ہر طبقے کے مزدوروں کے جائز مطالبات پورے کئے جا سکتے ہیں۔

[^1]: Civil resistance

میرا دل کسی طرح قبول نہیں کرتا کہ جس شخص کے پاس دولت ہے اُسے تو رائے دینے کا حق ہو اور جس کی سیرت اچھی ہے مگر دولت نہیں رکھتا یا حرف آشنا نہیں اسے یہ حق نہ ہو یا جو شخص ہمیشہ دیانتداری سے محنت اور عرق ریزی کرتا ہے وہ محض غریب ہونے کے جُرم میں اس حق سے محروم رہے۔ یہ ایسی بات ہے جو ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی۔ میں غریب سے غریب دیہاتیوں کے ساتھ رل مل کر رہا ہوں اور مجھے اچھوت کہلانے کا فخر حاصل ہوا ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ نوع انسانی کے بعض نہایت پاکیزہ نمونے انھی غریب آدمیوں میں انھی اچھوتوں میں ملتے ہیں۔ مجھے خود اپنا حق رائے دہی سے محروم کر دیا جانا منظور ہے مگر یہ منظور نہیں کہ میرے اچھوت بھائی کو یہ حق نہ ملے۔

خواندگی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ رائے دہندہ کے لئے خواندہ ہونا یعنی لکھنے پڑھنے اور حساب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ یہ میں بھی چاہتا ہوں کہ میری قوم خواندہ ہو لیکن اگر اسے رائے دہی کا حق ملنے کے لئے اس کا انتظار کرنا پڑے کہ ہر شخص پڑھ لکھ جائے تو گویا قیامت تک انتظار میں بیٹھا رہنا ہے اور اس کے لئے میں تیار نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے، کہ ان لوگوں میں سے لاکھوں کروروں رائے دہی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر انھیں یہ حق دے دیا جائے تو ان سب کی فہرست مرتب کرنا اور ایسے حلقہ ہائے انتخاب بنانا جن کی نگرانی کی جا سکے محال نہیں تو دشوار ہے۔

مجھے بھی لارڈ پیل کی طرح یہ خوف ہے کہ اگر حلقے بہت بڑے ہوئے تو امیدوار کے لئے یہ باتیں ممکن نہ ہوں گی کہ وہ سب لوگوں سے ذاتی سابقہ رکھے یا کبھی کبھی ان سے ملتا رہے اور ان کی رائے معلوم کرتا رہے۔ اگرچہ میں نے کبھی مجلس وضع قوانین

کی ممبری کا حوصلہ نہیں کیا ہے لیکن مجھے انتخابات سے تھوڑا بہت سابقہ پڑا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس موقع پر کیسی کیسی دقتیں پیش آتی ہیں مجھے ان لوگوں کے تجربوں کا بھی علم ہے جو مجالس وضع قوانین کے ممبر رہے ہیں۔

اس لئے ہم کانگریس والوں نے اپنا ایک نظام بنایا ہے۔ موجودہ حکومت ہم پر یہ الزام لگاتی ہے کہ ہم نے دیدہ دلیری سے اس کے مقابلے میں اپنی حکومت قائم کی ہے۔ میں اس الزام کا اعتراف اپنے طرز پر کرتا ہوں۔ ہم نے مقابلے کی حکومت تو نہیں قائم کی البتہ ہمارا یہ حوصلہ ضرور ہے کہ کسی دن اس حکومت کو بے دخل کردیں گے اور رفتہ رفتہ سلسلۂ ارتقا کے مطابق اس کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔

میں گذشتہ چودہ سال سے ہندوستانی قومی جماعت کا مسودہ نویس ہوں اوراس سے پہلے تقریباً بیس سال تک جنوبی افریقہ کی ایک اسی قسم کی جماعت کا مسودہ نویس رہا ہوں۔ اس لئے آپ کی اجازت سے میں اپنے تجربات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ کانگریس کے دستور اساسی کے اندر تقریباً ہر بالغ کو حق رائے دہی حاصل ہے۔ ہم برائے نام فیس چار آنے سال وصول کرتے ہیں اگر یہاں[1] بھی یہ فیس لگادی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ مجھے لارڈ پیل کے اس خیال سے بھی اتفاق ہے کہ یہاں یہ خطرہ درپیش ہے کہ ہمارے غریب ملک کو محض انتخابات کے انتظام میں بہت بڑی رقم خرچ کردینا پڑے گی اس لئے میں یہ فیس وصول کئے جانے کا حامی ہوں۔ البتہ میں اس خیال پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں، کہ چار آنے کی رقم بھی ایک بڑا بوجھ ہے اور اگر مجھے یہ یقین ہو جائے تو میں یہ شرط نکال دوں گا۔ بہرحال کانگریس کے نظام میں یہ فیس رکھی گئی ہے۔

---

[1] یعنی مجالس وضع قوانین کے انتخابات میں رائے دینے والوں کے لئے۔

ہماری ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ جہاں تک مجھے رائے دہی کے مروّجہ طریقوں سے واقفیت ہے رجسٹری کے افسر کو ان سب لوگوں کے نام رائے دہندوں کی فہرست میں لکھنا پڑتے ہیں جو اس کے نزدیک رائے دینے کا حق رکھتے ہیں خواہ کوئی شخص رائے دینا چاہے یا نہ چاہے، اپنا نام فہرست میں لکھوانا چاہے یا نہ چاہے اس کا نام درج ہوجاتا ہے۔ جب میں نٹال کے شہر ڈربن میں تھا تو ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ میرا نام رائے دہندوں کی فہرست میں موجود ہے۔ میرا مطلق ارادہ نہیں تھا کہ وہاں کے وضع قوانین میں دخل درمعقولات دوں۔ اس لئے میں نے اپنا نام رائے دہندوں کی فہرست میں لکھوانے کی زحمت نہیں گوارا کی تھی۔ مگر کسی صاحب نے جو امیدوار تھے اور میری رائے حاصل کرنا چاہتے تھے، مجھے مطلع فرمایا کہ تمہارا نام فہرست میں لکھا ہوا ہے اس وقت سے مجھے معلوم ہوا کہ رائے دہندوں کی فہرستیں اس طرح تیّار ہوتی ہیں۔

ہمارے یہاں رائے دہی کے حق سے فائدہ اٹھانا اختیاری ہے۔ اس لئے جو شخص چاہتا ہے رائے دیتا ہے اور عمر وغیرہ کی قیود کے ماتحت جو سب کے لئے عام ہیں، لاکھوں کروروں اشخاص کو بلا امتیاز جنس یہ حق ہے کہ اپنا نام رائے دہندوں کی فہرست میں لکھوائیں۔ میرے نزدیک اس قسم کے انتظام سے رائے دہندوں کی فہرست ایک معقول حد سے آگے نہیں بڑھنے پائے گی۔

انتخابات کا انتظام مگر اس طرح بھی رائے دہندوں کی تعداد لاکھوں کروروں تک پہنچ جائے گی۔ اور کسی ایسی چیز کی ضرورت ہوگی جو گاؤں کے اور مرکزی مجلس وضع قوانین کے درمیان واسطے کا کام

دے۔ ہندوستانی کانگریس کمیٹی ہمارے یہاں مرکزی کونسل کے مقابلے کی چیز ہے اس کے علاوہ صوبہ وار کمیٹیاں ہیں جو صوبے کی کونسلوں کا جواب ہیں۔ ہمارے یہاں چھوٹے سے پیمانے پر وضع قوانین کا کام بھی ہے اور نظم ونسق کا بھی۔ ہمارا اپنا شعبۂ عاملہ بھی علیحدہ ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اس کی پشتی پر سنگینوں کی قوت نہیں ہے لیکن ہم اپنے فیصلوں کی تائید اور اپنی قوم سے ان کی تعمیل کرانے کے لئے ایک اور قوت رکھتے ہیں جو اس سے کہیں برتر ہے اور ہمیں ابھی تک ایسی کوئی مشکل پیش نہیں آئی جس پر ہم غالب نہ آسکیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہم ہمیشہ اپنے فیصلوں کی پوری پوری تعمیل کرانے میں کامیاب ہوئے مگر بہرحال ہم ۴۷ برس سے کسی نہ کسی طرح اپنا کام چلا رہے ہیں اور کانگریس کی عظمت میں سال بسال اضافہ ہو رہا ہے۔

میں آپ سے یہ عرض کردوں کہ ہماری صوبے کی کونسلوں کو اپنے انتخابات کے انتظام کے لئے ضمنی قواعد بنانے کا پورا اختیار ہے۔ جو اصل اصول ہے یعنی رائے دہی کی شرائط اس میں تو وہ کوئی تغیر نہیں کر سکتے مگر اور باتوں میں انہیں اپنی رائے سے کام لینے کا پورا اختیار ہے۔

میں آپ کے سامنے صرف ایک صوبے کی مثال پیش کرتا ہوں وہاں گاؤں اپنی چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں منتخب کرتے ہیں۔ یہ کمیٹیاں تحصیلوں کی کمیٹیوں کو منتخب کرتی ہیں۔ تحصیلوں کی کمیٹیاں ضلعوں کی کمیٹیوں کو اور پھر وہ صوبے کی کمیٹی کو منتخب کرتی ہیں۔ صوبوں کی کمیٹیاں اپنے اپنے نمائندے مرکزی مجلس وضع قوانین میں بھیجتی ہیں جس سے میری مراد ہندوستانی کانگریس کمیٹی ہے اس طرح ہم نے اپنا نظم قائم کیا ہے۔ اس نظام میں جو اب زیر غور ہے خواہ یہی صورت اختیار کی جائے یا کوئی اور مجھے اس سے بحث نہیں۔ میرے

پیش نظر تو یہ ہے کہ ہندوستان میں سات لاکھ گاؤں ہیں۔ شاید ان میں ریاستوں کے گاؤں بھی شامل ہیں۔ اس صورت میں عمومی ہندوستان میں پانچ لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ گاؤں رہ جاتے ہیں۔ گویا ہمارے یہاں پانچ لاکھ حلقے ہوئے ان میں سے ہر ایک اپنا نمائندہ منتخب کرے اور یہ نمائندے مرکزی یا وفاقی مجلس کے نمائندوں کو منتخب کریں۔ میں نے آپ کے سامنے اس تجویز کا محض خاکہ پیش کیا ہے۔ اگر آپ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں تو یہ مفصّل طور پر مرتّب کر لی جائے۔ اگر کل بالغوں کو حق انتخاب دیا گیا تو جس چیز کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اسی قسم کی کوئی تدبیر اختیار کرنا پڑے گی۔ اگر آپ محض میری شہادت کافی سمجھیں تو عرض کروں کہ اس طریقے سے جہاں کہیں کام لیا گیا کامیابی ہوئی اور ان نمائندوں کے ذریعے سے گاؤں کے معمولی باشندوں سے رابطہ پیدا کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آئی۔ اس نظام کی کل بہت اچھی طرح چل رہی ہے اور جہاں لوگوں نے اسے دیانت داری سے چلایا وہاں اس کی رفتار بھی تیز رہی۔ پھر لطف کہ خرچ محض برائے نام ہے۔ اس طریقے پر عمل ہو تو اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں کہ ایک ایک امیدوار ساٹھ ساٹھ ہزار بلکہ ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کر دے۔

دو ایوانی[1] مجلس وضع قوانین میں اس سلسلے میں ناچیز رائے دو ایوانی مجلس وضع قوانین کے متعلق بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں یہ کہوں کہ میں اس معاملے میں جوشی صاحب کا ساتھی ہوں۔ میں ان لوگوں میں نہیں جو دو ایوانوں کے اصول پر جان دیتے

[1] bi-cameral

ہیں یا اس کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ مجھے اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ عمومی مجلس وضع قوانین
اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے گی اور عجلت میں ایسے قانون پاس کر دے گی جن پر اسے آگے
چل کر پچھتانا پڑے۔ ہمیں کیا حق ہے کہ عمومی مجلس پر ایک فرضی الزام عائد کرکے
اسے سزا دیں۔ میرے خیال میں یہ مجلس اپنا کام خود سنبھال لے گی اور چونکہ ہمارا
سابقہ ایسے ملک سے ہے جو دنیا میں سب سے غریب ہے اس لئے ہمیں جتنے کم اخراجات
برداشت کرنا پڑیں اتنا ہی اچھا ہے۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کی تائید نہیں
کر سکتا کہ جب تک عمومی ایوان کی نگرانی کے لئے ایک ایوان بالا[1] نہ ہو یہ عمومی ایوان
ملک کو تباہ کر دے گا۔ مجھے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں البتہ ایسی صورتیں میرے
پیش نظر ہیں کہ عمومی ایوان اور ایوان بالا میں شدید جنگ ہو جائے۔ بہرحال گو
میں اس معاملے میں کوئی فیصلہ کن رویہ نہیں اختیار کرنا چاہتا مگر میری ذاتی رائے
وثوق کے ساتھ یہی ہے کہ ہمارے لئے ایک ہی ایوان کافی ہے بلکہ یہ ہمارے لئے
زیادہ مفید ہے۔ اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اگر ہم اپنے دل کو یہ سمجھا لیں کہ
ایک ایوان کافی ہے تو مصارف میں بہت کفایت ہو جائے گی۔ لارڈ پیل کے اس
خیال کا میں دل سے موید ہوں کہ ہمیں نظیر کی تلاش میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔
ہم خود ایک نئی نظیر قائم کر دیں گے۔ آخر ہندوستان ایک براعظم ہے یا نہیں۔
کوئی دو زندہ ادارے جو انسانوں کے قائم کئے ہوئے ہوں بالکل ایک سے نہیں
ہوتے۔ ہمارے مخصوص حالات ہیں، مخصوص خیالات ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ
ہمیں بہت سی صورتوں میں اپنے لئے نئی راہ نکالنا پڑے گی چاہے اس کی
کوئی نظیر ہو یا نہ ہو۔ اس لئے میرے خیال میں اگر ہم ایک ایوان کے طریقے کا
تجربہ کریں تو کوئی بری بات نہیں۔ آپ شوق سے اس ایوان کو ہر طرح سے

۱۔ Upper Chamber

جہاں تک انسان کا ذہن کام دے سکے، مکمل بنا یئے۔ مگر رکھئے ایک ہی ایوان۔
جب میری یہ رائے ہے تو مجھے ضمن ۳۔ اور ضمن ۴۔ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

خصوصی اغراض کی حفاظت اب ضمن ۵ کو یعنی خصوصی اغراض رکھنے والے طبقوں یا جماعتوں کے مسئلے کو لیجئے۔ کانگریس نے اس بات کو گوارا کر لیا ہے کہ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے تناسب کے مسئلے میں خاص مراعات کے اصول سے کام لیا جائے۔ اس کے بعض تاریخی اسباب ہیں لیکن اس اصول کی توسیع کانگریس کسی صورت میں کرنے کو تیار نہیں۔
اب رہا اچھوتوں کا معاملہ اس کے متعلق جو کچھ ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں وہ اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ظاہر ہے کہ اچھوتوں کی اغراض کی نمائندگی کا بوجھ بٹانے کے لئے کانگریس ان کے ساتھ شریک ہے۔ اچھوتوں کا مفاد کانگریس کو اسی قدر عزیز ہے جتنا ہندوستان کے کسی اور فرد یا جماعت کا مفاد۔ اس لئے ہم مزید خصوصی نمائندگی کا مخالف ہوں۔ اگر کل بالغوں کو حق رائے دہی حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ مزدوروں کو خصوصی نمائندگی کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ خواہش نہ تو کانگریس کی ہے اور نہ ہمارے بے زبان غریبوں کی کہ زمینداروں سے ان کی املاک چھین لی جائے، مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ زمیندار اپنے اسامیوں کے امین ہوں۔ میرے خیال میں یہ زمینداروں کے لئے باعث فخر ہونا چاہیئے کہ ان کی رعایا یعنی وہ کروڑوں کاشت کار جو گاؤں میں رہتے ہیں ان کو اپنی طرف سے امیدوار بنانا اور اپنا نمائندہ منتخب کرنا زیادہ پسند کریں بہ نسبت اس کے کہ دوسرے لوگ یا خود انھی میں سے کوئی ان کا نمائندہ ہو۔
نتیجہ یہ ہوگا کہ زمینداروں کو کاشت کاروں کے ساتھ یکجہتی کرنا پڑے گی،

اور ظاہر ہے کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر زمیندار اس پر مُصر ہوں، کہ ان کے ساتھ خاص مراعات کی جائیں اور دو ایوان ہوں تو دونوں میں، یا ایک ہو تو اسی میں ان کی خصوصی نمائندگی ہو تو میرے نزدیک ہمارے آپس میں پھوٹ کی بنا قائم ہو جائے گی اور میں سمجھتا ہوں کہ زمینداروں یا اس قسم کی کسی اور بہم غرض جماعت کی طرف سے ایسا مطالبہ ہرگز نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد یا دش بخیر یورپی طبقے کی باری آتی ہے جس کی نمائندگی کا دعوےٰ ظاہر ہے کہ گیون جونس صاحب کو ہے۔ مجھے ان کی خدمت میں ادب کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ اب تک آپ کے طبقے کے ساتھ خاص مراعات ہوتی رہی ہیں اس کی حمایت غیر ملکی حکومت حتی الامکان دل کھول کر کرتی رہی ہے۔ اب اگر وہ ہندوستان کے عمومی طبقے کے ساتھ یکجہتی پیدا کرلے تو اسے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ انھوں نے اپنے خوف کا اظہار کیا تھا اور کسی کاغذ میں سے کچھ پڑھ کر سنایا بھی تھا۔ میری نظر سے وہ کاغذ نہیں گذرا ممکن ہے بعض ہندوستانی یہ بھی کہیں کہ اگر کوئی یورپی یا انگریز ہماری طرف سے منتخب ہونا چاہے تو ہم ہرگز نہیں کریں گے۔ مگر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر ہماری ان کی یکجہتی ہو جائے تو میں گیون جونس صاحب کو اپنے ساتھ سارے ہندوستان میں پھراؤں گا اور انھیں دکھاؤں گا کہ لوگ انھیں ایک ہندوستانی پر ترجیح دینگے۔ مثال کے طور پر چارلی اینڈریوز کو لے لیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ بغیر کسی دقت کے ہندوستان کے ہر حلقۂ انتخاب سے نمائندے منتخب ہو سکتے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ ہندوستان میں اِس سرے سے اُس سرے تک ہر جگہ انھیں لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں یا نہیں۔ اس طرح کی میں اور بھی بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں۔ میری درخواست یورپی طبقے سے یہ ہے کہ آپ ایک بار

ہندوستانیوں کے حسن سلوک پر بھروسا کرکے دیکھئے اور اپنے حقوق کی خاص حمایت یا حفاظت کا مطالبہ نہ کیجئے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ کو ہندوستان میں رہنا ہے تو میری التجا ہے کہ ہم میں مل جل کر رہیئے۔ بہرصورت یہ میری قطعی رائے ہے کہ کسی ایسے نظام میں جس میں کانگریس بھی شریک ہو خاص اغراض رکھنے والی جماعتوں کے لئے تحفظات کی گنجائش نہیں ہے۔ بالغوں کو حق رائے دہی حاصل ہونے سے ان کا تحفظ خود بخود ہو جائے گا۔

اب رہے عیسائی۔ ان کے متعلق میں آپ کی اجازت سے ایسے شخص کی شہادت پیش کروں گا جو آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ اس کا قول تھا کہ ہمیں کسی خاص تحفظ کی ضرورت نہیں ہے اور میرے پاس عیسائی انجمنوں کے اس مضمون کے خطوط موجود ہیں کہ ہم خاص تحفظ نہیں چاہتے ہمیں جو کچھ خاص تحفظ حاصل ہو سکتا ہے وہ محض اس حق کی بنا پر جو ہمیں اپنی حقیر خدمات کی بدولت حاصل ہو۔

اطاعت کا حلف

اب میں ایک بہت نازک مسئلہ یعنی اطاعت کے حلف کا مسئلہ چھیڑنا چاہتا ہوں اس کے متعلق میں فی الحال کوئی رائے نہیں دے سکتا اس لئے کہ میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہونا کیا ہے۔ اگر ہندوستان کو کامل آزادی ملنے والی ہے تو ظاہر ہے کہ اطاعت کے حلف کی کچھ اور صورت ہو گی۔ اگر یہ نہیں ہو گا بلکہ ہندوستان بدستور مطیع رہے گا تو پھر میرا وہاں گذر ہی نہیں۔ غرض میرے لئے اس وقت یہ ناممکن ہے کہ اطاعت کے حلف کے مسئلے پر کوئی رائے دوں۔

نامزدگی اب صرف آخری سوال باقی رہ گیا ہے کہ دونوں ایوانوں میں نامزد ممبر ہوں یا نہ ہوں اور اگر ہوں تو ان کی نامزدگی کس اصول پر ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کانگریس کے بنائے ہوئے خاکے میں تو نامزدگی کی کہیں گنجائش نہیں۔ یہاں تک تو میں مان لوں گا کہ ضرورت کے وقت ماہرین فن یا وہ لوگ جن سے مشورہ لینا ہو بلا لئے جائیں۔ یہ لوگ مشورہ دیں گے اور رخصت ہوجائیں گے۔ اس کی کون سی ضرورت ہے کہ انھیں رائے کا حق بھی دیا جائے؟۔ اگر کونسل کو خالص عمومی ادارہ بنانا ہو تو رائے صرف جمہور کے نمائندوں سے لی جاتی ہے۔ اس لئے میں ہرگز کسی ایسے نظام کی تائید نہیں کرسکتا جس میں ممبروں کی نامزدگی کا اصول بھی رکھا جائے۔ یہاں اس بحث کا سلسلہ اس دفعہ کی ضمن ۵۔ سے مل جاتا ہے۔ فرض کیجئے میرے ذہن میں وہ اصول ہے جو کانگریس میں پہلے سے موجود ہے یعنی ہم چاہتے ہیں کہ عورتوں، یوریپیوں، اچھوتوں اور عیسائیوں میں سے بھی ممبر ہوں اور یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بڑی اقلیتیں سہی پھر بھی اقلیتیں ہیں، ممکن ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب بغیر کسی معقول وجہ کے محض شرارت سے عورتوں یا یوریپیوں یا اچھوتوں یا فرض کیجئے کہ زمینداروں کو منتخب نہ ہونے دیں۔ اس صورت کو پیش نظر رکھ کر میں چاہتا ہوں کہ دستور میں ایک دفعہ ایسی ہو جس کی رو سے منتخب شدہ کونسل کو ان لوگوں کے انتخاب یا نامزدگی کا حق حاصل ہو۔ مگر ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ انتخاب انھیں لوگوں کا ہو جنھیں منتخب ہونا چاہیئے تھا مگر نہیں ہوسکے۔ شاید میں اپنے مطلب کو اچھی طرح صاف نہیں کر پایا، اس لئے میں آپ کی خدمت میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ہماری کانگریس کی صوبہ وار کونسلوں میں ایک قاعدہ بالکل اسی قسم کا ہے۔ ہم نے حلقہ ہائے انتخاب

کہہ دیا ہے کہ اتنی عورتیں، اتنے مسلمان اور اتنے اچھوت منتخب کیا کرو۔ اب اگر وہ اس میں قاصر رہیں تو ان ممبروں کا انتخاب منتخب شدہ جماعت کرتی ہے مگر اپنے ممبروں میں سے نہیں بلکہ ان عورتوں، اچھوتوں اور مسلمانوں میں سے جن کے متعلق یہ خیال ہو کہ شاید یہ امیدوار ہوتے اور اس طرح مقرّرہ تعداد پوری کر لی جاتی ہے۔ یہ صورت ہے جو ہم اختیار کرتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ اور خوشی ہوگی اگر اس قسم کی کوئی دفعہ رکھ دی جائے تاکہ حلقہ ہائے انتخاب زیادتی نہ کریں لیکن پہلی بار تو ان پر بھروسا کرنا چاہیئے کہ ہر قسم کے لوگوں کو منتخب کریں گے اور نسل یا ذات کے بندے بن کر نہیں رہ جائیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کانگریس کے خیالات ذات پات اور اونچ نیچ کے فرق کے قطعاً مخالف ہیں۔ وہ مکمل مساوات کی روح پھونکنا چاہتی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا اتنا وقت صرف کیا اور میں جناب صدر کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے ساتھ یہ رعایت کی۔

اس تقریر کے بعد حسب ذیل مباحثہ ہوا

سر اکبر حیدری۔ اگر اجازت ہو تو میں ایک سوال کروں۔ کیا یہ پانچ لاکھ گاؤں یا حلقہ ہائے انتخاب صوبے کی کونسل کا انتخاب کریں گے اور پھر یہ کونسل مجلس وفاقی کے ممبروں کو منتخب کرے گی یا آپ صوبے کی کونسلوں کے لئے الگ الگ حلقہ ہائے انتخاب چاہتے ہیں۔

گاندھی جی۔ جناب صدر۔ مجھے سر اکبر حیدری کے سوال کے جواب میں پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ اگر ہم اس نظام کے عام اصولوں کو اختیار کر لیں جس کا خاکہ میں نے پیش کیا تو پھر جزدی باتوں کے طے کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اب رہا وہ خاص سوال

جو سر اکبر حیدری نے کہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گاؤں کے حلقے رائے دہندوں کا انتخاب کریں گے یعنی ہر گاؤں ایک شخص کو منتخب کرکے کہے گا کہ تم ہماری طرف سے رائے دو۔ اب اس شخص سے چاہے صوبے کی کونسل کے لئے رائے لی جائے یا مرکزی مجلس کے لئے۔

سر اکبر حیدری۔ تو اس شخص کی دو حیثیتیں ہوں گی ایک تو وہ صوبے کی کونسلوں کے انتخابات میں رائے دے گا دوسرے مرکزی مجلس کے انتخابات میں۔

گاندھی جی۔ ہاں اس میں کوئی ہرج نہیں مگر اس وقت تو میں محض مرکزی مجلس کے انتخابات کا ذکر کر رہا تھا۔

سر اکبر حیدری۔ کیا آپ اس کے قطعاً مخالف ہیں کہ صوبے کی کونسلیں جو اس طریقے سے منتخب ہوئی ہوں مرکزی مجلس کا انتخاب کریں۔

گاندھی جی۔ میں قطعاً مخالف تو نہیں ہوں مگر مجھے یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اگر بالواسطہ انتخاب کے مخصوص معنی یہی ہیں تو میں اس سے باز آیا۔ میں بالواسطہ انتخاب کے الفاظ عام معنی میں استعمال کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اس کے کوئی خاص اصطلاحی معنی نہیں ہیں۔

---

(۳)

دو معیار

میں جب سے لندن آیا ہوں میرے ساتھ سراسر لطف وعنایت اور مہرو محبت کا سلوک ہو رہا ہے۔ روز بروز میرے دوستوں کا حلقہ بڑھتا جاتا ہے مگر آپ نے جناب صدر[1] مجھ کو یہ جتا دیا ہے کہ آپ کی جماعت نے آڑے وقت میں ہم سے دوستی نباہی تھی اور سچے دوست وہی ہوتے ہیں جو آڑے وقت کام آئیں۔ اس وقت جب یہ نظر آرہا تھا کہ ہندوستان کا یا یوں کہیے کہ کانگریس والوں کا ساتھ دینے والا روئے زمین پر کوئی نہیں تھا آپ کانگریس کی حمایت میں ثابت قدم رہے اور آپ نے کانگریس کی بات کو اپنی بات سمجھا۔ آج آپ نے پھر نئے سرے سے کانگریس کے پروگرام کی تائید کی ہے اور اس طرح میری محنت کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔

آپ حضرات کی خدمت میں وہ پیام پہونچانا جس کے لئے مجھے کانگریس نے نمائندہ بنا کر بھیجا ہے پڑھے کو پڑھانا اور سیکھے کو سکھانا ہے۔ آپ کانگریس کے معاملے کا کھوٹا کھرا خوب سمجھتے ہیں اور مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کانگریس کو اپنا کام آپ کے ہاتھ میں چھوڑ کر پچھتانا نہیں پڑے گا۔ آج آپ نے جو کچھ کیا ہے اس سے آپ میں اور ہندوستان کے کروڑوں نیم، فاقہ کش، بے زبان دیہاتیوں میں، کانگریس کے توسط سے دوستی کا پیمان استوار ہو جائے گا۔

آپ حضرات نے دوپہر کا کھانا محض برائے نام کھایا ہے مجھے آپ سے

---

[1] مسٹر فینر براکوے۔

پوری پوری ہمدردی ہے۔ میری زبان تو نہیں البتہ میری نظر انگلستان کے دوپہر کے کھانے سے بخوبی آشنا ہے اور جب میں نے یہ میز دیکھی تو مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس برائے نام کھانے پر قناعت کر کے آپ نے کتنے ایثار سے کام لیا ہے۔ خدا کرے یہ جوش ایثار اتنی دیر باقی رہے کہ چائے کا وقت آجائے اور آپ کو کچھ نقل جو انگلستان کے ہوٹلوں اور طعام خانوں میں بسر آتا ہے، مل سکے۔ خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی مگر اس میں ایک سنجیدگی کا پہلو بھی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے سچ مچ ایثار کیا ہے۔ آپ میں سے بعض نے تو ہندوستان کی آزادی کی حمایت میں (یہاں میں آزادی کے لفظ سے وہ مکمل مفہوم مراد لیتا ہوں جو انگریزی زبان میں سمجھا جاتا ہے) بہت کچھ ایثار کیا ہے۔ لیکن اگر آپ نے ہندوستان کے مقصد کی حمایت جاری رکھی تو ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ایثار کرنے کی ضرورت پڑے۔ جب میں نے یہاں آنے کی حامی بھری تو یہ نہیں تھا کہ میں خیالی امیدوں سے دھوکا کھا گیا۔ آپ نے یہاں پہنچنے کے پہلے ہی دن مجھے کہتے سنا ہوگا کہ میرے لندن آنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ میں نے ایک شریف انگریز کو جو قول دیا تھا اُسے نباہوں۔ اس قول کو پورا کرنے کے لئے بغیر یہ سوچے سمجھے کہ نتیجہ کیا ہوگا، میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں کہ انگلستان کے ہر زن و مرد کو جن سے میری ملاقات ہو یہ معلوم ہو جائے کہ جو کانگریس چاہتی ہے اس کا ہندوستان واقعی مستحق ہے۔ اس کے علاوہ میں ان پر یہ بھی روشن کر دینا چاہتا ہوں کہ کانگریس اپنے ارادے میں پکی ہے اور میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ کانگریس کی اور ہندوستان کی لاج رکھنے کے لئے ان سب چیزوں کا مطالبہ کروں جو کانگریس کی ہدایت میں شامل ہیں۔ مجھے کانگریس کے مطالبات میں کمی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ بجز ان باتوں کے

جن کی مجھے اس ہدایت کی رو سے اجازت حاصل ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام بہت ہی مشکل ہے بلکہ تقریباً انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ یہاں لوگوں کو ہندوستان کے موجودہ حالات اور اس کی سچی تاریخ سے اس درجہ ناواقفیت ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

میں انگلستان آ رہا تھا تو ایک کوئیکر[1] دوست نے مجھ سے کہا کہ جب وہاں بچپن سے لوگوں کو سچی تاریخ کے بجائے جھوٹی تاریخ سکھائی گئی ہے تو آپ کے جانے سے کیا فائدہ؟ جوں جوں مجھے انگلستان کے مردوں اور عورتوں سے سابقہ پڑ رہا ہے ان کے اس قول کی بہت سی مثالیں نظر آ رہی ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آنا مشکل کیا محال معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جدوجہد کا مجموعی نتیجہ قوم کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ثابت ہوا ہے۔

میں اس کے پرکھنے کے دو معیار بتاتا ہوں جن میں غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ امر واقعہ ہے یا نہیں کہ آج ہندوستان دنیا کا سب سے غریب ملک ہے جس کے کروروں باشندے چھ مہینے تک بیکار رہتے ہیں؟

یہ امر واقعہ ہے یا نہیں کہ ہندوستان والے جبراً اسلحہ سے محروم کر دئے جانے اور بہت سے ایسے موقع حاصل نہ ہونے سے جو آزاد قوم کے لوگوں کو ہمیشہ میسر آتے ہیں کمزور ہو کر رہ گئے ہیں؟

اگر آپ تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچیں، کہ ان دونوں صورتوں میں انگلستان اپنے فرائض کے ادا کرنے سے سراسر نہیں تو بڑی حد تک قاصر رہا ہے تو کیا آپ کے خیال میں ابھی وہ وقت نہیں آ گیا ہے کہ انگلستان

---

[1]

اپنی پالیسی بدلے؟

بہ قول ایک دوست کے لوکمانیہ تلک نے ہزاروں تقریروں میں کہا ہے "آزادی ہندوستان کا پیدائشی حق ہے" مجھے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ برطانیہ کی حکومت مجموعی طور پر بُری رہی۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ چاہے یہ حکومت اچھی ہو یا بُری، اِدھر ہندوستان کے کروروں بے زبانوں نے آزادی کا مطالبہ کیا اور اُدھر ملک کو آزادی کا استحقاق حاصل ہو گیا۔

یہ کہہ دینا کہ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آزادی کے نام سے ڈرتے ہیں کوئی جواب نہیں ہوا۔ میں نے مانا کہ ہم میں سے بعض کو ایسی آزادی کے ذکر سے لرزہ آتا ہے جس میں برطانیہ کی نام نہاد حمایت کا سایہ ہندوستان کے سر سے اُٹھ جائے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کروروں فاقہ کش غریب اور وہ لوگ جو سیاسی احساس رکھتے ہیں ان خطروں کو دھیان میں نہیں لاتے اور آزادی کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک کانگریس میں موجودہ کارکن ہیں اور اسے اپنی موجودہ پالیسی پر عقیدہ ہے وہ معینہ حدود کے اندر رہنے پر مجبور ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان کی آزادی دوسروں کی جانوں کے مول خریدیں، اپنے حکمرانوں کا خون بہا کر حاصل کریں۔ لیکن اگر ہماری قوم کو اس آزادی کے لئے قربانی کرنا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ہم ہندوستان میں خون کی گنگا بہا دیں گے جیسا کہ آپ لوگوں نے کیا ہے۔ میں آپ کے درمیان اجنبی نہیں بلکہ آپ کا رفیق ہوں۔ آپ کی طرف سے اور ان لوگوں کی طرف سے جن کے آپ نمائندے ہیں مجھے دل سے یقین ہے کہ آپ ہمیشہ ہمارا ساتھ دیں گے اور ہندوستان پر ایک بار پھر یہ روشن کر دیں گے کہ آپ ہمارے آڑے وقت کے دوست ہیں اور اس

لئے سچے دوست ہیں۔

میں پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرا استقبال اس اہتمام سے کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ میری ذات کی خاطر نہیں بلکہ ان اصولوں، کی خاطر کیا گیا ہے جو مجھے بھی آپ کی طرح بلکہ شاید آپ سے زیادہ عزیز ہیں۔ امید ہے آپ کی دُعا سے اور آپ کی مدد سے میں ان اصولوں سے جن کا میں آج علم بردار ہوں، کبھی مُنہ نہیں موڑوں گا۔

---

(۴)
کانگریس اور اقلیتیں

جناب وزیر اعظم اور دوستو سخت افسوس اور اس سے بھی زیادہ شرم کے ساتھ میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو مختلف جماعتوں کی آپس کی غیر رسمی گفتگو کے ذریعے طے کرنے میں مجھے سراسر ناکامی ہوئی۔ جناب وزیر اعظم میں آپ سے اور دوسرے رفقائے کار سے معافی کا طالب ہوں کہ میں نے آپ کے قیمتی وقت میں سے ایک ہفتہ ضائع کر دیا۔ میری تھوڑی بہت اشک شوئی ہوتی ہے تو اس بات سے کہ جب میں نے اس گفت و شنید کی ذمہ داری قبول کی اسی وقت معلوم تھا کہ کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ اس بات سے کہ میں نے اپنی دانست میں اس مسئلے کو حل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

لیکن محض یہ کہہ دینے سے کہ ہماری نا اتفاقی کی بدولت گفت و شنید ناکام رہی پوری حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔ ناکامی کے اسباب تو ہندوستانی وفد کی ترتیب ہی میں مضمر تھے۔ ہم میں سے قریب قریب سب لوگ ان جماعتوں کے منتخب کئے ہوئے نہیں ہیں جن کے ہم نمائندے سمجھے جاتے ہیں بلکہ حکومت کے نامزد کئے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جن کا ہونا متفقہ فیصلے کے لئے ضروری تھا یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اجازت ہو تو عرض کروں کہ اقلیتوں کی کمیٹی کو منعقد کرنے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ یہ کمیٹی اصلیت سے خالی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمیں ابھی یہ معلوم نہیں کہ

ملنے والا کیا ہے۔ اگر صاف طور پر یہ معلوم ہوتا کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہل جائے گا تو ہم آپس کے جھگڑے میں یہ موقع اتنی آسانی سے نہ کھو دیتے۔ مگر جب ملنا ملانا اس پر موقوف رہا کہ پہلے موجودہ وفد فرقہ وارانہ مشکلات کا متفقہ حل تلاش کرے تو پھر جھگڑا آپ ہی ہو گا۔ اس مسئلے کا حل سوراج کے دستور کی جڑ نہیں بلکہ اس کی چوٹی ہو گی اس کا ایک سبب قطع نظر اور اسباب کے یہ بھی ہے کہ ہمارے باہمی اختلافات کو بیرونی حکومت پیدا نہیں کرتی تو بڑھاتی ضرور ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات کا برفانی پہاڑ آزادی کے سورج کی گرمی سے پگھل کر غائب ہو جائے گا۔

اس لئے میری با ادب یہ تجویز ہے کہ اقلیتوں کی کمیٹی غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دی جائے اور دستور اساسی کے بنیادی مسائل جلد سے جلد طے کر لئے جائیں۔ اس اثنا میں فرقہ وارانہ مسئلے کا سچا حل دریافت کرنے کی کوشش بے ضابطہ طور پر جاری رہے مگر یہ نہ ہو کہ اس کی وجہ سے دستور اساسی کی تعمیر میں خلل پڑے۔ توجہ کا مرکز اس چیز سے ہٹ کر اصل مسئلے کی طرف منتقل ہو جانا چاہیئے۔

مجھے کمیٹی کے سامنے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میری ناکامی کے معنی یہ نہ لئے جائیں کہ اب متفقہ حل تلاش کرنے کی امید سراسر منقطع ہو گئی۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ مجھے بالکل شکست ہو گئی۔ میرے اعتراف کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ خاص کوشش جس کے لئے میں نے آپ سے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی تھی اور آپ نے فراخدلی سے عطا کی تھی، ناکام رہی۔

میں چاہتا ہوں کہ اس ناکامی کو کامیابی کا زینہ بناؤں اور میں آپ سب کو بھی اس کی دعوت دیتا ہوں۔ لیکن اگر گول میز کانفرنس کا کام ختم ہونے کے

بعد بھی مفاہمت کی ساری کوششیں اکارت جائیں تو میری تجویز یہ ہے کہ دستور میں ایک دفعہ بڑھا دی جائے جس کی رو سے ایک خاص عدالت مقرر ہو جو تمام مطالبات کے جانچ اور تصفیہ طلب امور کا قطعی فیصلہ کر دے۔

آپ حضرات یہ سمجھ لیں کہ بے ضابطہ گفتگو کے لئے جو وقت دیا گیا تھا وہ سراسر ضائع ہوا۔ آپ کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ ہمارے بہت سے دوست جو وفد کے ارکان نہیں ہیں اس مسئلے پر توجہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے میں سر جیافرے کاربٹ کا ذکر کروں گا۔ موصوف نے پنجاب کی از سر نو تقسیم کے متعلق ایک تجویز پیش کی ہے اور اگرچہ اس وقت اسے لوگوں نے قبول نہیں کیا لیکن میرے خیال میں یہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ میں نے سر جیافرے سے درخواست کی ہے کہ از راہ عنایت اس کو شرح و بسط کے ساتھ مرتب کریں اور کمیٹی کے ارکان میں تقسیم کر دیں۔ ایک تجویز ہمارے سکھ رفیقوں کی بھی ہے جس کا کم سے کم مطالعہ تو کرنا ہی چاہیئے۔ سر ہیوبرٹ کار نے کل رات ایک بڑی اچھی اور بالکل نئی تحریک پیش کی کہ پنجاب میں دو مجلسیں قائم کی جائیں۔ مجلس ماتحت مسلمانوں کے مطالبات کو مد نظر رکھ کر اور مجلس بالا سکھوں کے مطالبات کے لحاظ سے۔ گو میں دو ایوانی مجلس وضع قوانین کا قائل نہیں ہوں لیکن مجھے سر ہیوبرٹ کی تحریک پسند آئی اور میں جانتا ہوں وہ اسی جوش اور خلوص کے ساتھ اس خیال کی پیروی کرتے رہیں گے جو انھوں نے بے ضابطہ گفتگو میں ظاہر کیا تھا اور جس کا مجھے تہ دل سے اعتراف ہے۔

ان سب کے بعد مجھے وضاحت کے ساتھ کانگریس کا نقطۂ نظر پیش کرنا ہے کیونکہ ان مشوروں میں میری شرکت کا سبب ہی یہ ہے کہ میں کانگریس کا نمائندہ ہوں۔ آپ کو بظاہر جو کچھ نظر آتا ہو مگر کانگریس کا تو یہی دعویٰ ہے

کہ وہ ساری قوم کی وکیل ہے خصوصاً کروروں بے زبانوں کی جن میں اچھوت بھی شامل ہیں اور پس ماندہ طبقے بھی جو ایک لحاظ سے اچھوتوں سے بھی بڑھ کر بدنصیبی اور کس مپرسی میں گرفتار ہیں۔

کانگریس کے خیالات کا نچوڑ اس کی مجلس عاملہ اور اجلاس عام کی یہ تجویز ہے جو میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں:

"کانگریس نے ابتدا سے اپنا نصب العین خالص قومیت کو بنایا ہے۔ اس نے ہمیشہ فرقہ وارانہ اختلافات کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ ذیل کی تحریک کو جو لاہور میں منظور ہوئی کانگریس کی ارتقائے قومیت[1] کا اوج کمال سمجھنا چاہیئے۔"

"نہرو رپورٹ کے ساقط ہو جانے کے بعد اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کانگریس کی فرقہ وارانہ مسائل کے بارے میں کیا پالیسی ہے کیونکہ کانگریس کا تو عقیدہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں ان مسائل کا تصفیہ خالص قومی اصول ہی کے مطابق ہو سکتا ہے مگر چونکہ خاص طور پر سکھوں نے اور عام طور پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے فرقہ وارانہ مسائل کے اس حل سے جو نہرو رپورٹ میں تجویز کیا گیا تھا، بے اطمینانی ظاہر کی تھی اس لئے کانگریس سکھوں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو اطمینان دلاتی ہے کہ کسی آئندہ دستور اساسی میں اس مسئلے کا کوئی حل جس سے ان فرقوں کی پوری تشفی نہ ہوتی ہو، کانگریس کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا۔"

"ایسی صورت میں کانگریس فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل فرقہ وارانہ طور پر پیش کرنے سے معذور ہے لیکن قومی تاریخ کے اس نازک موقع پر یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مجلس عاملہ ملک کے سامنے کوئی ایسا حل پیش کرے جس میں چاہیے

---

[1] advance towards nationalism

بظاہر فرقہ وارانہ خیالات کی جھلک نظر آتی ہو لیکن اصل میں جہاں تک ہو سکے قومیت کا رنگ رچا ہوا ہو اور جو سب فرقوں کے نزدیک قابل قبول بھی ہو۔ چنانچہ مجلس عاملہ نے بہت کچھ بحث مباحثے کے بعد بہ اتفاق رائے یہ تجویز منظور کی:۔

"(۱) ا ۔ دستور اساسی میں جو دفعہ بنیادی حقوق کے متعلق ہوگی اس کے اندر فرقہ ہائے متعلقہ میں سے ہر ایک کی تہذیب، زبان، رسم الخط، تعلیم، مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی اوقاف کی حفاظت کی ضمانت کی جائے گی۔

" ب ۔ قانون متعلق ذات[1] کی حفاظت کے لئے دستور اساسی میں خاص دفعات رکھی جائیں گی۔

" ج ۔ اقلیتوں کے سیاسی حقوق اور دوسرے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار اور مجاز وفاقی حکومت ہوگی۔

" (۲) حق رائے دہی تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو دیا جائے گا۔

(نوٹ ۔ مجلس عاملہ کراچی کانگریس کی تجویز کی رو سے کل بالغوں کے حق رائے دہی کی حمایت کی پابند ہے اور رائے دہی کے کسی اور طریقے کو قبول نہیں کر سکتی لیکن ان شبہات کو دور کرنے کے لئے جو بعض لوگوں نے ظاہر کئے ہیں یہ صراحت کر دینا چاہتی ہے کہ ہر صورت میں حق رائے دہی یکساں ہوگا اور اسے اتنی وسعت دی جائے گی کہ مختلف فرقوں کے رائے دہندوں کی تعداد ان کی آبادی کی مناسبت سے ہو)

"(۳) ا ۔ ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں نمائندگی مخلوط انتخاب کی بنا پر ہوگی۔

"ب ۔ ہندوؤں کے لئے سندھ میں، مسلمانوں کے لئے آسام میں، سکھوں کیلئے پنجاب اور صوبہ سرحد میں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ہر اس صوبے میں جہاں

---

[1] Personal law

ان کی تعداد آبادی کے پچیس فی صدی سے کم ہو صوبے کی مجلس اور وفاقی مجلس میں آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کردی جائیں گی۔ اور اس کے علاوہ انھیں یہ حق بھی ہوگا کہ دوسرے امیدواروں کا مقابلہ کرکے مزید نشستیں حاصل کریں۔

"(۴) کل عہدوں کا انتظام ایک کمیشن برائے خدمات سرکاری کے ذریعے ہوگا جو سیاسی پارٹیوں کے اثر سے آزاد رہے گا۔ اس کا یہ کام ہوگا کہ ہر عہدے کے لئے قابلیت کا ایک کم سے کم درجہ مقرر کرے اور ایک طرف خدمات سرکاری کا معیار بلند رکھنے کی کوشش کرے تو دوسری طرف اس کا لحاظ رکھے کہ سب فرقوں کو خدمات ملکی میں مناسب حصّہ پانے کا یکساں موقع ملے۔

"(۵) وفاقی حکومت کی اور صوبے کی مجلس وزرا کو ترتیب دینے میں اقلیتوں کے حقوق رواج کی رو سے تسلیم کئے جائیں گے۔

"(۶) صوبہ سرحد شمال مغربی اور بلوچستان میں حکومت اور نظم و نسق کی وہی صورت ہوگی جو دوسرے صوبوں میں ہے۔

"(۷) سندھ ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا بشرطیکہ باشندگان سندھ نئے صوبے کے اخراجات کا بار اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔

"(۸) ملک کا آئندہ دستور اساسی وفاقی ہوگا۔ مابقی اختیارات[ل۱] ان حکومتوں کو حاصل ہوں گے جن کے ملنے سے وفاقی نظام بنا ہے۔

مجلس عاملہ مذکورۂ بالا تجویز کو اس حیثیت سے منظور کرتی ہے کہ یہ ان تجاویز میں جو خالص فرقہ وارانہ اصول پر اور ان میں جو خالص قومی اصول پر مبنی ہیں ایک مصالحت کی صورت ہے۔ ایک طرف یہ مجلس عاملہ ساری قوم سے توقع رکھتی ہے

ل۱ Residuary powers
یعنی وہ اختیارات جن کی تصریح دستور اساسی میں نہیں ہے۔

کہ وہ اس کی توثیق کرے گی تو دوسری طرف انتہا پسندوں کو جو اس کے مخالف ہیں یقین دلاتی ہے کہ یہ مجلس لاہور ریزولیوشن کے مطابق ہر تجویز کو نہایت خوشی سے بے کم و کاست قبول کرلے گی بہ شرطیکہ وہ فرقہ ہائے متعلقہ کے نزدیک قابل قبول ہو ''

یہ ہے کانگریس کی تجویز۔

لیکن اگر اس مسئلے کا قومی اصول پر طے کرنا ناممکن ہو اور کانگریس کی تجویز قابل قبول نہ ٹھہرے تو مجھے اس کی طرف سے اجازت ہے کہ کسی اور معقول تجویز کی جسے فرقہ ہائے متعلقہ منظور کرلیں، توثیق کردوں۔ غرض اس مسئلے میں کانگریس ہر طرح رعایت اور مصالحت کے لئے تیار ہے۔ جہاں وہ خود مدد کرنے سے معذور ہوگی وہاں بھی دوسروں کی راہ میں دقتیں نہیں پیدا کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر غیر سرکاری ثالثی کے ذریعہ سے اس معاملہ کو طے کرنے کی کوئی صورت ہو تو کانگریس اس میں دل و جان سے مدد کرے گی۔ لوگوں نے میری نسبت یہ بیان کیا ہے ''کہ میں کونسلوں میں اچھوتوں کی نمائندگی کے خلاف ہوں۔ یہ کہنا سچی بات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنا ہے۔ میں نے جو کہا ہے وہ پھر کہتا ہوں کہ میں ان کی جداگانہ نمائندگی کا مخالف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ بہت نقصان ہو۔ کانگریس حق رائے دہی بالغان کی پابند ہوچکی ہے۔ اس صورت میں ان میں سے لاکھوں کروڑوں رائے دہندوں کی فہرست میں آسکتے ہیں۔ آج جب کہ چھوت چھات روز بروز گھٹ رہی ہے تو ہم کو یہ سمجھنے کی کیا وجہ ہے کہ ان رائے دہندوں کے نامزد کئے ہوئے امیدواروں کا اور لوگ مقاطعہ کریں گے۔ اور سچ پوچھئے تو ان لوگوں کو کونسلوں میں منتخب ہونے سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ مذہبی اور معاشرتی سختیوں سے محفوظ رہیں۔ رسم و رواج نے جس کا نتیجہ قانون سے زیادہ سخت ہوتا ہے اس کو اس قدر ذلیل کردیا ہے

کہ ہر سوچنے سمجھنے والے ہندو کو شرم سے زمین میں گڑ جانا چاہیئے اور اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ میرا بس چلے تو سخت سے سخت قانون جاری کروں جس کی رو سے وہ ظلم جو نام نہاد اعلےٰ طبقوں کے ہاتھ سے میرے ان ہموطنوں پر ہوتا ہے، سنگین جرم قرار دیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوؤں کا ضمیر بیدار ہو گیا ہے اور بہت جلد وہ دن آنے والا ہے کہ چھوت چھات ہمارے گذرے ہوئے دور گناہ کی ایک کہانی بن کر رہ جائے گی۔

---

(۵)

عدالت علیا

(سپریم کورٹ)

جناب لارڈ چانسلر صاحب اور ڈیلیگیٹ صاحبان،

میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے جھجکتا ہوں کیونکہ اب تک اس کے متعلق جو بحث ہوئی ہے اس پر فنی اور اصطلاحی رنگ غالب ہے۔ مگر مجھ پر آپ کی طرف سے اور کانگریس کی طرف سے جس کا میں نمائندہ ہوں، یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں بھی کچھ کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کانگریس وفاقی عدالت کے مسئلے میں ایک قطعی رائے رکھتی ہے جو غالباً یہاں بہت سے ڈیلیگیٹوں کو ناپسند ہوگی۔ اب چاہے وہ رائے اچھی ہو یا بری۔ بہر حال ایک ذمہ دار جماعت کی رائے ہے اس لئے میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ میں اسے آپ کے سامنے کم سے کم پیش کر دوں۔

میں دیکھتا ہوں یہ بحث جس طرح ہو رہی ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے آپ پر مطلق اعتماد نہیں یا ہے تو بہت ہی کم ہے۔ خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے کہ قومی حکومت اپنا کام بلا رو رعایت انجام نہیں دے سکے گی۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ حقوق کے عقدے نے بھی بحث میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیا ہے۔ مگر کانگریس کی پالیسی کا تو دارومدار ہی اس اعتماد اور اعتبار پر ہے کہ جب ہمارے ہاتھ میں حکومت آئے گی تو اس کے ساتھ ذمہ داری کا

احساس بھی پیدا ہو جائے گا اور فرقہ وارانہ تعصب بالکل مٹ جائے گا۔ اور فرض کیجئے ایسا نہ ہو تو بھی کانگریس کڑی سے کڑی جوکھم میں پڑنے کو تیار ہے کیونکہ اس کے بغیر تو حکومت کا بوجھ سچ مچ اٹھانے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے گی۔ جب تک ہمارے دل میں یہ لاگ باقی ہے کہ اس نازک وقت میں اپنا کام چلانے کے لئے ہمیں دوسروں کی مدد اور رہنمائی کا سہارا ڈھونڈھنا ضروری ہے اس وقت تک میرے خیال میں ذمہ دار حکومت کا نام ہی لینا بیکار ہے۔

پھر یہ بات اور الجھن میں ڈالتی ہے کہ ہم اس مسئلے پر بحث تو کر رہے ہیں مگر اس کی کچھ خبر نہیں کہ ہونے والا کیا ہے۔ اگر فوج ذمہ دار حکومت کے ماتحت نہ ہو تو میری رائے اس مسئلے میں کچھ اور ہوگی لیکن اگر فوج کا انتظام ہمارے ہی ہاتھ میں ہو تو کچھ اور ہوگی۔ میں جو کچھ کہوں گا یہ فرض کر کے کہوں گا کہ اگر ہمیں حقیقی معنی میں ذمہ دار حکومت ملی تو فوج ہمارے ہاتھ میں ہوگی یعنی ہر لحاظ سے قومی حکومت کے ماتحت ہوگی۔ جن مشکلات کی طرف ڈاکٹر امبیڈکر نے توجہ دلائی ہے ان کے بارے میں میں بھی پوری طرح ان کا ہم خیال ہوں۔ آپ نے سب سے اونچی عدالت کا فیصلہ تو حاصل کر لیا لیکن اگر اس عدالت کا حکم اس کی چار دیواری کے باہر نافذ نہ ہو تو اس پر ساری قوم بلکہ ساری دنیا ہنسے گی۔ پھر اس حکم کے نفاذ کی کیا صورت ہو؟ مسٹر جناح نے جو بات کہی وہ یقیناً دل کو لگتی ہے کہ اس کے لئے فوج موجود ہے۔ لیکن اگر یہ ہے تو حکم کو نافذ سرکار ہی کرے گی۔ میری طرف سے عدالت علیا یا عدالت وفاقی بھی سرکار ہی کے ماتحت ہو۔ غرض میری رائے تو یہی ہے کہ اگر ہمیں ذمہ دار حکومت ملے تو عدالت علیا اسی حکومت کے ماتحت ہو اور عدالت کے حکم کا نفاذ بھی اسی حکومت کے ہاتھوں ہوا کرے۔ مجھے وہ خوف نہیں ہے جو ڈاکٹر امبیڈکر کو ہے مگر میرے

خیال میں ان کا یہ اعتراض بہت معقول ہے کہ جو عدالت فیصلہ کرنے بیٹھے اسے اس کا بھی پورا اطمینان ہونا چاہیئے کہ جن لوگوں سے واسطہ ہے وہ اس کے فیصلے کا احترام کریں گے اس لئے میری تجویز ہے کہ ججوں کو ان فیصلوں کے متعلق قواعد ضوابط بنانے کا بھی اختیار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان فیصلوں کا نافذ کرنا عدالت کا کام نہیں بلکہ انتظامی افسروں کا کام ہوگا لیکن انتظامی افسر عدالت کے بنائے ہوئے قواعد کے پابند ہوں گے۔

ہم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہمیں اس دستور میں عدالت علیا کے متعلق ذرا ذرا سی جزئیات بھی بتادی جائیں گی۔ مجھے ادب کے ساتھ اس خیال سے قطعاً اختلاف ہے۔ میرے نزدیک اس دستور میں صرف عدالت وفاقی کا ڈھانچا بنا دیا جائیگا اور اس کی حد سماعت کا تعین کر دیا جائے گا باقی سب چیزوں کی نشو ونما حکومت وفاقی پر چھوڑ دی جائے گی۔ میری عقل میں تو کسی طرح نہیں آتا کہ دستور سے ہمیں یہ باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی کہ جج کتنے سال کام کریں گے اور کس عمر میں استعفا دیں گے یا سبکدوش ہوں گے۔ ۷۰ برس کی عمر میں یا ۶۵ برس کی یا ۶۰ برس کی یا ۶۵ برس کی۔ میرا خیال ہے کہ یہ چیزیں حکومت وفاقی کے غور کرنے کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بحث میں بات بات پر اقتدار شاہی کا نام آتا ہے۔ مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ کانگریس کے نقطۂ نظر کے مطابق اقتدار شاہی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کامل آزادی چاہتا ہے اور اگر اسے کامل آزادی مل گئی تو ملک میں جو کوئی فرمانروا قوت ہوگی اسی کے ہاتھ میں ججوں کے تقرر وغیرہ کے اختیارات ہوں گے جو آج کل بادشاہ کو حاصل ہیں۔

کانگریس کا یہ بنیادی خیال ہے کہ دستور کی چاہے جو شکل بھی ہو ہندوستان کی اپنی علیحدہ پریوی کونسل ہونا چاہیئے۔ اگر مقصود یہ ہے کہ پریوی کونسل تمام اہم

معاملات میں غریبوں کی دادرسی کرے تو اس کے دروازے ملک میں غریب سے غریب آدمی کے لئے کھلے رہنا ضروری ہیں اور یہ میرے خیال میں اس صورت میں ناممکن ہے کہ تمام اہم معاملات کا فیصلہ انگلستان کی پریوی کونسل کے ہاتھ میں ہو۔ اس معاملے میں ہمارے لئے یہی اصول مناسب ہے کہ ہم اپنے ججوں کی دانشمندی اور انصاف پر پورا بھروسا کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں بہت بڑے خطروں کا سامنا ہے۔ انگلستان کی پریوی کونسل بہت قدیم ادارہ ہے۔ لوگوں کے دلوں میں، اس کی بڑی عزت و وقعت ہے اور بجا ہے۔ میں بھی اس کی دل سے قدر کرتا ہوں مگر یہ میں کیسے مان لوں کہ ہم خود ایسی پریوی کونسل قائم نہیں کرسکتے جسے ساری دنیا عزت کی نظر سے دیکھے۔ اگر انگلستان میں بہت عمدہ ادارے موجود ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان اداروں کے سہارے بیٹھے رہیں جو چیز انگلستان سے سیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہم خود یہ ادارے اپنے یہاں قائم کریں۔ اس لئے میری التجا ہے کہ ہمیں اس وقت اپنے آپ پر بھروسا کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ہمارا کام ابتدا میں چھوٹا ہو لیکن اگر ہمارے دل فیصلہ کرنے میں مضبوط، سچے اور کھرے ہیں تو اس کی کچھ پروا نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمارے یہاں وہ قانون روایات موجود نہیں جن پر انگلستان کے ججوں کو ناز ہے۔

وسیع ترین حد سماعت ان باتوں کے لحاظ سے میرے نزدیک، وفاقی عدالت کو صرف، انھیں مقدمات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے جو وفاقی حکومت کے قوانین پر مبنی ہوں بلکہ اس کی حد سماعت زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ وفاقی حکومت کے قوانین، توظاہر ہے کہ اسی عدالت کے لئے ہوں گے لیکن اسے پورا اختیار دیا جائے کہ ہندستان کے

طول و عرض سے جتنے مقدمات آئیں سب کی سماعت کر سکے۔

ایک سوال یہ ہے کہ دیسی ریاستوں کی رعایا سے اس عدالت کا کیا تعلق ہوگا۔ میں نہایت ادب سے اور بہت کچھ تامل کے بعد یہ عرض کرتا ہوں، بشرطیکہ والیان ریاست کو اس سے اتفاق ہو کہ اگر اس کانفرنس کا کچھ نتیجہ نکلا تو ہمیں کوئی ایسی چیز ملے گی جو سب ہندوستانیوں میں خواہ وہ ریاست کے ہوں یا برطانوی ہند کے، مشترک ہوگی۔ اور ہم سب میں کوئی چیز مشترک ہو تو مشترکہ حقوق کی پاسبانی کرنا وفاقی عدالت کا کام ہوگا۔ یہ حقوق کیا ہوں گے اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ والیان ریاست خود ہی بتائیں کہ اس میں کون کون سے حقوق شامل ہوں گے اور کون سے نہیں ہوں گے۔ چونکہ یہ حضرات محض فرمانروا خاندانوں کے نمائندے ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اس کانفرنس میں اپنی رعایا کی نمائندگی کا بارِ عظیم بھی اپنے سر لے لیا ہے اس لئے میری عاجزانہ مگر پُرجوش التجا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے کوئی ایسی تجویز پیش کریں جس سے ان کی رعایا کو بھی معلوم ہو جائے کہ گو اس کی نمائندگی براہِ راست اس کانفرنس میں نہیں ہے مگر اس کی رائے کو خود ان شریف النفس رئیسوں کے ذریعے سے اظہار کا موقع مل رہا ہے۔

تنخواہیں

اب رہا تنخواہوں کا معاملہ تو چاہے آپ کو اس پر ہنسی آئے مگر کانگریس کا یہ خیال ہے کہ ہم لوگ جو دولت کے لحاظ سے بالشتئے ہیں برطانوی حکومت کا جو آج دولت میں دیوزاد سمجھی جاتی ہے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کی جس کی اوسط آمدنی تین آنہ روزانہ ہے، یہ بساط نہیں ہے کہ یہ اونچی اونچی تنخواہیں جو یہاں ملتی ہیں دے سکے۔ میرے خیال میں یہ

وہ چیز ہے جو ہندوستان کو حکومت خود اختیاری پاتے ہی دل سے بھلا دینا پڑیگی۔ یہ اسی وقت تک چل سکتی ہے جب تک برطانوی سنگینیں موجود ہیں کہ غریبوں سے دبا کر محصول لیں اور دس دس ہزار، پانچ پانچ ہزار اور بیس بیس ہزار ماہوار کی تنخواہیں دی جائیں۔ خدانہ خواستہ ابھی ہمارے ملک کی پستی یہاں تک نہیں پہنچی کہ وہ کافی تعداد میں ایسے آدمی نہ پیدا کرسکے جو ملک کے کروڑوں غریبوں سے ملتی جلتی زندگی بسر کریں اور اس کے باوجود ہندوستان کی خدمت بہت خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں مان سکتا کہ قابل قانون داں جب تک بازار کے نرخ خریدے نہ جائیں دیانت دار نہیں رہ سکتے۔ میرے ذہن میں موتی لال نہرو، سی، آر داس، من موہن گھوش، بدرالدین طیب جی اور انکے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام ہیں جنھوں نے اپنی قانونی لیاقت سے بغیر کسی معاوضہ کے ملک کو فائدہ پہنچایا اور اپنے ملک کی خدمت بہت قابلیت اور وفاداری سے کرتے رہے۔ ممکن ہے مجھے یہ طعنہ دیا جائے کہ وہ اس وجہ سے ایسا کرتے تھے کہ انھیں اپنے پیشے کے کام میں بڑی بڑی فیسیں ملتی تھیں۔ میں اس دلیل کو نہیں مانتا کیونکہ مجھے ان میں سے سوائے من موہن گھوش کے ہر شخص سے ذاتی واقفیت حاصل تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ بہت خوش حال تھے اور اس وجہ سے ضرورت کے وقت ہندوستان کو اپنی قانونی قابلیت سے فائدہ پہونچاتے تھے۔ میں نے انھیں غریبوں کی سی زندگی کمال قناعت سے بسر کرتے دیکھا ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی میں آپ کو بہت سے ممتاز وکیلوں کے نام بتا سکتا ہوں جو اگر قومی جھنڈے کے نیچے نہ آ گئے ہوتے تو آج ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہوتے۔ اس وجہ سے مجھے امید ہے کہ جب ہم اپنے قواعد وغیرہ ترتیب دیں گے تو حب وطن کے جذبے کو دل میں رکھیں گے۔

اور ہندوستان کے غریبوں کی حالت نظرانداز نہیں کریں گے۔
ایک بات اور سن لیجئے پھر میری تقریر ختم ہے۔ چونکہ کانگریس کی رائے کے مطابق وفاقی عدالت یا عدالت علیا (ان میں سے جو نام بھی آپ پسند کریں) سب سے اونچی عدالت ہوگی جس سے آگے ہندوستان کا کوئی باشندہ نہیں جا سکے گا اس لئے میرے خیال میں اس کا اختیار سماعت بھی غیر محدود ہوگا۔ وفاقی حکومت کے معاملات میں اس کی حد سماعت وہاں تک ہوگی جہاں تک والیان ریاست بھی قبول کریں لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ دو اعلیٰ عدالتیں ہوں جن میں سے ایک صرف وفاقی قانون سے سروکار رکھے اور دوسری ان تمام معاملات سے جو وفاقی نظام یا وفاقی حکومت کے دائرے سے باہر ہیں۔
موجودہ حالت پر نظر کرتے ہوئے ممکن ہے کہ وفاقی حکومت کا تعلق بہت کم امور سے ہو اور اکثر اہم ترین امور غیر وفاقی قرار دئے جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان غیر وفاقی معاملات کا فیصلہ سوائے اس عدالت علیا کے اور کون کرے گا؟ اس لئے یہی ہونا چاہیئے کہ عدالت علیا کو دُہرا بلکہ ضرورت ہو تو تہرا اختیار سماعت دیا جائے۔ جتنے زیادہ اختیارات ہم اس عدالت کو دیں گے اسی قدر اس کا اعتبار دنیا کے نزدیک اور خود اپنی قوم کے نزدیک بڑھے گا۔
مجھے افسوس ہے کہ میں نے کانفرنس کا اس قدر قیمتی وقت صرف کیا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ وفاقی عدالت کے مسئلے پر آپ کے سامنے گفتگو کروں۔ مگر میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ خیالات آپ پر ظاہر کر دوں جو ہم کانگریس والوں میں سے بعض لوگ عرصے سے رکھتے ہیں اور جنھیں ہمارا بس چلے تو ہم سارے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک پھیلا دیں۔
مجھے معلوم ہے کہ میری راہ میں کیا کیا دقتیں ہیں۔ تمام ممتاز قانون داں

میرے مقابلے کے لئے صف آرا ہیں۔ والیان ریاست بھی غالباً تنخواہوں کے اور اختیار سماعت کے معاملے میں میرے مخالف ہیں۔ لیکن اگر میں وہ خیالات جس پر کانگریس اور خود میں اتنی سختی سے قائم ہوں آپ کے سامنے پیش نہ کرتا تو اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا جو کانگریس کی طرف سے اور آپ کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔

---

(۶)

عمومی حکومت کی نفی

اصل مقصد جناب وزیر اعظم اور ڈیلی گیٹ صاحبان ، اقلیتوں کے متعلق اس بحث میں شریک ہونے سے میری طبیعت رکتی ہے اور میں شرم سے گڑا جاتا ہوں۔ میں اس یادداشت کو جو بعض اقلیتوں کی طرف سے ڈیلیگیٹوں کو بھیجی گئی تھی اور آج صبح پہنچی اس قدر غور اور توجہ سے جتنا چاہیئے تھا نہیں پڑھ سکا۔ قبل اس کے کہ میں اس یادداشت کے متعلق چند جملے عرض کروں میں آپ کی اجازت سے نہایت ادب کے ساتھ آپ کے اس خیال سے اظہار اختلاف کرتا ہوں جو آپ نے اس کمیٹی کے سامنے پیش کیا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نہ ہونا دستور اساسی کے بنانے میں حائل ہو رہا ہے اور جب تک یہ حل نہ ہو جائے دستور کا بنانا ناممکن ہے۔ میں نے اس کانفرنس کے ابتدائی جلسوں ہی میں کہہ دیا تھا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اس کے بعد سے اب تک مجھے جو تجربہ ہوا ہے اس نے میری اس رائے کو اور پختہ کر دیا ہے۔ معاف فرمایئے گا واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ سال اس وقت پر اتنا زور دیا جانا اور اس سال اس کا اعادہ ہونا ہی اس کا باعث ہوا کہ مختلف فرقوں کو اپنے اپنے مطالبات اس زور شور سے پیش کرنے کی ہمت پڑی۔ فطرت انسانی کا مقتضا تھا کہ وہ ایسا کرتے۔ ان سب نے دیکھا کہ یہی موقع اپنے اپنے دعووں پہ اڑنے کا ہے اور میری ناقص رائے میں اس مسئلے پہ

زور دینے ہی سے وہ مقصد جو پیش نظر تھا فوت ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہم لوگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ مجھے سر چمن لال سیتلواد کی رائے سے سراسر اتفاق ہے کہ ہمارے کام کا مرکز اور مدار یہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ دستور اساسی کی ترتیب ہے۔
مجھے پوری طرح یقین ہے کہ آپ نے یہ گول میز کانفرنس اس لئے نہیں کی اور ہمیں چھ ہزار میل سے گھر بار کام کاج چھوڑ کر اس لئے نہیں بلایا کہ یہاں بیٹھ کر فرقہ وارانہ مسئلہ حل کریں۔ آپ نے کانفرنس کا انعقاد اس لئے کیا، آپ نے اپنے صریحی اعلان کے مطابق ہمیں دعوت اس غرض سے دی کہ ہم دستور اساسی کے مرتب کرنے میں شریک ہوں۔ آپ نے فرمایا قبل اس کے کہ ہم آپ کے مہمان نواز ملک سے رخصت ہوں ہمیں دل سے یقین ہو جائے گا کہ ہم نے ہندوستان کی آزادی کا شاندار محضر تیار کر لیا ہے اور اس پر صرف دارالعوام اور دارالامراء کی طرف سے مُہر توثیق لگنے کی دیر ہے۔ مگر اس وقت جو صورت حال ہمارے سامنے ہے وہ کچھ اور ہی ہے یعنی آپ کہتے ہیں کہ چونکہ ہم نے فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا ہے اس لئے دستور اساسی کی ترتیب کا کام بند رہے گا اور ہم سب سے آخر میں سارے مرحلے طے ہو جانے کے بعد یہ اعلان کریں گے کہ حکومت کی پالیسی دستور اور اس کے متعلقہ مسائل کے بارے میں کیا ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ یہ انجام نہایت افسوسناک ہے۔ اس کانفرنس کے لئے جس کی اس قدر دھوم دھام تھی اور جس نے لوگوں کے دلوں میں اتنی امیدیں پیدا کر رکھی تھیں۔
اب میں اس دستاویز[1] کی طرف رُخ کرتا ہوں۔

---

[1] وہ اسکیم جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس پر چھوٹی اقلیتوں کا اور مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ سر ہیوبرٹ کار نے اپنی تقریر میں طنزاً گاندھی جی کا شکریہ ادا کیا تھا کہ ان کے اقلیتوں کے مسئلے کو حل نہ کر سکنے کی بدولت اقلیتوں میں باہم اتفاق کی صورت پیدا ہوئی۔

سر ہیوبرٹ کار کا شکریہ میرے سر آنکھوں پر۔ ان کا یہ قول بجا ہے کہ اگر میں نے اس بوجھ کو اٹھاتے وقت وہ حیلے نہ کیے ہوتے اور اگر میں اس مسئلے کو حل کرنے میں سراسر ناکامیاب نہ ہوا ہوتا تو انھیں وہ قابل تعریف حل دریافت کرنے کا موقع نہ ملتا جو انھوں نے دوسری اقلیتوں کے اتفاق سے اس کمیٹی کے غور کرنے کے لئے اور اس کے بعد ملک معظم کی وزارت کی منظوری کے لئے پیش کیا ہے۔

میں سر ہیوبرٹ کار اور ان کے رفیقوں کو اس خوشی سے محروم نہیں کرنا چاہتا جس سے ان کے دل صحیحاً معمور ہیں لیکن میرے خیال میں تو جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ لاش کے پاس بیٹھ کر نہایت صفائی کے ساتھ عمل جراحی کے ذریعے سے اس کا ایک ایک عضو الگ کر دیا ہے۔

ہندوستان کی سب سے ممتاز سیاسی انجمن کے نمائندے کی حیثیت سے میں بے تامل ملک معظم کی حکومت سے، ان دوستوں سے جو اقلیتوں کی نمائندگی کے مدعی ہیں بلکہ ساری دنیا سے خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اس اسکیم کا مقصد ذمہ دارانہ حکومت حاصل کرنا نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ دفتری حکومت کے اختیارات میں حصہ بٹایا جائے۔

اگر اس سے یہی منشا ہے۔ اور دستاویز کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی منشا ہے۔ تو ان حضرات کو مبارک ہو کانگریس کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ کانگریس کو سالہا سال دشت طلب میں بھٹکنا منظور ہے مگر اس تجویز کا ساتھ دینا منظور نہیں جس کی بدولت آزادی کے درخت کا پنپنا ناممکن ہو جائے گا۔

مجھے حیرت ہے کہ سر ہیوبرٹ کار ہمارے سامنے فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ اسکیم

ایک عارضی میعاد کے لئے ہے اس لئے اس سے قومیت کے مقصد کو صدمہ نہیں پہنچے گا بلکہ دس سال کے بعد ہم سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میرے سیاسی تجربے سے جو سبق حاصل ہوا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر اس ذمہ دارانہ حکومت کو، جب کبھی اس کا وقت آئے، نیک ساعت میں شروع کرنا منظور ہے تو قوم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرنا چاہیئے جو اس اسکیم کا ماحصل ہے۔ یہ ایسا صدمہ ہے جسے کوئی قومی حکومت برداشت نہیں کرسکتی۔

اس پر طرّہ یہ ہے کہ جناب وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ یہ تجاویز گویا ہندوستان کے ساڑھے گیارہ کروڑ باشندوں یعنی ۴۶ فی صدی آبادی کے نزدیک قابل قبول ہیں۔ مجھے نہایت حیرت ہے کہ آپ نے ایسی بات زبان سے نکالی اور وہ بھی اس طرح جیسے یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے آپ کو ان اعداد کے غلط ہونے کا بیّن ثبوت مل چکا ہے۔ عورتوں کی طرف سے آپ کے سامنے جداگانہ نمائندگی کی قطعی مخالفت کی جاچکی ہے اور چونکہ اتفاق سے ہندوستان کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اس لئے ۴۶ فی صدی کی تعداد میں کچھ کمی کرنا پڑے گی۔ اس کے علاوہ ایک چیز قابل لحاظ ہے۔ ممکن ہے کہ کانگریس کوئی قومی جماعت نہ ہو لیکن میں دعوے سے کہہ چکا ہوں اور مجھے دوبارہ کہنے میں باک نہیں کہ کانگریس نہ صرف برطانوی ہند بلکہ پورے ہندوستان کی پچاسی یا پچانوے فی صدی آبادی کی نمائندگی کرتی ہے چاہے اس پر کتنا ہی اعتراض کیا جائے میں اس دعوے کو پورے زور کے ساتھ دہراتا ہوں کہ کانگریس حق خدمت کی بنا پر اس آبادی کی وکیل ہے جو ہندوستان کی زرعی آبادی کہلاتی ہے۔ اگر حکومت چیلنج دے تو میں قبول کرنے کو تیار ہوں کہ ہندوستان میں

کل باشندوں کی رائے اس بارے میں حاصل کی جائے۔ اس سے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کانگریس ان کی نمائندہ ہے یا نہیں۔ مگر میں ایک قدم اس سے بھی آگے بڑھتا ہوں۔ اس وقت اگر آپ ہندوستان کے جیل خانوں کے رجسٹر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا ان کے اندر کانگریس کی طرف سے بہت سے مسلمان موجود تھے اور کانگریس کے رجسٹروں میں بھی بہت سے مسلمانوں کے نام ہیں۔ پچھلے سال کئی ہزار مسلمان کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر جیل میں گئے تھے۔ کانگریس کے رجسٹر میں بھی آج ہزاروں مسلمانوں کے نام داخل ہیں۔ اسی طرح اس کے اندر ہزارہا اچھوتوں کے نام ہیں۔ بعض دیسی عیسائی بھی اس کے ممبر ہیں۔ نواب صاحب چھتاری کا احترام مدنظر رکھتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ بعض زمیندار اور کارخانوں کے مالک بھی کانگریس میں شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ آہستہ آہستہ دیکھ بھال کر کانگریس کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں مگر کانگریس ان کی خدمت کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ اس بات میں تو شبہہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مزدوروں کی وکیل ہے۔ غرض اس دعوے کو، کہ جو تجاویز اس یادداشت میں پیش کی گئی ہیں ساڑھے گیارہ کروڑ آدمیوں کے نزدیک قابل قبول ہیں، تسلیم کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

بس ایک بات مجھے اور عرض کرنا ہے۔ کانگریس کی تجویز فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق آپ کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے اور ممبروں میں گشت لگا چکی ہے۔ میری گذارش ہے کہ جتنی تجاویز میں نے دیکھیں ان میں یہ سب سے زیادہ قابل عمل ہے مگر ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ مختلف فرقوں کے جو نمائندے اس کانفرنس میں موجود ہیں انھیں یہ تجویز

پسند نہیں آئی مگر انھیں جماعتوں کے جو نمائندے ہندوستان میں ہیں انھوں نے اسے پسند کیا۔ یہ محض عقلی گدے نہیں ہیں بلکہ ایک کمیٹی کی رائے ہے۔ جس میں متعدد ممتاز فرقوں کے نمائندے موجود تھے۔ کانگریس کی طرف سے یہ تجویز آپ کے سامنے پیش ہے۔ مگر اس کے علاوہ کانگریس نے یہ بھی کہا ہے، کہ غیر جانب دار لوگوں کی پنچائت اس معاملے کا فیصلہ کرے۔ پنچائت کے ذریعہ سے ساری دنیا میں لوگ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں اور کانگریس ہمیشہ ثالثوں کی عدالت کا ہر فیصلہ قبول کرنے کو تیار رہی ہے۔ میں نے خود عرض کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے ججوں کی ایک عدالت مقرر ہو جو اس معاملے پر غور کر کے اس کا فیصلہ کر دے۔ لیکن اگر ان تدبیروں میں سے کوئی قابل قبول نہیں سمجھی جاتی اور اس مسئلے کا حل ہونا دستور اساسی کی ترتیب کی ناگزیر شرط قرار دیا جاتا ہے تو سر ہیوبرٹ کار وغیرہ کی تجویز کو منظور کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم بغیر ذمہ دار حکومت کے گذارہ کریں۔

میں پھر ایک بار دُہرا دوں کہ کانگریس اس مسئلے کے حل کو جو ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے لئے قابل قبول ہو، منظور کرنے کو تیار ہے مگر وہ دوسری اقلیتوں کی جداگانہ نمائندگی کی ہرگز تائید نہیں کرے گی۔ البتہ کانگریس ان سب دفعات کی اور شرائط کی توثیق کرے گی جو مختلف جماعتوں کے اساسی حقوق اور مدنی آزادی کے متعلق ہوں۔ اس کی طرف سے ہر شخص کو رائے دہی کا اور انتخاب کے لئے کھڑے ہونے کا حق ہوگا۔ میری ناچیز رائے میں سر ہیوبرٹ کار کی تجویز سراسر ذمہ دار حکومت اور جذبۂ قومی کے منافی ہے۔ اگر ہندوستان کے وکلاء کا انتخاب یہ مختلف جماعتیں کریں گی جو اتنے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہیں، تو پھر ہندوستان کا خدا حافظ ہے۔ تمام ہندوستان کی

خدمت صرف وہی یو رپی کر سکتا ہے جسے صرف یو رپی ہی نہیں بلکہ عام انتخاب کنندگان پسند کرتے ہوں ۔ اس تجویز کی بدولت ذمّہ دار حکومت ہمیشہ ان مخصوص اغراض رکھنے والی جماعتوں سے برسرپیکار رہا کرے گی ۔ ان کی اغراض میں اور قومی روح میں یعنی پچاسی فیصدی زرعی آبادی کے جذبات میں ہمیشہ ان بن رہے گی ۔ میں تو اس کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اگر ہمیں ذمہ دار حکومت قائم کرنا ہے اور سچی آزادی حاصل کرنا ہے تو ان مخصوص طبقوں میں سے ہر ایک کو اپنا مبارک حق اور اپنا فرض سمجھنا چاہیئے کہ مجالس وضع قوانین میں عام دروازے سے جو سب کے لئے کھلا ہے ، داخل ہوں یعنی عام حلقہ ہائے انتخاب کی تائید حاصل کریں ۔

اچھوتوں کی علیحدگی دوسری اقلیتوں کے مطالبے تو خیر سمجھ میں آتے ہیں لیکن اچھوتوں کی طرف سے جو دعویٰ پیش کیا جاتا ہے وہ میرے لئے سب سے بڑھ کر سوہان روح ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لئے ذات باہر سمجھے جائیں ۔ میں اچھوتوں کے اہم حقوق کو ہندوستان کی آزادی کی قیمت پر بھی نہیں بیچنا چاہتا ۔ یہ میں صرف کانگریس کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے بھی کہہ رہا ہوں اور میرا دعوے ہے کہ اگر اچھوتوں کی عام رائے شماری ہو تو ان کی کثرت رائے میرے حق میں ہوگی بلکہ مجھے اور سب سے زیادہ رائیں ملیں گی ۔ میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اچھوتوں سے یہ کہتا پھروں گا کہ جداگانہ انتخاب اور مخصوص نمائندگی اس کلنک کے ٹیکے کا علاج نہیں جو ان کی پیشانی پر لگایا جاتا ہے ۔ اس کمیٹی کو اور ساری دنیا کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ ہندو مصلحوں کی ایک جماعت موجود ہے جو اس چیز کو اچھوتوں کے لئے نہیں بلکہ پرانے خیال

کے ہندوؤں کے لئے قابل شرم سمجھتے ہیں اور انھوں نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ اس دھبّے کو مٹا کر رہیں گے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے رجسٹروں میں اور مردم شماری میں اچھوتوں کی ایک علیحدہ جماعت قرار دی جائے۔ ممکن ہے کہ سکھ ہمیشہ سکھ رہیں، مسلمان ہمیشہ مسلمان رہیں، یورپی ہمیشہ یورپی رہیں۔ مگر کیا اچھوت ہمیشہ اچھوت رہیں گے؟ میرے نزدیک چھوت چھات کے رہنے سے تو ہندو دھرم کا نہ رہنا بہتر ہے۔ اس لئے باوجود اس احترام کے جو ڈاکٹر امبیڈکر کی اچھوتوں کو ابھارنے کی خواہش اور ان کی قابلیت کا میرے دل میں ہے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ غالباً ان تلخ تجربات نے جو انھیں پیش آئے ان کی قوت فیصلہ کو اس وقت جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا ہے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے لیکن اگر میں نہ کہوں تو اچھوتوں کے کام میں جو مجھے جان کے برابر عزیز ہے غفلت اور بیوفائی ہوگی۔ میں ان کے حقوق کا سودا ساری دنیا کی بادشاہت کے بدلے میں بھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں ذمہ داری کے احساس کے ساتھ کہتا ہوں، کہ ڈاکٹر امبیڈکر کا یہ دعوے صحیح نہیں ہے کہ وہ سارے ہندوستان کے اچھوتوں کے وکیل ہیں۔ جس چیز کی وہ کوشش کر رہے ہیں اس سے ہندو دھرم میں ایسی تفریق پیدا ہو جائے گی جس کا خیال میرے لئے ہرگز خوش گوار نہیں ہے۔ میں اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ اچھوت مسلمان یا عیسائی ہو جائیں لیکن ہر گاؤں میں یہ تفریق، باقی رہنے سے ہندو دھرم کا جو انجام ہوگا وہ مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ جو لوگ اچھوتوں کے سیاسی حقوق کا ذکر کرتے ہیں وہ ہندوستان سے

ف نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی معاشرے (سوسائٹی)
حالت آج کل کیا ہے۔ اس لئے میں جتنے زور کے ساتھ کہہ سکتا
ں کہتا ہوں کہ اگر اس چیز کی مخالفت میں کوئی ایک شخص بھی
ساتھ نہ دے تب بھی میں اسے روکنے کی کوشش کروں گا چاہے
ں میں میری جان چلی جائے۔

---

(۷)

ملک کی حفاظت کا مسئلہ

جناب لارڈ چانسلر اور ڈیلیگیٹ صاحبان، میں جانتا ہوں کہ اس اہم مسئلے کے متعلق کانگریس کی رائے ظاہر کرنے میں مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے میں اس میں اس لئے دخل دے رہا ہوں کہ میری آنکھوں کے سامنے نومبر کا کہر چھایا ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس بحث کی کوئی رپورٹ بھیجی جائیگی یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بحث اب بالکل ختم کردی جائے گی یا جاری رہے گی۔ میں تو اپنی طرف سے جاڑے کا موسم انگلستان میں گزارنے کے لئے تیار ہو کر آیا ہوں۔ اس لئے اگر ذراسی بھی امید ہو کہ کانگریس کا مقصد دوستانہ گفت وشنید اور باہمی مشوروں سے حاصل ہو جائے گا تو مجھے وقت صرف ہونے کی کوئی پروا نہیں۔ میں یہاں خاص اس غرض سے بھیجا گیا ہوں کہ باعزت فیصلے کی جتنی صورتیں ممکن ہوں سب کو ٹٹولوں خواہ کھلی بحث کے ذریعے سے جو اس کانفرنس میں کی جائے، خواہ نجی گفتگو کے ذریعے سے جو وزیروں، رائے عامہ پر اثر رکھنے والوں اور ان سب لوگوں سے ہو جنہیں ہندوستان کے متعلق اہم مسائل سے دلچسپی ہے میں اس بات کا پابند ہوں کہ فیصلہ کرنے کی کوشش میں کوئی بات اٹھا نہ رکھوں کیونکہ کانگریس کی پالیسی سے آپ سب حضرات واقف ہیں۔ وہ ان سب معاملات کے متعلق قطعی رائے رکھتی ہے اور اپنا مقصد جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ وہ اپنے آپ کو ان سب ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے قابل

سمجھتی ہے جو حکومت خود اختیاری کی وجہ سے عائد ہوتی ہے۔

ایسی صورت میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اس اہم بحث کو ختم ہو جانے دوں اور اس کے متعلق جو نقطہ نظر کانگریس کا ہے اسے عاجزی سے مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے پیش نہ کروں۔

آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ کانگریس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کو کامل ذمہ دارانہ حکومت دیدی جائے۔ اس کے یہ معنی ہیں جو کانگریس کے ریزولیوشن میں صراحت سے بیان کر دئے گئے ہیں کہ ذمہ دارانہ حکومت کا نچوڑ ہیں حفاظت ملک اور امور خارجہ پر پورا اختیار ہو۔ مگر اسی کے ساتھ کانگریس بعض چیزوں میں سمجھوتا کرنے پر راضی ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو اور دنیا کو اس خیال خام سے دھوکا نہیں دینا چاہیئے کہ اس اہم معاملے میں آزادی حاصل کئے بغیر ہم ذمہ دارانہ حکومت حاصل کر لیں گے میرے نزدیک جس قوم کو اپنی فوج محافظ اور امور خارجہ پر اختیار نہیں، وہ آزاد قوم نہیں کہلا سکتی، اگر کسی قوم کی فوجیں کسی بیرونی قوت کے ماتحت ہیں خواہ وہ دوستوں ہی کی قوت کیوں نہ ہو، اس کی حکومت ہرگز ذمہ دارانہ حکومت نہیں ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو ہمارے انگریز استادوں نے ہمیں بار ہا پڑھایا ہے۔ اس لئے بعض انگریزوں نے جب یہ سنا کہ ہمیں ذمہ دارانہ حکومت ملے گی لیکن محافظ فوج پر اختیار نہیں ملے گا یا ہم اس کا مطالبہ نہیں کریں گے تو انھوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

میں کانگریس کی طرف سے نہایت ادب سے فوج، حفاظت ملک اور امور خارجہ کے کامل اختیارات کا مطالبہ کرتا ہوں میں نے امور خارجہ کو اس لئے شامل کر لیا کہ جب سر تیج بہادر سپرو ان کے متعلق تقریر کریں تو مجھے کچھ

کہنے کی ضرورت نہ پڑے۔

ہم اس نتیجے پر بہت کچھ غور و فکر کے بعد پہنچے ہیں۔ اگر ہمیں ذمہ دارانہ حکومت کے آغاز کے وقت یہ اختیارات اس بنا پر نہیں دیئے جاتے کہ ہم ان کے اہل نہیں ہیں تو اس کی کیا امید ہو کہ دوسرے امور میں آزادی حاصل ہونے کی وجہ سے ایک دن ہم میں دفعتہً فوج کے انتظامات کی قابلیت پیدا ہو جائے گی۔

تسخیری فوج

میں اس کمیٹی کو تھوڑی دیر کے لئے اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج کل فوج کی کیا حیثیت ہے میرے خیال میں تو یہ فوج خواہ برطانوی ہو یا ہندوستانی تسخیری فوج ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس کے سپاہی گورکھے ہیں یا پٹھان یا مدراسی یا راجپوت۔ وہ کوئی بھی ہوں ہمارے نزدیک تو جب تک وہ اس فوج میں ہیں جو بدیسی حکومت کے ماتحت ہے۔ وہ خود بھی غیر ملکی ہیں۔ مجھے ان سے گفتگو کا موقع نہیں مل سکتا۔ بعض سپاہی چھپ کر میرے پاس آئے اور مجھ سے بات کرتے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی رپورٹ نہ کر دی جائے۔ ہم لوگ ان مقامات پر جہاں سپاہی رہتے ہیں جا بھی نہیں سکتے۔ ان کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہمیں اپنا ہم وطن نہ سمجھیں۔ بر خلاف دنیا کے اور ملکوں کے ان میں اور شہر کے لوگوں میں کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا ہیں یہ شہادت اس کمیٹی کے سامنے اس شخص کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں جس نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں کانگریس والوں کا تجربہ ہے کہ ان کے اور ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہے جو کبھی نہیں ہٹتی۔

مجھے معلوم ہے کہ ہمارے لئے ایک ہی وقت میں خود اختیاری حکومت کو چلانا اور فوج کا انتظام کرنا، خواہ اس میں برطانوی فوج شامل نہ ہو بہت بڑی ذمّہ داری ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے رنج ہوتا ہے کہ یہ افسوسناک صورت حال ہمارے حکمرانوں نے ہمارے لئے پیدا کر دی ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو یہ ذمّہ داری تو ہمیں برداشت ہی کرنا ہے۔

اب اس فوج کے برطانوی حصّے کو لیجئے۔ اس فوج کا کیا مصرف ہے؟ ہندوستان کا بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ برطانوی فوج ہمارے یہاں محض بیرونی حملے کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ برطانیہ کے اغراض کی حفاظت کے لئے رکھی گئی ہے۔ مجھے یہ باتیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہیں مگر میں کیا کروں میری معلومات اور میرا تجربہ یہی ہے اور اگر میں اس حقیقت کو جو میں نے دیکھی ہے اور جس پر میرا عقیدہ ہے ظاہر نہ کروں تو یہ خود میرے برطانوی دوستوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ اس فوج کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف جو بغاوت ہو اُسے دبائے۔

یہ ہیں اس فوج کے اصلی فرائض۔ اسی وجہ سے مجھے انگریزوں کی اس رائے پر جو وہ رکھتے ہیں تعجب نہیں ہے۔ اگر میں انگریز ہوتا اور دوسری قوم پر حکومت کرنے کا شوق رکھتا تو میں بھی یہی کرتا۔ میں ہندوستانیوں کو بھرتی کرکے انھیں فوجی تربیت دیتا اور انھیں یہ سکھاتا کہ میرے وفادار رہیں اتنے وفادار کہ جسے میں کہوں گولی ماردیں۔ آخر جلیانوالہ باغ میں ہندوستانیوں کو انھیں کے ہم وطنوں نے گولی ماری تھی۔

برطانوی فوج کا ایک یہ مقصد بھی ہے کہ مختلف ہندوستانی سپاہیوں میں توازن قائم رکھے۔ یہ برطانوی افسروں کی، اہل برطانیہ کی جانوں کی حفاظت

کرتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہیئے۔ اس میں بھی کوئی شکایت کی بات نہیں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ برطانیہ کے لئے ہندوستان پر قابض ہونا اور ہر حالت میں قابض رہنا جائز ہے۔

ایک نہایت اہم شرط ایسی صورت میں مجھے اس سوال کا جواب دینے میں کوئی دقت نہیں جس سے سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت مالویہ پہلو بچاتے ہیں۔ ان دونوں نے یہ کہا ہے کہ چونکہ ہم ماہر فن نہیں ہیں اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ فوج میں کتنی کمی ہو سکتی ہے یا ہونا چاہیئے۔ میرے لئے کوئی معذوری نہیں ہے۔ میں بے تامل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس فوج کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے۔ میں پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں اگر مجھے ان مشکلات کے باوجود جو بدیسی راج نے ہمارے لئے پیدا کی ہیں ہندوستان کی حکومت چلانا ہے تو یہ فوج یا تو میرے اختیار میں دیدی جائے یا ایک سرے سے موقوف کر دی جائے۔

اس بنیادی خیال کی بنا پر مجھے برطانوی وزیروں سے اور برطانوی قوم سے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر آپ حضرات حکومت ہمارے حوالے کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک اہم شرط یہ سمجھیئے کہ فوج ساری کی ساری ہمارے اختیار میں دیدی جائے۔

دیرینہ آرزو مگر میں نے آپ سے عرض کر دیا کہ میں اس کے خطرات سے بھی واقف ہوں۔ فوج میرے حکم کو نہیں مانے گی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ نہ برطانوی کمانڈران چیف میرا حکم مانے گا نہ سکھ اور نہ راجپوت جنھیں اپنی بہادری پر ناز ہے۔ ان میں سے کوئی بھی خوشی سے میری ماتحتی قبول نہیں کرے گا۔ مگر اس پر بھی آپ کی عنایت سے

میں چاہتا ہوں کہ اپنا حکم چلاؤں۔ آپ کی قوم کمان بدلتے وقت ان سپاہیوں کو نیا سبق سکھائے گی اور ان سے کہے گی کہ "دیکھو تم نے اپنے نئے افسروں کا حکم مانا تو یہ اپنے ہی ہم وطنوں کی خدمت ہو گی"۔ ان سے یہ بھی کہنا چاہیئے۔ "اب سے تمہارا کام اہل برطانیہ کی جان اور ان کے اغراض کی حفاظت نہیں بلکہ ہندوستان کو بیرونی حملے سے اور ضرورت ہو تو اندرونی شورش سے محفوظ رکھنا ہے۔ تمہیں یہ کام اس طرح انجام دینا چاہیئے گویا اپنے ہم وطنوں کی حفاظت اور خدمت کر رہے ہو"۔ یہ ہے وہ آرزو جو میرے دل میں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ آرزو یہاں پوری نہیں ہو گی۔ میرا دل یہی کہتا ہے میرے حواس کی شہادت یہی ہے کہ یہ آرزو اس وقت اور اس جگہ اس کانفرنس کے ذریعے سے پوری نہیں ہو گی۔ لیکن میری یہ آرزو بدستور رہے گی۔ اسے میں جب تک جان میں جان ہے دل سے دور نہیں ہونے دوں گا۔ یہاں کی فضا دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ میں برطانوی مدبروں اور برطانوی قوم کے دل میں یہ خیال اور یہ نصب العین پیدا نہیں کر سکتا کہ ان کی دلی آرزو بھی یہی ہونا چاہیئے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ وزیر اعظم کے اعلان کے اور لارڈ ارون کی خواہش کے یہی معنی سمجھوں۔ برطانیہ عظمٰی کو اس وقت اپنا قابل فخر حق اور مایۂ ناز فرض سمجھنا چاہیئے کہ ہمیں اپنی حفاظت کے گر سکھائے۔ ہمیں پروبال سے محروم کر لینے کے بعد اس کا فرض ہے کہ ہمیں ایسے بازو دے جن سے ہم اڑ سکیں اسی طرح جیسے وہ خود سرگرم پرواز ہے حقیقت میں یہی چیز ہے جو میرے حوصلوں کا مقصد ہے۔ اگر مجھے ملکی حفاظت پر اختیار نہ ملا تو میں قیامت تک ذمہ دارانہ حکومت قبول نہیں کروں گا۔ میں ہرگز اپنے نفس کو یہ کہکر دھوکا نہیں دوں گا کہ ملکی حفاظت کا اختیار نہیں ملا تو کیا ہوا۔ خود اختیاری حکومت کا

آغاز ضرور ہو جانا چاہیئے۔

آخر ہندوستانیوں کی قوم ایسی تو نہیں جسے اپنی حفاظت کرنا کبھی آتا ہی نہ تھا۔ اس کے لئے جو جوہر چاہیئے اس کی کمی نہیں۔ اسی ہندوستان میں مسلمان موجود ہیں جو بیرونی حملے سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ سکھ ہیں جنھیں کسی سے مغلوب ہونے کا خوف نہیں۔ گورکھے ہیں جن میں قومی روح پیدا ہونے کی دیر ہے کہ وہ کہیں گے "ہم اکیلے ہی ہندوستان کی حفاظت کر سکتے ہیں"۔ راجپوت ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تھرموپولی[1] جیسے ہزاروں معرکے سر کئے ہیں۔ یہ کرنل ٹاڈ کا قول ہے جو خود انگریز تھا۔ کرنل ٹاڈ کے نزدیک راجپوتانے کا ایک ایک ذرہ تھرموپولی کا جواب ہے۔ کیا یہ لوگ اس کے محتاج ہیں کہ انھیں ملک کی حفاظت کا فن سکھایا جائے؟ مجھے یقین ہے کہ جب ہمیں ذمہ دارانہ حکومت ملے گی تو یہ سب مل جل کر ایک ہو جائیں گے۔ میرے لئے یہ بات سوہان روح ہے کہ ہم نے ابھی تک فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی تصفیہ نہیں کیا ہے۔ لیکن جب کبھی تصفیہ ہو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم لوگ ایک دوسرے پر بھروسا کریں گے۔ چاہے حکومت میں زیادہ دخل مسلمانوں کو ہو یا سکھوں کو یا ہندوؤں کو، وہ سکھ یا مسلمان یا ہندو کی حیثیت سے حکومت نہیں کریں گے بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے۔ اگر ہم ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے تو ظاہر ہے کہ ہمیں انگریزوں کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ مگر پھر ہمیں ذمہ دارانہ حکومت کا نام نہیں لینا چاہیئے۔

کم سے کم میں تو یہ ہرگز نہیں سمجھتا کہ بغیر فوج پر اختیار پائے ہماری حکومت ذمہ دارانہ حکومت ہوگی۔ مجھے تہ دل سے اس بات کا احساس ہے کہ اگر ہمیں ذمہ دارانہ حکومت لینا ہے (اور کانگریس یقیناً ذمہ دارانہ حکومت لینا چاہتی ہے

---

[1] Thermopolae

اُسے اپنے اوپر، اپنے ملک والوں پر اور ان سب بہادر قوموں پر بھروسا ہے بلکہ انگریزوں پر بھی بھروسا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنا فرض انجام دیں گے۔ یعنی ملک کی حکومت پوری طرح ہمارے ہاتھ میں دیدیں گے) تو ہمیں برطانوی قوم کے دل میں ہندوستان کی ایسی محبّت پیدا کرنا چاہیئے جس کی بدولت وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ اگر برطانوی قوم یہ سمجھتی ہے کہ اس کام میں سو سال لگ جائیں گے تو کانگریس سو سال تک راہ طلب میں بھٹکنے کو تیار ہے۔ کانگریس کو ابھی قیامت کی آگ میں تپنا ہے، مصیبت اور بدنامی کے طوفان کا مقابلہ کرنا ہے، اور اگر خدا کی مرضی یوں ہی ہے تو گولیوں کی بوچھاریں سے گذرنا ہے۔ اگر یہ ہوا تو محض اس سبب سے ہو گا کہ ہم ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کرتے اور انگریزوں اور ہندوستانیوں کا زاویۂ نگاہ الگ الگ ہے۔

یہ میرا بنیادی خیال ہے۔ میں یہاں جزویات کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔

تحفظات مجھے جو کہنا تھا میں نے اپنے امکان بھر پورے زور کے ساتھ کہہ دیا ہے لیکن میری یہ ایک بات مان لی جائے تو میں اتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہوں کہ خود ہی بہت سے ایسے تحفظات تجویز کر دوں گا جو ہر شخص کو جس کا دل تعصب سے پاک ہے، پسند آئیں گے بشرطیکہ اس پر پہلے اتفاق ہو جائے کہ یہ تحفظات ہندوستان کے مفاد پر مبنی ہوں گے۔ بلکہ میں تو لارڈ اروِن کے اس قول کی تائید کرنے کو بھی تیار ہوں کہ گو معاہدے میں تحفظات کے لیئے ہندوستان کے مفاد پر مبنی ہونے کی شرط رکھی گئی ہے مگر اس کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ وہ ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لیئے مفید ہوں۔ میں کوئی ایسا تحفظ نہیں چاہتا جو صرف ہندوستان کے لیئے مفید ہو اور انگلستان کے لیئے نہ ہو

بہ شرطیکہ دونوں ملکوں میں برابر کی شرکت ہو جس کا قائم رہنا دونوں کی مرضی پر موقوف ہو۔

جو وجوہ فوج پر کامل اختیار کا مطالبہ کرنے کی میں نے آج آپ کے سامنے پیش کی ہیں وہی اس مطالبے کی تائید میں بھی پیش کی جا سکتی ہیں کہ ہمیں اپنے امورِ خارجہ پر پورا اختیار دیا جائے۔

امورِ خارجہ | مجھے اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ امورِ خارجہ کے کیا معنی ہیں اور میں نے گول میز کانفرنس کی رپورٹیں اس مسئلے کے متعلق نہیں پڑھی تھیں اس لیے میں نے اپنے دو دوستوں یعنی مسٹر آئنگر اور سر تیج بہادر سپرو سے درخواست کی کہ مجھے امورِ خارجہ اور غیر ملکی تعلقات کا مفہوم سمجھا دیں۔ انھوں نے جو جواب بھیجا ہے وہ میرے سامنے موجود ہے۔ وہ ان الفاظ کے یہ معنی بتاتے ہیں "وہ تعلقات جو ہمسایہ ملکوں سے، ہندوستانی ریاستوں سے، نو آبادیوں سے اور بین الاقوامی امور میں غیر قوموں سے ہوں۔" اگر امورِ خارجہ کے یہ معنی ہیں تو میرے خیال میں ہم لوگ پوری طرح اس بوجھ کے اٹھانے کے اہل ہیں اور امورِ خارجہ سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں ہم یقیناً یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ اپنے ہمسایوں سے جو ہمارے بھائی ہیں اور ہندوستانی رئیسوں سے جو ہمارے ہم وطن ہیں صلح کی شرائط طے کر سکیں ہم افغانوں سے جن کا ملک ہمارے ملک سے ملا ہوا ہے اور جاپانیوں سے جو سمندر پار رہتے ہیں نہایت عمدہ دوستانہ تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور نو آبادیوں سے گفت و شنید کرنے میں بھی معذور نہیں۔ اگر نو آبادیاں ہمارے ہم وطنوں کو عزت کے ساتھ اپنے یہاں نہ رہنے دیں تو ہم ان سے نبٹ لیں گے۔

ممکن ہے کہ میں نے جو کچھ کہا یہ محض حماقت کی بات ہو مگر آپ یہ سمجھ لیجیے کہ کانگریس

کے اندر میری طرح ہزاروں لاکھوں احمق مرد اور عورتیں موجود ہیں اور انھیں لوگوں کی طرف سے میں یہ مطالبہ نہایت ادب کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ جو تحفظات میں نے سوچے ہیں ان کے ذریعے سے ہم سب کے حقوق ایک ایک کر کے ادا کریں گے

پنڈت مدن موہن مالوی نے اپنی تقریر میں تحفظات کا ایک خاکہ کھینچا ہے، مجھے ان کی بہت سی باتوں سے پوری طرح اتفاق ہے لیکن میرے نزدیک ان کے علاوہ اور بھی تحفظات ہو سکتے ہیں۔ اگر انگریز اور ہندستانی مل کر غور کریں اور دونوں صاف دل سے ایک ہی مقصد کو پیش نظر رکھیں تو مجھے پورا یقین ہے کہ ہم ایسے تحفظات تجویز کر لینگے جن سے ہندوستان اور انگلستان دونوں کی آبرو رہ جائے۔ اور اہل برطانیہ کی ہر ایک جان اور ان کا ہر ایک مفاد محفوظ ہو جائے۔ اس کی ضمانت میں ہندستان اپنی قومی عزت مکفول کرنے کو تیار ہے۔

جناب لارڈ چانسلر اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے اس جلسے کا اتنا وقت صرف کیا۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر روز یہاں آکر بیٹھنے سے اور دن رات اس فکر میں رہنے سے کہ ان مشوروں کا کوئی مفید نتیجہ نکلے اگر میرے دل میں جوش کا وفور ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ جوش انگریزوں کی سچی خیر اندیشی کا ہے اور اپنے اہل وطن کی سچی خدمت کا۔

---

(۸)

تجارتی معاملات میں تفریق

جناب لارڈ چانسلر اور دوستو، میں مسٹر بنتھال کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنے بیان میں بہت اعتدال سے کام لیا ہے۔ کاش وہ اس قابل تعریف بیان کو دو باتیں کہہ کر خراب نہ کر دیتے۔ ایک بات جو انھوں نے کہی کم و بیش یہ ہے کہ یورپی اور برطانوی اپنے مطالبات کی بنا اس پر رکھتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان پر کچھ احسانات کئے ہیں وہ اس رائے کا اظہار نہ کرتے تو اچھا تھا اور جب کیا ہے تو کسی کو لارڈ ریڈنگ کی طرح اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے مہذب الفاظ میں اس رائے کی تردید کی۔ اور سر فیروز سیٹھنا نے ان کا ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے بیان میں وہ دھمکی دینا مناسب نہیں تھا جو انھوں نے اپنی معزز جماعت کی طرف سے دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یورپی جماعت قومی مطالبے کی تائید اس شرط پر کرے گی کہ ہندوستانی قومیت پسند ان کی جماعت کے مطالبات جو انھوں نے پیش کئے ہیں قبول کرلیں اور اس علیحدگی کی تحریک کو روا رکھیں جس کا اظہار چند روز ہوئے جداگانہ انتخاب کے مطالبے اور اقلیتوں کے اتحاد کی صورت میں کیا گیا تھا اور جس کے متعلق مجھے مجبوراً نہایت افسوس کے ساتھ کچھ عرض کرنا پڑا تھا۔ میں نے اس تجویز کو غور سے پڑھا ہے جو پچھلی کانفرنس میں منظور ہوئی تھی۔ آپ سب لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہوں گے مگر میں اسے ایک بار پھر پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اس کے متعلق چند باتیں عرض کرنا ہیں:۔

"برطانوی تاجروں کی جماعت کی تحریک پر یہ عام اصول متفقہ طور پر منظور کیا گیا کہ اس جماعت کے لوگوں کی کوٹھیوں اور شرکتوں کے حقوق میں اور پیدائشی ہندوستانی رعایا کے حقوق میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہونا چاہیئے"

باقی حصے کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ باوجود اس کے کہ میرے دل میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کی بہت عزت ہے مجھے نہایت افسوس کے ساتھ اس غیر مشروط بیان سے اختلاف کرنا پڑا۔ کل مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ سر تیج بہادر سپرو نے خود تسلیم کیا کہ اس کے الفاظ واضح نہیں ہیں اور اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اگر آپ تجویز کے الفاظ پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کا مفہوم کس قدر وسیع ہے۔

برطانوی تاجروں کی جماعت ان کی کوٹھیوں اور شرکتوں کے حقوق میں اور پیدائشی ہندوستانیوں کے حقوق میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی ہے۔ اگر میں اس کا مطلب صحیح سمجھا ہوں تو میرے نزدیک یہ بڑی خطرناک چیز ہے اور کم سے کم میں تو ہندوستان کی آئندہ حکومت کا کیا ذکر ہے کانگریس کو بھی اس کا پابند کرنا گوارا نہ کروں گا۔

اس میں کسی قسم کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی ہے۔ برطانوی تاجروں کی جماعت کی حیثیت بالکل وہی قرار دی گئی ہے جو پیدائشی ہندوستانیوں کی۔ میرا یہ مدعا نہیں کہ نسلی تفریق یا اس قسم کے اور تعصبات جائز رکھے جائیں مگر یہاں تو برطانوی تاجروں کی جماعت کو سراسر وہی حقوق دئے جارہے ہیں، جو پیدائشی ہندوستانیوں کو۔ میں پورے زور کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں خود پیدائشی ہندوستانیوں کے درمیان حقوق کی مساوات کا اصول تسلیم نہیں کرسکتا اس کی وجوہ میں ابھی آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

مختلف طبقوں کی حالت میں توازن قائم کرنا

میرے خیال میں آپ بے تامل اس بات سے اتفاق کریں گے کہ مختلف طبقوں کی حالت میں توازن قائم رکھنے کے لئے ہندوستان کی آیندہ حکومت کو وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس سے موجودہ حکومت غافل ہے۔ یعنی ہندوستان کے فاقہ کش طبقوں کو ان لوگوں کے مقابلے میں خاص حقوق دینا پڑیں گے جنھیں قدرت نے یا خود حکومت نے مال و دولت اور دوسری مراعات عطا کر رکھی ہیں۔ ممکن ہے آیندہ حکومت کو اس کی ضرورت پیش آئے کہ مزدوروں کو بے کرایہ کے مکان رہنے کے لئے دئے جائیں۔ اس وقت مالدار ہندوستانی کہہ سکتے ہیں" اگر آپ ان لوگوں کو مکان دیتے ہیں تو ہمیں بھی دیجئے گو ہمیں ان کی ضرورت نہیں"۔ لیکن یہ حکومت کے امکان سے باہر ہوگا۔ اس صورت میں یقیناً غریبوں کے ساتھ تخصیص کرنا پڑے گی اور مالداروں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ تفریق برتی جا رہی ہے جس میں ہمارا نقصان ہے۔

اس لئے میری رائے میں ہم اراکین کانفرنس جو ملک معظم کی حکومت کو ہندوستان کا دستور اساسی بنانے میں مدد دے رہے ہیں، جہانتک ہماری مدد اس کے لئے قابل قبول ہو، یہ غیر مشروط اصول ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے۔

تفریق کا اصول

مگر اسی کے ساتھ میں برطانوی تاجروں اور یورپی کوٹھیوں کے اس جائز مطالبے کا پوری طرح موید ہوں کہ کوئی تفریق نسل کی بنا پر نہ ہو۔ میں وہ شخص ہوں جسے جنوبی افریقہ کی حکومت سے رنگ کی قید اور تفریقی قوانین کے خلاف جن کا مقصد ہندوستانیوں کو بہ حیثیت قوم کے نقصان پہنچانا تھا بیس برس تک لڑنا پڑا۔ بھلا میں کیونکر یہ جائز

رکھ سکتا ہوں کہ ان برطانوی دوستوں کے خلاف جواب ہندوستان میں موجود ہیں یا آئندہ آئیں گے اس قسم کی کوئی تفریق ہونے دوں۔ میں یہ بات کانگریس کی طرف سے بھی کہہ رہا ہوں اس کا بھی یہی خیال ہے۔

اس لئے بجائے اس کے میں ایک اور اصول تجویز کرتا ہوں جس کی خاطر مجھے جنرل سمٹس سے برسوں تک لڑنے کی عزت اور مسرت حاصل ہوئی تھی۔ ممکن ہے اس میں ترمیم کی ضرورت ہو اس وقت میں اسے محض اس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ یہ کمیٹی اور خصوصاً میرے یورپی دوست اس پر غور کریں۔ کوئی شخص جو جائز طریقے سے ہندوستان میں مقیم ہو یا باہر سے آئے اس کے خلاف کوئی ایسی قید صرف (صرف کے لفظ پر زور ہے) نسل یا رنگ یا مذہب کی بنا پر نہیں لگائی جائے گی جو پیدائشی ہندوستانی رعایا پر عائد نہ ہوتی ہو۔ میرے خیال میں یہ اصول سب کے لئے قابل اطمینان ہے۔ کوئی حکومت اس سے آگے نہیں جاسکتی۔ اس کے مفہوم سے وہ پہلو نہیں نکلتے جو، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، لارڈ ریڈنگ نے پچھلے سال کی تجویز سے نکالے تھے۔ اس اصول کی رو سے کسی ایک برطانوی بلکہ کسی ایک یورپی کے خلاف بھی محض برطانوی یا یورپی ہونے کی وجہ سے تفریق نہیں برتی جاسکے گی۔ میں یہاں برطانویوں یا دوسرے یورپیوں یا امریکیوں یا جاپانیوں میں مطلق فرق نہیں کرنا چاہتا۔ میں برطانوی نو آبادیوں یا مقبوضات کی تقلید نہیں، کرنا چاہتا جنھوں نے میری ناچیز رائے میں ایسے قوانین بنا کر جو سراسر رنگ اور نسل کے امتیاز پر مبنی ہیں، اپنی بیاض قوانین پر دھبّا لگایا ہے۔

اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو میرے خیال میں دنیا کو کچھ اور ہی سبق دے گا اور اس کے سامنے کچھ اور ہی مثال پیش کرے گا میں یہ نہیں چاہتا

کہ ہندوستان ساری دنیا سے بے تعلق ہو کر ایک چار دیواری میں محصور ہو جائے اور کسی کو اپنی سرحد میں داخل نہ ہونے دے یا اپنے یہاں تجارت نہ کرنے دے۔ لیکن اسی کے ساتھ میرے ذہن میں بہت سی تجویزیں ہیں جو مختلف طبقوں کی حالت میں توازن قائم کرنے کیلئے عمل میں لانا پڑیں گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ سالہا سال تک ہندوستان ایسے قوانین بنانے میں مصروف رہے گا جن کے ذریعے سے مظلوم اور بے بس لوگ اس قعر مذلت سے نکل سکیں، جس میں انھیں سرمایہ داروں نے، زمینداروں نے، نام نہاد "اونچے طبقے" والوں نے اور اس کے بعد نہایت باقاعدہ طریقے سے برطانوی حکمرانوں نے ڈھکیلا ہے۔ اگر ہم انھیں اس گڑھے سے نکالنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کی قومی حکومت کا فرض ہوگا کہ اپنا گھر سنبھالنے کے لئے ان کے ساتھ برابر خاص رعایتیں کرتی رہے بلکہ ان کے سر سے وہ بوجھ جو انھیں کچلے ڈالتا ہے بالکل اتار دے۔ اور اگر یہ تعلقہ دار، زمیندار، دولتمند لوگ اور وہ سب کے سب جنھیں آج خاص مراعات حاصل ہیں۔ چاہے وہ یورپی ہوں چاہے ہندوستانی۔ اپنے خلاف تفریق کا برتاؤ ہونے کی شکایت کریں گے تو مجھے ان سے ہمدردی ہوگی۔ لیکن میں ان کی مدد کر بھی سکوں تو نہیں کروں گا کیونکہ میں تو خود ان کی امداد اس کام میں چاہوں گا اور بغیر ان کی امداد کے ان غریبوں کو پستی سے ابھارنا ممکن بھی نہ ہوگا۔

اچھوت ذرا اچھوتوں کی حالت پر غور کیجئے۔ فرض کیجئے قانون ان کی مدد کرے اور انھیں آراضی عطا کر دے۔ آج کل ان کے پاس چپہ بھر زمین بھی نہیں۔ نام نہاد اونچی ذاتیں اور خود سرکار اُن کے ساتھ جو چاہتی ہے کرتی ہے وہ بالکل بے بس ہیں۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹا دئے جاتے ہیں اودھم

نہیں مار سکتے۔ بلکہ قانون سے مدد مانگیں تو نہیں مل سکتی۔ آئندہ مجلس وضع قوانین کا پہلا کام یہ ہوگا کہ توازن پیدا کرنے کے لئے ان لوگوں کو فیاضی سے امدادی رقم عطا کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ امدادی رقمیں کہاں سے آئیں گی؟ اللہ میاں کی جیب سے تو آنے سے رہیں۔ اللہ میاں سرکار کی خاطر ہُن نہیں برسایا کرتے ظاہر ہے کہ یہ رقمیں مالدار لوگوں سے لی جائیں گی جن میں یورپی بھی شامل ہوں گے۔ کیا وہ اسے بھی تفریق کہیں گے؟ یہ تو وہ خود سمجھ جائیں گے کہ اگر یہ ان کے خلاف تفریق بھی ہے تو یورپی ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے پاس روپیہ ہے اور دوسروں کے پاس نہیں۔ یہ جنگ زرداروں اور بے زروں کی ہوگی۔ اگر لوگ اسی سے ڈرتے ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ قومی حکومت اس طرح کبھی قائم نہیں ہوسکتی کہ دولتمند طبقے بے زبان غریبوں کے سر پر پستول لیکر کھڑے ہوجائیں اور کہیں: "تمہیں سوراج اس وقت تک نہیں ملیگا جب تک تم ہماری املاک اور ہمارے حقوق کی حفاظت کا اقرار نہ کرلو"۔

میں نے اپنے نزدیک کانگریس کے خیال کو اور اپنے تجویز کئے ہوئے اصول کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کردیا ہے۔ لوگوں کو ہرگز اس شکایت کا موقع نہیں ملے گا کہ ان کے خلاف اس بنا پر تفریق برتی گئی کہ وہ انگریز یا یورپی یا جاپانی یا کسی اور نسل سے ہیں۔ بنائے تفریق ان کے لئے بھی وہی ہوگی جو پیدائشی ہندوستانی رعایا کے لئے ہوگی۔

ایک اور تجویز میں ایک اور تجویز بھی پیش کرتا ہوں۔ یہ بڑی جلدی میں لکھی گئی ہے کیونکہ میں نے اس کا مسودہ یہیں بیٹھ کر لارڈ ریڈنگ اور سر تیج بہادر سپرو کی تقریر سننے کے دوران میں بنایا ہے۔ اس کا

تعلق موجودہ حقوق سے ہے۔ برکسی موجودہ حق میں جو جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور قوم کے عام حقیقی مفاد کے خلاف نہ ہو مداخلت نہیں کی جائے گی بجز اس کے کہ یہ مداخلت اس قانون کے مطابق ہو جو اس قسم کے حقوق پر عائد ہوتا ہے۔"

یہاں میرے پیش نظر یقیناً وہ چیز ہے جو آپ کو کانگریس کے ریزولیوشن میں اس مسئلے کے متعلق نظر آئی تھی کہ آئندہ حکومت برطانوی حکومت کی موجودہ ذمّہ داریوں کو کس حد تک قبول کرے گی۔ جس طرح ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ پہلے ان ذمّہ داریوں کی جانچ ایک غیر جانب دار عدالت کرے تب یہ ہماری طرف منتقل ہوں اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو موجودہ حقوق کی بھی عدالتی تحقیقات کر لی جائے۔ یہاں ذمہ داریوں سے انکار کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس کا ہے کہ انھیں اچھی طرح جانچ پڑتال، چھان بین کرنے کے بعد قبول کریں۔ ہم میں بعض لوگوں نے جو یہاں موجود ہیں یورپیوں کے مخصوص حقوق اور مراعات کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور یورپیوں پر کیا موقوف ہے بہت سے ہندوستانی بھی ہیں (ان میں سے کئی کے نام میرے ذہن میں ہیں) جن کے قبضے میں آج وہ زمین ہے جو انھیں قریب قریب مفت دیدی گئی ہے اور یہ قومی خدمت تو کیا حکومت کی خدمت کے صلے میں بھی نہیں، کیونکہ حکومت کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ کسی حاکم کی خدمت کے انعام میں۔ اب اگر آپ مجھ سے کہیں کہ ان حقوق و مراعات کی ریاست جانچ نہ کرے تو میں آپ سے پھر عرض کروں گا کہ اس صورت میں ان غریبوں، بے نواؤں کے فائدے کا لحاظ رکھ کر جو اپنے حقوق سے محروم کر دئے گئے ہیں حکومت کا چلانا ناممکن ہے۔ اسی لئے میں نے اپنی تجویز میں یورپیوں کا نام نہیں لیا۔ اس

دوسری تجویز کا اطلاق بھی یورپیوں کی طرح ہندوستانیوں پہ مثلاً سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اور سر فیروز سیٹھنا پر ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ان حضرات کو حکام وقت کی خدمت کے صلے میں مراعات حاصل ہوئی ہیں مثلاً چند میل اراضی عطا کردی گئی ہے تو اگر میرے ہاتھ میں حکومت ہوئی میں فوراً انھیں بے دخل کردوں گا۔ میں ہندوستانی ہونے کے سبب سے ان کی رعایت نہیں کروں گا۔ اسی طرح میں سر ہیوبرٹ کار یا مسٹر بینتھال کو بھی بے تامل بے دخل کردوں گا بلا لحاظ اس کے کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں اور مجھ سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ قانون اشخاص کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کرے گا۔ اس کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ مذکورۂ بالا تجویز میں ان الفاظ "جو جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو" میری مراد یہی ہے کہ ہر حق بے لاگ ہو، شک اور شبہہ سے پاک ہو۔ اس لئے جب یہ معاملات آئندہ حکومت کے سامنے آئیں گے تو ہم ان کی چھان بین کریں گے۔

اس کے بعد یہ الفاظ ہیں "قوم کے حقیقی مفاد کے خلاف نہ ہو" میرے پیش نظر بعض ایسے حقوق اور اجارے ہیں جو حاصل تو جائز طریقے سے کئے گئے ہیں، لیکن ان کا دیا جانا قوم کے حقیقی مفاد کے منافی ہے۔ میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں آپ کو اس پہ ہنسی آئے گی۔ مگر بات بالکل ٹھیک ہے۔ ذرا اس سفید ہاتھی[1] پر غور کیجئے جسے نئی دلی کہتے ہیں۔ کروڑوں روپیہ اس پر صرف کردیا گیا ہے۔ فرض کیجئے آئندہ یہ حکومت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جب یہ سفید ہاتھی ہمارے سر پڑ ہی گیا ہے تو اس سے کچھ کام لینا چاہیئے۔ اب اگر پرانی دہلی میں طاعون

---

[1] انگریزی محاورے میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے بے حد مصارف برداشت کرنا پڑیں۔

یا ہیضہ پھیلے اور ہمیں ہسپتالوں کی ضرورت ہو تو ہم کیا کریں گے ؟ کیا آپ کے خیال میں قومی حکومت ہسپتال بنائے گی ؟ جی نہیں ۔ ہم ان عمارتوں کو لے کر ان میں طاعون کے مریضوں کو رکھیں گے اور ان سے ہسپتال کا کام لیں گے کیونکہ میرے نزدیک یہ عمارتیں قوم کے حقیقی مفاد کے خلاف بنائی گئی ہیں۔ یہ ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کے گوں کی نہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ دولتمندوں کے مناسب حال ہوں جیسے نواب صاحب بھوپال یا سر پرشوتم داس ٹھاکر داس یا سر فیروز سیٹھنا یا سر تیج بہادر سپرو ہیں مگر ان لوگوں کے مناسب حال نہیں جنھیں سونے کو جگہ اور کھانے کو روٹی بھی میسّر نہیں۔ اگر قومی حکومت اس نتیجہ پر پہونچی کہ یہ عمارتیں غیر ضروری ہیں تو خواہ ان کے مالک کوئی ہوں بے دخل کر دیئے جائیں گے اور وہ بھی بغیر معاوضہ کے کیونکہ اگر آپ اس حکومت سے معاوضہ چاہیں تو اسے ایک کی جیب بھرنے کے لئے دوسرے کی جیب کاٹنا پڑے گی اور یہ ناممکن بات ہے ۔

اگر وہ حکومت جو کانگریس کے تصور میں ہے قائم ہوئی تو یہ تلخ گھونٹ پینا ہی پڑے گا ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہاں سے کوئی چیز حاصل کرنے کے لئے میں آپ کو جھوٹا اطمینان دلا دوں کہ ہر طرح خیریت رہے گی ۔ میں کانگریس کی طرف سے سارے منصوبے ظاہر کئے دیتا ہوں ۔ مجھے ذرا سی بات بھی چھپانا منظور نہیں ۔ اس کے بعد اگر کانگریس کے خیالات قابل قبول ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے ۔ لیکن اگر یہ خیالات قابل قبول نہ ہوں ، اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں آپ کے دلوں پر اثر نہیں ڈال سکا اور آپ کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا تو کانگریس کو کچھ دن اور راہ طلب میں بھٹکنا ہوگا ، کچھ دن اور تبلیغ کا کام کرنا ہوگا یہاں تک کہ آپ سب اس کے عقیدے کو اختیار کر لیں ۔ اور

ہندوستان کے کروروں غریبوں کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیں کہ خدا خدا کرکے انھیں قومی حکومت نصیب ہوئی۔

فوجداری کے مقدمے | اب تک کسی شخص نے ان دو سطروں سے متعلق جو اس ریزولیوشن کے آخر میں ہیں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے وہ سطریں یہ ہیں:- "باتفاق رائے یہ منظور ہوا کہ ہندوستان میں یورپی فرقے کو مقدمات فوجداری کے متعلق جو حقوق حاصل ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔"

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس کے سب پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہے۔ چند روز سے میں سر ہیوبرٹ کار سٹر بینتھال اور چند دوستوں سے اپنے طور پر دوستانہ گفتگو کر رہا ہوں۔ ان سے اسی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی میں نے پوچھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں۔ انھوں نے کہا یہ وہ حق ہے جو دوسرے فرقوں کو بھی حاصل ہے۔ میں اس کا مطلب دریافت نہیں کر سکا۔ غالباً اس سے مراد یہ تھی کہ دوسرے فرقے بھی اپنے ہی فرقے کی جوری کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اس کا اشارہ تحقیقات بذریعہ جوری کی طرف ہے افسوس ہے کہ میں اس اصول کی حمایت ہرگز نہیں کر سکتا۔

میں اس قسم کے خصوصی حقوق کا کسی صورت سے حامی نہیں ہوں۔ میرے خیال میں قومی حکومت اس قسم کی پابندیوں کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ ان تمام فرقوں کو جو کل ہندوستانی قوم بننا چاہتے ہیں آج باہمی اعتماد کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیئے ورنہ یہ خیال ہی ترک کر دینا چاہیئے۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ تمہیں ذمہ دارانہ حکومت ہرگز نہیں مل سکتی تو یہ ایسی بات ہے جو سمجھ میں آسکتی ہے۔ مگر ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حکومت ہوگی لیکن ان خصوصی حقوق اور

تحفظات کے ساتھ یہ تو نہ آزادی ہوئی نہ ذمہ دارانہ حکومت بلکہ اول سے آخر تک تحفظات ہی تحفظات ہوئے۔ یہ تحفظات حکومت کو ہڑپ کر جائیں گے۔ اگر یہ سب تحفظات منظور کر لئے گئے اور جو جو باتیں یہاں ہو رہی ہیں سب نے عملی شکل اختیار کر لی تو جو چیز ہمیں ذمہ دارانہ حکومت کے نام سے دی جائے گی وہ قریب قریب ایسی حکومت ہو گی جیسی قیدیوں کو جیل خانے میں ملتی ہے۔ انھیں بھی کوٹھری کا دروازہ بند ہونے اور جیلر کے چلے جانے کے بعد کامل آزادی ہوتی ہے۔ اس ۱۰ فٹ مربع یا ۳×۷ فٹ کی کوٹھری کے اندر قیدی کامل آزادی رکھتے ہیں۔ مجھے ایسی کامل آزادی نہیں چاہیئے جس میں جیلر مزے میں اپنے سارے حقوق کا تحفظ کر لیں۔

اس لئے میں اپنے یورپی دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی تجویز واپس لے لیں اور جسارت سے کام لے کر انھیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ ان دو تجویزوں کو جو میں نے پیش کی ہیں قبول کر لیں۔ آپ حضرات ان میں جو کچھ کاٹ چھانٹ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ اگر ان کے الفاظ قابل اطمینان نہیں تو آپ شوق سے اور الفاظ تجویز کر دیجئے۔ یہ ایک منفی اصول ہے جس میں آپ کے لئے کوئی بے جا قید نہیں ہے۔ مگر بے ادبی معاف۔ اس دائرے کے باہر آپ کوئی مزید مطالبہ پیش نہیں کر سکتے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ کو خود پیش کرنے کی ہمت نہ ہو گی۔ یہ ہے میرا خیال موجودہ حقوق اور آئندہ تجارت کے متعلق۔

بنیادی صنعتیں

مجھے ان خیالات سے حرف بہ حرف اتفاق ہے جو مسٹر جیکر نے بنیادی صنعتوں کے متعلق اپنی تقریر میں ظاہر کئے ہیں۔ کانگریس کا خیال یہ ہے کہ اگر حکومت نے بنیادی صنعتوں پر قبضہ نہ کیا

تو کم سے کم ان کے نظم و نسق اور ان کی نشوونما میں اسے بہت کچھ دخل ہو گا۔

ہندوستان جیسے غریب غیر ترقی یافتہ ملک کا اندازہ انگلستان کے معیار سے نہیں کرنا چاہیئے جو ایک انتہائی ترقی یافتہ جزیرہ ہے اور جس میں افراد کے حقوق پر بے حد زور دیا جاتا ہے۔ جو چیز انگلستان کے لئے اچھی ہے، وہ میرے خیال میں بہت سی صورتوں میں ہندوستان کے لئے زہر ہے۔ ہندوستان کو ایک علیحدہ معاشیات اور علیحدہ پالیسی کی ضرورت ہے اور اپنی صنعتوں اور دوسری چیزوں کے انتظام کے لئے ایک مخصوص طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ بنیادی صنعتوں کے معاملے میں نہ صرف برطانیہ بلکہ اور بہت سے لوگوں کو شکایت ہو گی کہ ہمارے ساتھ بے انصافی برتی جا رہی ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس انصاف کے کیا معنی ہیں جس سے کسی ریاست کو نقصان پہنچے۔

ساحلی جہاز رانی

اَب رہی ساحلی جہاز رانی۔ تو بے شک کانگریس کو اس خواہش سے بہت ہمدردی ہے کہ اس کاروبار کو ترقی دی جائے۔ لیکن اگر ساحلی جہاز رانی کے مسودہ قانون میں یوریپیوں کے خلاف بہ حیثیت یوریپیوں کے کسی قسم کی تفریق برتی گئی تو میں ان کا ساتھ دوں گا اور اس تجویز کے خلاف لڑوں گا جو انگریزوں کو محض انگریز ہونے کے جرم میں ان فوائد سے محروم کرتی ہے جو دوسروں کو حاصل ہیں لیکن ذرا ان ہم غرض جماعتوں پر بھی نظر ڈالئے جن کے قبضہ میں یہ تجارت ہے۔ میں نے اکثر بنگال کے دریاؤں میں سفر کیا ہے اور بہت دن ہوئے اراودی میں بھی کیا تھا۔ مجھے اس کاروبار سے تھوڑی سی واقفیت ہے طرح طرح

کی رعایتوں اور خاص حقوق کے ذریعے سے بڑی بڑی جماعتوں نے صنعتیں جاری کر رکھی ہیں، شرکتیں قائم کی ہیں اور اتنا زبردست کاروبار پھیلایا ہے کہ کسی کو مقابلے کی مجال نہیں۔

آپ میں سے کچھ لوگوں نے اس نئی شرکت کا حال سنا ہوگا جو چٹاگام اور رنگون کے درمیان جہازرانی کرتی ہے۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹر چند مسلمان ہیں جو بیچارے بڑی مشکل سے کام چلا رہے ہیں انھوں نے رنگون میں مجھ سے مل کر پوچھا کہ آپ ہمارے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ میرا دل ان کے لئے بہت دکھا۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر کرنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اس کے مقابلہ میں زبردست برٹش انڈیا نیویگیشن کمپنی ہے جو اس سے کم کرایہ لیکر اسے بٹھانے کی کوشش کر رہی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ مسافروں کو قریب قریب مفت لے جاتی ہے۔ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں۔ یہ جو کچھ کرتی ہے وہ اس لئے نہیں کہ برطانوی کمپنی ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی کمپنی ہوتی جس نے اس کاروبار کو غصب کر لیا ہوتا تو وہ بھی یہی کرتی۔

فرض کیجئے کوئی ہندوستانی کمپنی اصل کو ملک سے باہر لے جاتی ہے جس طرح آج کل بعض ہندوستانی اپنا سرمایہ ہندوستان میں لگانے کے بجائے دوسرے ملکوں میں لگاتے ہیں یا ایک بہت بڑی تاجروں کی جماعت اپنے سارے منافع کو دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں منتقل کر دیتی ہے اس خوف سے کہ قومی حکومت صحیح پالیسی اختیار نہیں کرے گی اس لئے اپنا روپیہ محفوظ رکھنے کے لئے ملک سے باہر لے جانا چاہیئے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ذرا دیر کے لئے یہ مان لیجئے کہ اس شرکت کے ہندوستانی ڈائرکٹر نہایت مکمل اور با اصول تنظیم کی غرض سے یورپ کے بہترین قابل آدمیوں کو لے آئیں اور چھوٹی موٹی کمپنیوں کو نہ پنپنے

دیں تو میرے نزدیک حکومت کو یقیناً اس معاملے میں دخل دینا چاہیئے اور چاٹگام کمپنی جیسی شرکتوں کے تحفظ کے لئے قانون بنانا چاہیئے۔

بعض لوگوں کو اراد دی ہیں جہاز چلانے کی اجازت تک نہ مل سکی انھوں نے مجھے واقعات کے حوالے سے یہ یقین دلایا کہ انھیں بالکل اس کا موقع نہیں دیا گیا۔ انھیں اجازت نامے تک نہیں ملے، وہ معمولی سہولتیں تک نصیب نہیں ہوئیں جن کا قانوناً ہر شخص کو حق ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ روپیہ میں کتنی قوت ہے، ذاتی اثر سے کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور جب بقول سرجان گرسٹ کے بڑوں پودوں کی قوت اتنی بڑھ جائے کہ چھوٹے پودے پنپ ہی نہ سکیں تو ان اونچے پودوں کو چھانٹنے کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ حقیقت میں ساحلی تجارت کی یہی حالت ہے اس کے متعلق جو مسودہ قانون پیش ہوا تھا ممکن ہے اس کے الفاظ ٹھیک نہ ہوں۔ لیکن میرے نزدیک اس کا نفس مضمون بالکل صحیح ہے۔

شہری کی تعریف معین کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں اس وقت فوراً یہ نہیں بتا سکتا کہ اس بارے میں کانگریس کس بات کو پسند کرے گی یا خود میری کیا رائے ہوگی۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں مجھے سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے دوستوں سے مشورہ کرکے یہ سمجھنا ہے کہ ان کا کیا منشا ہے کیونکہ سچ پوچھیے تو اس بحث کو سن کر میں بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا۔ میں نے کانگریس کا خیال بالکل واضح کر دیا ہے کہ ہم نسلی تفریق نہیں چاہتے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسی وقت قطعی طور پر فیصلہ کر دوں کہ کانگریس کی رائے لفظ "شہری" کی تعریف کے متعلق کیا ہے۔ اس لئے مجھے اس بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اس لفظ کی تعریف کے متعلق اپنی رائے میں فی الحال محفوظ رکھتا ہوں۔

اس کے متعلق ایک بات اور کہہ کر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں میرے خیال میں ایسی تعریف معین کرنا ناممکن نہیں جس سے ہمارے یورپی دوستوں کو اطمینان ہو جائے۔ اس کے متعلق جو گفت و شنید ہو رہی تھی اور جس میں مجھے بھی شرکت کا فخر حاصل تھا، بدستور جاری رہنا چاہیئے۔ اگر اس کمیٹی میں میری موجودگی کی ضرورت ہوگی تو میں شرکت کے لئے حاضر ہوں۔ مناسب یہ ہے کہ اس میں ذرا توسیع کر دی جائے اور اس کی شکل اس قدر باضابطہ نہ رہے۔

میں پھر وہی بات کہتا ہوں جو کہہ چکا ہوں کہ میرے خیال میں کوئی مفصل تجویز دستور اساسی کے اندر شامل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے اندر تو کوئی اس قسم کا فقرہ ہو سکتا ہے جو تمام حقوق پر حاوی ہو۔

قانونی چارہ جوئی ان معاملات میں ہم یہ نہیں چاہتے کہ انتظامی کارروائی ہوا کرے۔ میں اپنا خیال وفاقی عدالت اور عدالت علیا کے ذکر کے سلسلے میں ظاہر کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک عدالت وفاقی عدالت علیا ہے یعنی وہ عدالت جس کے فیصلے کا اپیل نہ ہو۔ یہی میرے لئے پریوی کونسل ہے۔ یہی آزادی کا مندر ہے۔ یہ وہ عدالت ہے جہاں ہر مظلوم داد طلب کر سکتا ہے۔ مجھ سے ٹرانسوال میں ایک قانون داں نے (ٹرانسوال اور عموماً جنوبی افریقہ میں بڑے بڑے قانون داں گذرے ہیں) ایک مشکل مقدمے کے متعلق کہا تھا "ممکن ہے کہ اس وقت اس میں کوئی امید نہ ہو مگر میں ہمیشہ سے اس اصول کا قائل ہوں ورنہ کبھی وکالت کا پیشہ اختیار نہ کرتا۔ قانون ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کوئی حق تلفی ایسی نہیں جس کی چارہ جوئی عدالت قانونی میں نہ ہو سکتی ہو اور اگر جج یہ کہیں کہ چارہ جوئی ممکن نہیں تو وہ اس قابل ہیں کہ فوراً

برطرف کردئے جائیں"۔ یہی بات میں جناب لارڈ چانسلر بہ کمال ادب آپ سے عرض کرتا ہوں۔

میرے یورپی دوست اطمینان رکھیں وہ عدالت وفاقی سے کبھی اس طرح خالی ہاتھ نہیں پھریں گے جس طرح ہم اس کانفرنس سے خالی ہاتھ جانے والے ہیں۔ اگر ہم پر ان وزیروں کی نظر عنایت نہ ہوئی جو آج کل ملک معظم کے مشیر ہیں۔ مجھے اب تک امید ہے کہ ہم انھیں اپنی طرف متوجہ کرلیں گے۔ اور ان کے اعلٰے جذبات پر اثر ڈالنے میں کامیاب ہوں گے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم کچھ لے کر جائیں گے۔ مگر چاہے ہم کچھ لے کر جائیں یا خالی ہاتھ جائیں میری دعا یہ ہے کہ جب وہ وفاقی عدالت جس کی مجھے آرزو ہے قائم ہو تو یورپیوں کو اور سب اقلیتوں کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اس عدالت سے انھیں مایوسی نہ ہوگی چاہے مجھ جیسے ضعیف و حقیر شخص سے مایوس بھی ہونا پڑے۔

تقریر کے بعد یہ بحث ہوئی:۔

سر تیج بہادر سپرو۔ کیا مہاتما گاندھی کی یہ تجویز ہے کہ آئندہ قومی حکومت ہر شخص کے حق ملکیت کی جانچ کرے اگر ایسا ہے تو یہ حق جس کی جانچ کی جائیگی کسی میعاد کے اندر محدود ہوگا یا نہیں؟ وہ اس حق کے جانچنے کے لئے کس قسم کا ادارہ قائم کریں گے؟ وہ کوئی معاوضہ بھی دینا چاہتے ہیں یا ان کا یہ منشا ہے کہ قومی حکومت ہر ملک کو جو ان کے نزدیک یا اکثریت کے نزدیک ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہے بے تکلف ضبط کرلے؟

گاندھی جی۔ جہاں تک میں نے اس پر غور کیا ہے یہ منشا نہیں ہے کہ یہ کارروائی انتظامی محکمے کے ذریعے سے ہو بلکہ جو کچھ ہوگا انصاف کی رو سے ہوگا۔ اس کے لئے قانونی اداروں سے کام لیا جائے گا۔

سر تیج بہادر سپرو۔ وہ قانونی ادارے کون سے ہوں گے ؟

گاندھی جی۔ میں نے ابھی تک اس کارروائی کی حدود پر غور نہیں کیا ہے میرے خیال میں ناانصافی کی پاداش کے لئے حدود کی ضرورت ہی نہیں۔

سر تیج بہادر سپرو۔ تو کیا آپ کی قومی حکومت میں ہندوستان میں کسی کا حق مداخلت سے محفوظ نہیں رہے گا ؟

گاندھی جی۔ قومی حکومت میں ان باتوں کا فیصلہ عدالت کرے گی اور اگر لوگوں کے دل میں ضرورت سے زیادہ اندیشہ ہو تو ان کا ہر جائز اندیشہ دور کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ عام طور پر اس اصول کو جس کا میں نے ذکر کیا اختیار کر لینا چاہئے۔ جب کبھی کسی ملک کے جائز حقوق کے متعلق شکایت ہو تو عدالت ان حقوق کی جانچ کرنے کی مجاز ہو گی۔ میں یہ وعدہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اگر آج میرے ہاتھ میں حکومت آجائے تو سرے سے کسی شخص کے حق ملکیت کی جانچ نہیں کروں گا۔

(۹)

مالیات

جناب لارڈ صاحب[1]، میں نے مالی تحفظات کے متعلق آپ کی تقریر کو بہت غور سے اور ادب سے سنا جس کے آپ یقیناً مستحق ہیں۔ اس تقریر کے سلسلے میں میں نے پچھلے سال کی اساسی وفاقی کمیٹی[2] کی رپورٹ کے ان دفعات (۱۸۔۱۹۔۲۰) کو بھی پڑھا جو مالیات کے متعلق ہیں اور میں افسوس کے ساتھ اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھے ان قیود سے اتفاق نہیں ہے جو دفعات مذکورہ میں تجویز کی گئی ہیں۔ میرے لئے اور ہم سب کے لئے بہت بڑی دقت یہ ہے کہ ہمیں یہ بھی اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہماری مالی ذمہ داریاں کیا ہوں گی۔

مالی ذمہ داریوں کی جانچ مجھے اجازت ہو کہ میں اپنا مطلب اچھی طرح سمجھا دوں۔ فرض کیجئے کہ فوج مد محفوظہ[3] قرار دی جائے تو اس صورت میں مالیات کے متعلق میرا نقطہ نظر اور ہوگا اور فوج مد منتقلہ[4] ہو تو کچھ اور ہوگا۔ ایک اور دقت مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے میں یہ ہے کہ کانگریس اس بات پر بہت زور دیتی ہے کہ آئندہ حکومت جتنی مالی ذمہ داریاں قبول کرے ان کی پڑتال ہو اور غیر جانبداری سے جانچ کی جائے۔

---

[1] لارڈ ریڈنگ سے خطاب ہے۔

[2] Federal Structure Committee

[3] reserved subject

[4] transferred subject

میرے ہاتھ میں ایک رپورٹ ہے جو چار غیر جانبدار اشخاص نے تیار کی ہے جن میں سے دو بمبئی ہائی کورٹ کے سابق مشیر اعلیٰ (ایڈوکیٹ جنرل) ہیں یعنی بہادر جی ڈیسائی اور بھولا بھائی ڈیسائی صاحبان۔ کمیٹی کے تیسرے رکن پروفیسر شاہ ہیں جو عرصہ تک بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ ان کا نام تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اور انھوں نے ہندوستان کی معاشیات پر بہت قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ چوتھے ممبر کمار اپا صاحب ہیں جنھوں نے یورپ سے ڈگریاں حاصل کی ہیں اور جن کی رائے مالیات کے متعلق سند مانی جاتی ہے۔ ان چار صاحبوں نے مفصل رپورٹ لکھی ہے اور وہ بات جو میں کہتا ہوں پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ ان ذمّہ داریوں کی غیر جانب داری سے جانچ کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ بہت سی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو حقیقت میں، ہندوستان پر عائد نہیں ہوتیں۔

میں اس سلسلے میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کانگریس کی طرف جو قول شرارت سے منسوب کیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ کانگریس نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ وہ قومی قرضے میں سے ایک دھیلا بھی ادا کرنے سے انکار کرے گی۔ البتّہ یہ ضرور کہا ہے کہ بعض ذمّہ داریاں جو ہندوستان کے ذمّے فرض کر لی گئی ہیں خواہ مخواہ اس کے سر نہیں مڑھنا چاہیئے بلکہ انگلستان پر لازم ہے کہ انھیں اپنے ذمّے لے لے۔ آپ کو اس رپورٹ میں ان ذمّہ داریوں کی باضابطہ جانچ نظر آئے گی۔ میں ان کا ذکر کر کے کمیٹی کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ جو حضرات ان دونوں جلسوں کا مطالعہ کرنا چاہیں (اور مجھے یقین ہے کہ ان کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا) شوق سے کر سکتے ہیں۔ ان پر غالباً یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان میں سے بعض ذمّہ داریوں کو ہندوستان

کے سر مڑھنا سراسر بے جا تھا۔ ایسی صورت میں اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ حکومت
کا نظام کیا ہوگا تو شاید ہم کوئی قطعی رائے دے سکتے۔ لیکن میرے نزدیک
اس میں یہ شرط ضرور ہوتی کہ ان نام نہاد تحفظات سے جن کا ذکر اساسی وفاقی
کمیٹی کی اس رپورٹ کے دفعات ۱۸، ۱۹ اور ۲۰ میں ہے۔ ہندوستان کی
ترقی میں مدد ملنے کے بجائے ہر ہر قدم پر رکاوٹ پیش آئے گی۔

ہندوستان کا مفاد

آپ نے، جناب لارڈ صاحب، ارشاد فرمایا تھا کہ آپ کے سامنے ہندوستانی وزراء پر اعتماد
کرنے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ آپ کو پوری امید ہے کہ ہندوستانی وزراء اور
ملکوں کے وزیروں سے کم نہیں رہیں گے۔ البتہ آپ کو یہ فکر ہے کہ
ہندوستان کی ساکھ اس کی سرحد کے باہر قائم رہے۔ بقول آپ کے روپیہ
لگانے والے جو اپنا روپیہ ہندوستان میں لا کر معقول شرح سود پر لگائیں گے،
انھیں اس وقت تک اطمینان نہیں ہوگا جب تک اس قسم کے تحفظات
جیسے یہاں تجویز کئے گئے ہیں موجود نہ ہوں گے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا
کہ جب انگلستان کا روپیہ ہندوستان میں لگایا جائے یا وہاں باہر سے
روپیہ آئے تو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس میں ہندوستان کا فائدہ نہیں ہے۔
اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو آپ کے الفاظ یہ تھے "ظاہر ہے کہ اس
میں ہندوستان کا فائدہ ہے۔" مجھے تو یہ انتظار رہا کہ آپ کچھ مثالیں پیش
کریں گے مگر آپ نے یقیناً یہ سمجھا کہ ہم ان چیزوں کو یا ان مثالوں کو جو آپ
کے ذہن میں ہیں خود ہی سمجھ جائیں گے۔ سچ پوچھئے تو جب آپ تقریر
کر رہے تھے۔ مجھے اس کے برعکس مثالیں یاد آرہی تھیں اور میں اپنے دل
میں کہہ رہا تھا کہ مجھے خود ایسے واقعات کا تجربہ ہے جن میں ہندوستان اور

برطانیہ عظمیٰ کا مفاد متحد نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ اس لئے ہم یہ کسی طرح نہیں کہہ سکتے کہ جب کبھی برطانیہ سے قرضہ لیا جائے تو اس میں ہندوستان کا فائدہ ہے۔

مثال کے لئے ان سب لڑائیوں پر غور کیجئے جیسے افغانستان کی جنگیں۔ جوانی میں میں نے بڑے شوق سے سر جان کے کی تاریخ جنگہائے افغانستان پڑھی تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان میں سے اکثر لڑائیاں ہندوستان کے فائدے کے لئے نہیں لڑی گئیں اور صرف یہی نہیں بلکہ گورنر جنرل نے ان میں بڑی فاش غلطیاں کیں۔ دادا بھائی نوروجی آنجہانی نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی مالیات کی تاریخ یا تو ہندوستان کو لوٹنے کی مثالوں سے یا گڑبڑ اور غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔

شرح مبادلہ

لارڈ چانسلر صاحب نے ہمیں متنبہ کیا ہے اور آپ نے ان کے انتباہ کی تائید فرمائی ہے کہ مالیات کا مسئلہ آج کل بہت نازک ہے اس لئے ہم میں سے جو لوگ اس بحث میں شریک ہوں انہیں بہت احتیاط کرنا چاہیئے کہ بحث کا غلط طریقہ نہ اختیار کریں اور ہندوستان کے وزیر مال کی موجودہ مشکلات میں اور اضافہ نہ کر دیں۔ اس لئے میں جزویات کا ذکر نہیں چھیڑوں گا۔ لیکن شرح مبادلہ کے اضافے کے متعلق ایک بات میں سے کہے نہیں رہ سکتا۔ میرا اشارہ روپے کی شرح کو بجائے ایک شلنگ چار پنس کے ایک شلنگ چھ پنس کرنے کی طرف ہے۔ یہ کارروائی تقریباً سارے ہندوستانیوں کی مخالفت کے باوجود کی گئی جن میں وہ ہندوستانی بھی تھے، جنھیں کانگریس سے کوئی تعلق نہیں یہ سب آزاد رائے رکھنے والے لوگ تھے اور ان میں بعض مالیات کے ماہر بھی تھے جو معاملے کو بہت اچھی طرح سمجھ کر

رائے دے رہے تھے۔ یہاں بھی نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے مفاد پر غیر ملک کا مفاد مقدم رکھا گیا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ماہر فن ہونے کی ضرورت نہیں کہ روپئے کی شرح گھٹنے میں عموماً کاشتکاروں کا فائدہ ہے مجھ پر اس ملک (انگلستان) کے دو ساہوکاروں کے اس اعتراف کا بہت اثر ہوا کہ اگر روپیہ پاؤنڈ کے ساتھ نتھی کئے جانے کے بجائے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کم سے کم اس وقت کاشتکاروں کو بہت فائدہ ہوتا۔ انھوں نے اس انتہائی صورت حال پر بھی غور کیا کہ اگر روپیہ اپنے حال پر چھوڑ دئے جانے کے بعد اپنی اصلی قیمت یعنی چھ پنس یا سات پنس تک پہنچ جاتا تو ہندوستان کے لئے بڑی سخت مصیبت کا سامنا ہوتا۔ مگر مجھے تو اس میں بھی ہندوستانی کاشتکاروں کا کسی قسم کا نقصان نظر نہیں آتا۔

بہرحال جب یہ صورت ہے تو میں کسی طرح ان تحفظات کی تائید نہیں کرسکتا جو وزیر ہندوستان کے وزیر مالیات کی پوری ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں حائل ہوں گے اور ذمہ داریاں بھی وہ جن میں زیادہ تر ہندوستانی کاشتکاروں کا مفاد مدنظر ہو۔

ذرائع آمدنی مگر میں کمیٹی کو ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں باوجود اس کے کہ لارڈ چانسلر صاحب نے اور آپ نے ہمیں پہلے سے متنبہ کردیا ہے۔ میرا اول تو یہی کہنا ہے کہ اگر ہندوستان کی مالیات کا معقول انتظام ہو اور اس میں سراسر اسی کا فائدہ مدنظر رکھا جائے تو ہمیں باہر کے بازاروں میں خصوصاً لندن کے بازار میں روز روز وہ اتار چڑھاؤ نہ دیکھنا پڑے جو اب دیکھنا پڑتا ہے۔ جب میں نے پہلے پہل سر ڈینیل ہملٹن کے

مضامین کا ذکر سُنا تو مجھے ان کے پڑھنے میں بہت تامل تھا۔ میں ہندوستان کی مالیات میں قریب قریب کورا تھا۔ میری حیثیت بالکل ایک بندی کی سی تھی مگر انھوں نے بہت زور شور سے اصرار کیا کہ جو کاغذات وہ مجھے بھیجتے رہتے ہیں انھیں پڑھوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کا بہت کچھ سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے۔ وہ بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں اور مالیات میں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جو تجویزیں پیش کی ہیں ان پر خود بھی عمل کر رہے ہیں۔ جو لوگ ہندوستان کی مالیات کے متعلق ان کا نقطہ نظر سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے موصوف کا یہ قول خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ ہندوستان کو نہ چاندی کی نہ سونے کی اور نہ کسی اور دھات کے معیار زر کی ضرورت ہے بلکہ ہندوستان میں ایک نرالی دھات موجود ہے یعنی اس کے لاکھوں کروڑوں مزدور۔ یہ سچ ہے کہ اب تک ہندوستان کی مالیات کے مقابلے میں حکومت برطانیہ نے دیوالہ نہیں نکالا ہے اور اپنا کام چلا رہی ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اس سے نقصان کتنا پہنچتا ہے۔ اس کی زد کاشت کار پر پڑتی ہے اسی سے دبا کر روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ اگر روپیوں میں حساب لگانے کے بجائے ارباب حکومت مالیات کا حساب کاشت کاروں کے فائدے کے لحاظ سے لگاتے تو انھیں آج باہر کے بازاروں کا سہارا نہ ڈھونڈھنا پڑتا۔ ہر شخص تسلیم کرتا ہے اور خود برطانیہ کے مالیات کے ماہر کہتے ہیں کہ دس برس میں سے نو برس میں ہندوستان کا توازن مالیات ملک کے موافق ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جس سال ہندوستان کی آمدنی روپے میں آٹھ آنے یا دس آنے بھی ہوتی ہے تو یہ آٹھ ہی آنے توازن کو موافق رکھنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان قدرت کی فیاضی سے، دھرتی ماتا کی کرپا سے، اتنا کچھ پیدا کرتا ہے کہ وہ اس کے سارے قرضے چکانے

کے لئے کافی سے زیادہ ہے اور اس کو جتنی درآمد کی ضرورت ہو سکتی ہے اس سے بڑھا ہوا رہتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور میرے نزدیک بیشک سچ ہے تو ہندوستان کو دوسرے ملکوں کے سرمایہ داروں کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت نہیں وہ ان لوگوں کا سہارا ڈھونڈھنے پر اس بوجھ کی وجہ سے مجبور کر دیا گیا ہے جو اس پر "ولایت کی قسطوں"[1] اور ملکی حفاظت کا زبردست خرچ ادا کرنے کے لئے ڈالا جاتا ہے۔ اصل میں یہ ملک کسی طرح اس بار کو اٹھانے کے قابل نہیں لیکن اس کی ادائگی کے لئے مالگذاری کا وہ طریقہ وضع کیا گیا ہے جسے ایک قائم مقام کمشنر یعنی رمیش چندر دت آنجہانی نے بہت سخت الفاظ میں قابل الزام قرار دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں اور لارڈ کرزن میں اسی مسئلے پر بحث ہوئی تھی اور ہم ہندوستانیوں کے نزدیک رمیش چندر دت حق بجانب تھے۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ مشہور بات ہے کہ ہندوستان کے یہ کروروں کاشتکار سال میں چھ مہینے بیکار رہتے ہیں۔ اگر حکومت ایسا انتظام کرے کہ یہ لوگ چھ مہینے بیکار نہ رہیں تو ذرا اندازہ کیجئے کہ یہ کتنی دولت پیدا کریں گے۔ پھر ہمیں باہر کے بازار کا سہارا ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت رہے گی؟ میرے جیسے ناواقف آدمی کے لئے جسے ہمیشہ ان غریبوں کی فکر رہتی ہے اور جو ہر چیز کو انھیں کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہے، مالیات کا مسئلہ جو کچھ ہے یہی ہے۔ یہ لوگ تو یہی کہیں گے کہ ہمارے پاس مزدور بہت ہیں اس لئے ہمیں باہر کے سرمایہ داروں کا سہارا نہیں چاہیئے۔ جب تک ہم محنت کرتے ہیں ساری دنیا کو ہمارے محنت کے پھل کی خواہش ہو گی اور یہ سچ بھی ہے کہ آج ساری دنیا کو ہماری محنت کی پیداوار درکار ہے ہم وہ چیزیں پیدا کر سکتے ہیں جو دنیا

[1] home charges

خوشی سے ہم سے لے لے گی۔ ہندوستان کی یہ حالت آج سے نہیں بلکہ مدتوں سے ہے۔ اس لئے مجھے سچ مچ وہ ڈر نہیں ہے جس کا اظہار جناب لارڈ صاحب، آپ نے ہندوستان کی مالیات کے متعلق فرمایا تھا۔ میرے نزدیک تو جب تک ہمیں اپنے دربانوں پر اور اپنی ردکڑ پر پورا پورا اختیار نہ ہو ہم خود اختیاری کا بوجھ نہیں سنبھال سکیں گے اور یہ خود اختیاری کسی کام کی نہیں ہوگی۔

تحفظات اور ضمانتوں کی نوعیت | میں اس وقت تک کسی قسم کے تحفظات تجویز نہیں کرسکتا ہوں

جب تک مجھے اس کا اطمینان نہ ہوجائے کہ میری قوم کو کامل ذمہ دارانہ حکومت فوج پر اور سول سروس پر کامل اختیار حاصل ہوگا اور وہ جتنے ملکی اور فوجی ملازم چاہے گی ان شرائط پر جو ہندوستان جیسی غریب قوم کے لئے مناسب ہوں، رکھ سکے گی۔ جب تک مجھے یہ باتیں نہ معلوم ہوں میرے لئے تحفظات کا تجویز کرنا قریب قریب ناممکن ہے اور ان باتوں کا لحاظ رکھنے کے بعد تحفظات کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص پہلے ہی سے اس میں شبہ کرنے لگے کہ ہندوستان اپنا بوجھ سنبھال سکے گا اور اپنی حکومت امن وامان سے چلا سکے گا۔ ایسی صورت میں میرے نزدیک تو کوئی خطرہ خیال میں بھی نہیں آسکتا سوائے اس کے کہ جیسے ہی ہم حکومت ہاتھ میں لیں، دنیا میں ہر چیز تہ و بالا ہوجائے۔ اگر برطانیہ والوں کے دل میں بھی خوف ہے تو ہمارے ان کے سمجھوتے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہم ذمہ دارانہ حکومت اس لئے چاہتے ہیں اور اصرار سے چاہتے ہیں کہ ہمیں بھروسا ہے کہ ہم اپنا کام اچھی طرح چلالیں گے، اور میرے نزدیک جیسا برطانوی حاکموں نے چلایا ہے یا چلا سکتے ہیں اس سے کہیں اچھا چلائیں گے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ان میں

قابلیت نہیں ہے میں یہ مانے لیتا ہوں کہ وہ ہم سے بہت قابل ہیں اور ان میں انتظام کا ایسا سلیقہ ہے کہ ہمیں ان کی شاگردی کرنا پڑتی ہے۔ مگر ہم میں ایک بات ہے جو ان میں نہیں ہے۔ ہم اپنے ملک سے واقف ہیں، اپنی قوم کو جانتے ہیں اس لئے ہم اپنی حکومت بہت کم خرچ میں چلائیں گے۔ ہم لڑائی جھگڑے سے پرہیز کریں گے ہمیں شہنشاہی کی ہوس نہیں اس لئے ہم افغانستان یا کسی اور ملک سے جنگ نہیں چھیڑیں گے بلکہ دوستانہ تعلقات پیدا کرلیں گے۔ انھیں ہم سے کوئی ڈر نہیں ہوگا۔

یہ تصور ہندوستان کی مالیات کا میری نظر میں ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میرے ذہن میں مالیات کی اتنی اہمیت نہیں اور نہ میں اس کی حالت کو اس قدر خطرناک سمجھتا ہوں جتنا آپ حضرات یا جناب لارڈ چانسلر یا دیگر برطانوی وزرا، جن سے مجھے اس مسئلے میں گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا، سمجھتے ہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ میں نہ ان تحفظات کی تائید کر سکتا ہوں جو یہاں تجویز کئے گئے ہیں اور نہ ان خدشوں کو صحیح سمجھتا ہوں جنھوں نے برطانوی قوم کے یا برطانیہ کے ذمہ دار اصحاب کے دل میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے۔

جتنی ذمہ داریاں قومی حکومت قبول کرے گی ان سب کے لئے معقول اور مناسب ضمانتیں جو ہماری قوم دے سکتی ہے، دی جائیں گی۔ لیکن میرے نزدیک اس قسم کی ہرگز نہیں ہوں گی جن کا ذکران دفعات میں ہے۔ فرض کیجئے ہم نے بعض ذمہ داریاں جو برطانیہ عظمیٰ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں قبول کرلیں اور ہم اپنا کام نہ چلا سکے اور ان ذمہ داریوں کو پورا نہ کر سکے تو یہ کاغذی ضمانتیں کس کام آئیں گی۔ یا فرض کیجئے ہندوستان کو خود مختار ہونے کے بعد مسلسل بہت سی خراب

فصلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورت میں بھی میرے نزدیک کوئی تحفظ ایسا نہیں ہو سکتا جس کے ذریعہ سے ہندوستان کا گلا دبا کر روپیہ وصول کیا جا سکے۔ اگر ایسے حالات جن کا پہلے سے اندازہ نہیں ہو سکتا پیش آئے اور قدرت کا قہر اس طرح نازل ہوا تو کوئی حکومت ان کی ضمانت نہیں دے سکتی۔

میں اپنی تقریر افسوس کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ مجھے بہت سے حاکموں سے جو ہندوستان کے معاملات کا تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے بہت سے ہموطنوں سے جو گول میز کانفرنس میں موجود ہیں اختلاف کرنا پڑا۔ لیکن اگر مجھے کانگریس کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرنا ہے تو میں اس پر مجبور ہوں کہ ان خیالات کا جن میں میری اور کانگریس کے بہت سے ممبروں کی رائے متفق ہے اظہار کروں خواہ اس میں یہ خطرہ ہو کہ آپ حضرات ناخوش ہو جائیں گے۔

(اس تقریر کے ختم ہونے کے بعد لارڈ ریڈنگ نے کہا "میرے خیال میں آپ نے میرے قول کو صحیح نقل نہیں کیا۔ ممکن ہے آپ کو کسی اور کے الفاظ سنکر غلط فہمی ہوئی ہو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں اپنی تقریروں میں جو میں نے مالیات کے متعلق کیں کہہ چکا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہ تھے کہ ان تقریروں کا جواب ناممکن ہے"

گاندھی جی۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی نہ ہوں گے۔

(۱۰)

صوبوں کی حکومت خود اختیاری

میں پروفیسر لیز اسمتھ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی بدولت یہ بحث چھڑی اور آپ کا، جناب لارڈ چانسلر، شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس مباحثہ کی اجازت دی۔ میرے خیال میں پروفیسر لی اسمتھ نے اس مباحثے کا آغاز کرکے بے حد امید پروری[له] کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اس طبیب کی طرح آئے ہیں جس کے ساتھ آکسیجن کا پیپا ہو اور وہ ایک جاں بلب مریض کے جسم میں پمپ سے آکسیجن پہنچا رہے ہیں۔ میں اس کانفرنس کو جاں بلب اس افواہ یا دھمکی کی وجہ سے نہیں کہتا ہوں کہ ہندوستان کو صوبوں کی حکومت خود اختیاری بغیر مرکزی آزادی کے ملے گی۔ میں اپنے عاجزانہ انداز میں اس کارروائی کے شروع ہونے کے وقت سے آپ حضرات کو آگاہ کرتا رہا ہوں اور میں نے یہ بات صاف کہہ دی تھی کہ مجھے یہ کانفرنس اصلیت سے خالی معلوم ہوتی ہے جس کا کچھ کچھ احساس چند روز سے سر تیج بہادر سپرو کو بھی ہو رہا ہے۔ مجھے یہ بات اس طرح معلوم ہوئی کہ انھوں نے ازراہ نوازش منجملہ اور دوستوں اور رفیقوں کے (اگر میں اپنے آپ کو ان کے رفیقوں میں شمار کر سکتا ہوں) مجھ پر بھی اپنے یہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ سپرو صاحب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر رہ چکے ہیں اور انتظامی امور کا پختہ کارانہ تجربہ رکھتے ہیں۔ اس تجربہ کی بنا پر انھوں نے ہمیں صوبوں کی نام نہاد خود اختیاری حکومت کے خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ میری عادت ہے کہ گناہ

[له] optimism ہر بات کا اچھا نتیجہ نکلنے کی امید باندھنا۔

کرتا ہوں اور پھر اس پر اصرار کرتا ہوں۔ ان کا یہ اشتباہ خاص کر میرے لئے تھا کیونکہ میں نے صوبوں کی خودمختاری کے متعلق بہت سے انگریز دوستوں سے جو یہاں ذمہ دار لیڈر ہیں گفتگو کرنے کی جرأت کی تھی اور انھیں اس کی خبر ہو گئی تھی اس لئے انھوں نے اچھی طرح میرے کان کھول دئے۔ یہی وجہ ہے کہ اور لوگوں کے ساتھ میں نے بھی ایک کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ اس تحریر پر نہیں جو جناب لارڈ چانسلر آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے بلکہ اسی قسم کے ایک بیان پر جو دس دن ہوئے اخباروں میں دیا گیا تھا اور جس میں وزیر اعظم سے خطاب تھا۔ میں نے (سر تیج بہادر سے) وہی بات کہی جو میں یہاں کہہ رہا ہوں، کہ جس نتیجے پر وہ خود اور ان کی تائید میں تقریر کرنے والے پہنچے۔ اسی پر میں بھی پہنچا مگر میں نے راہ دوسری اختیار کی تھی "جہاں فرشتے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں وہاں بیوقوف بے دھڑک چلے جاتے ہیں"۔ مجھے انتظامی امور کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لئے میں سمجھتا تھا کہ اگر صوبوں کی خودمختاری وہ چیز ہے جو میرے ذہن میں ہے تو میں تو بے تامل تیار ہوں کہ اسے ہاتھ میں لوں اور الٹ پلٹ کر دیکھوں کہ میرے کام کی ہے یا نہیں۔ مجھے اس کا بڑا شوق ہے کہ جو دوست میری پالیسی کے مخالف ہیں ان سے انھیں کے پلیٹ فارم پر ملوں، ان کی مشکلات کو سمجھوں اور یہ دیکھوں کہ جو کچھ وہ دیتے ہیں اس سے ہمارا مقصد پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ محض اسی خیال سے میں نے صوبوں کی خودمختاری کے مسئلے پر بحث کرنے کی جرأت کی۔ لیکن بحث چھڑتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ صوبوں کی خودمختاری سے ان کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو میرا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے دوستوں سے (سر تیج بہادر وغیرہ سے) کہا کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اور میری طرف سے اطمینان رکھئے کہ میں صوبہ وار خودمختاری کے

احمقانہ تصور سے، یا ملک کے لئے حقوق حاصل کرنے کی بے صبری میں اس کے
حقیقی مفاد کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ مجھے جس بات کی فکر ہے وہ یہ ہے کہ جب میں
بہت کچھ تامل کے باوجود ہزاروں میل اس لئے آیا ہوں کہ حکومت اور اس
کانفرنس کے ساتھ دل سے اتحاد عمل کروں اور میں نے خیال قول اور فعل میں
اتحاد کا خیال رکھا ہے تو اب اس کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھنا
چاہیئے چنانچہ میں نے خطرے کی حد میں قدم رکھنے میں بھی تامل نہیں کیا۔
یعنی دل کڑا کر کے صوبوں کی خود مختاری کے مسئلے پر بحث کر ڈالی۔ مگر میں
اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا یا وزیر اعظم کا ارادہ ہندوستان کو صوبوں
کی خود مختاری اس حد تک دینے کا نہیں جس سے میرے جیسے خیال کا آدمی
مطمئن ہو جائے اور کانگریس کا بھی اس حد تک اطمینان ہو جائے کہ وہ صوبوں
کی خود مختاری قبول کرلے خواہ مرکزی ذمہ دارانہ حکومت ملنے میں دیر بھی ہو۔

تخویفی تحریکوں کا علاج [1]

میں اپنے مطلب کو واضح کردوں کیونکہ اس
معاملے میں بھی میری دلیلیں اوروں سے
مختلف ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرا مفہوم غلط سمجھیں۔ آپ کی اجازت
سے میں ایک مثال پیش کروں گا۔ میں بنگال کو مثال کے طور پر لیتا ہوں
کیونکہ یہ ہندوستان کے ان صوبوں میں سے ہے جہاں سب سے زیادہ بے چینی
ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بنگال میں ایسے لوگوں کا زور ہے جو تخویفی طریقے کے
قائل ہیں۔ اب یہ بات سب کو معلوم ہو گئی ہو گی کہ مجھے تخویف کے حامیوں
سے مطلق ہمدردی نہیں ہے۔ میں بدستور اس خیال پر قائم ہوں کہ جو لوگ

---

[1] ایسی تحریک جس کا مقصد دھمکانا ہو۔ مثلاً بم پھینکنا :-

اِصلاح کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے تخویف بدترین حربہ ہے خصوصاً ہندوستان کے لئے یہ بہت بری چیز ہے اس لئے کہ یہ اس سرزمین سے مناسبت نہیں رکھتی اور اس میں پنپ نہیں سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نوجوان جو اپنے خیال میں ایک اچھے مقصد کے لئے جان دے رہے ہیں اصل میں اپنی جانیں مفت گنوا رہے ہیں اور ملک کو ایک قدم بھی اس منزل کے قریب نہیں لا رہے ہیں جو ان کے ہمارے سب کے پیش نظر ہے۔

میں ان سب باتوں کو مانتا ہوں لیکن پھر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اگر بنگال کو آج صوبے کی خودمختاری مل جائے تو وہ کیا کرے گا؟ بنگال یہ کریگا کہ جتنے نظر بند ہیں ایک ایک کو رہا کردے گا۔ وہ تخویف پسندوں کو سزائیں دینے کے بجائے ان کے دل پہ اثر ڈالے گا اور ان کے خیالات کی اصلاح کرے گا۔ میں تو پورے بھروسے کے ساتھ یہی کردں اور بنگال سے تخویفی تحریک کی جڑ کھود کر پھینک دوں۔

مگر میں ایک قدم اور بڑھاتا ہوں اور وہ سچی بات جو میرے دل میں ہے آپکے ذہن نشین کرتا ہوں۔ اگر بنگال خودمختار رہو تو یہ تخویفی تحریک آپ ہی ختم ہوجائے گی۔ تخویف کے حامی اس خیال خام میں بتلا ہیں کہ ان کا یہ فعل جلد سے جلد آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب آزادی مل جائے گی، تو اس تحریک کا نام بھی نہ رہے گا۔

آج ایک ہزار نوجوان نظر بند ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ انھیں تخویف کے حامیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ ہزار کے ہزار نوجوان بغیر تحقیقات کے بغیر ثبوت کے محض شبہ پر گرفتار کرلئے گئے ہیں۔ جہاں تک چاٹگام کا تعلق ہے، مسٹر سین گپتا، جو کلکتہ

کے صدر، بلدیہ[1] بنگال کی مجلس وضع قوانین کے رکن، اور صوبہ بنگال کی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، یہاں موجود ہیں۔ وہ میرے پاس ایک رپورٹ لائے ہیں جس پر بنگال کی سب پارٹیوں کے لوگوں کے دستخط ہیں۔ اس رپورٹ کو پڑھکر بڑا رنج ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چاٹگام میں چھوٹے پیمانے پر وہی نادرشاہی بیت گئی جو ۱۹۲۲ء میں آئرستان کی سین فن جماعت کے خلاف عمل میں آئی تھی۔ اور چاٹگام ہندوستان کے نقشے میں کوئی غیر معروف جگہ نہیں ہے۔

اب سنا ہے کہ جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی گئی ہے جس کے لئے تمام فوجیں کلکتے میں جمع ہوئی ہیں۔ اور یہ جلوس شہر کی سڑکوں پر نکالا گیا ہے۔ اس کا خرچہ کس کے ماتھے جائیگا اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ کیا تخویف کے حامی ڈر جائیں گے؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہرگز نہیں ڈریں گے۔ تو پھر کیا اس کی وجہ سے کانگریس سول نافرمانی ترک کر دے گی؟ کبھی نہیں کرے گی۔ کانگریس والوں نے اس کام کا عہد کر لیا ہے۔ تکلیف سہنا ان کی جماعت کا امتیازی نشان ہے۔ انھوں نے دل میں ٹھان لیا ہے کہ ہر کڑی کو جھیلیں گے۔ اس لئے وہ اس حرکت سے ڈرنے والے نہیں۔ ہمارے بچے اس تماشے پر ہنسیں گے اور ہمیں ان بچوں کو یہی سکھانا ہے کہ انھیں توپ خانے، ہوائی فوج وغیرہ کے مظاہرے سے لرزنا اور سہمنا نہیں چاہیئے۔

---

[1] Mayor

حقیقی خود مختاری غرض آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میرے ذہن میں صوبوں کی خود مختاری کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے یہ باتیں ناممکن ہو جائیں گی۔ ہم ایک سپاہی کو بھی بنگال میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اس فوج کے رکھنے کے لئے جو ہمارے اختیار میں نہ ہو ایک پیسہ بھی نہ دیں گے۔ آپ جو خود مختاری دینا چاہتے ہیں اس میں اس کی گنجائش نہیں کہ ہم سب نظربندوں کو رہا کر دیں اور ضوابط بنگال[۱] کو یک قلم منسوخ کر دیں۔ صحیح معنی میں خود مختاری یہ ہو گی کہ بنگال اسی طرح آزاد ہو جیسے نٹال جس کی ذمہ دارانہ حکومت کی نشو و نما میں نے دیکھی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی نوآبادی ہے مگر اپنی جداگانہ زندگی اپنی رضا کار فوج غرض سبھی کچھ رکھتی ہے۔ آپ کے پیش نظر بنگال کے یا کسی صوبے کے لئے یہ چیز نہیں ہے۔ وہاں تو معاملات میں بدستور مرکزی حکومت کا حکم ناطق ہو گا۔ وہی سب کچھ کرے گی۔ یہ وہ صوبے کی خود مختاری نہیں جو میرے ذہن میں ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اگر آپ جیتی جاگتی صوبے وار خود مختاری دیں تو میں اس مسئلے پر غور کرنے کو تیار ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ یہ چیز ملنے کی نہیں۔ اگر یہ خود مختاری ملنے والی ہوتی، تو یہ طول طویل کارروائی جو کی جا رہی ہے نہ کی جاتی۔ اس صورت میں معاملات کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔

مگر مجھے اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ہم سب کے سب یہاں ایک ہی غرض سے جمع ہوتے ہیں۔ میں یہاں خاص اس معاہدے کی وجہ سے آیا ہوں جس میں صاف صاف لکھا ہے کہ میرے یہاں آنے کی غرض ذمہ دارانہ مرکزی حکومت کے متعلق بحث کرنا اور یہ حکومت حاصل کرنا ہے

---

[۱] Bengal Regulations

یعنی وفاقی حکومت کامل اختیارات کے ساتھ جس میں بعض تحفظات بھی ہونگے مگر وہی جو ہندوستان کے لئے مفید ہوں۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میں ہر تحفظ پر جو ضروری ہو، غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر پروفیسر لیز اسمتھ سے یا اور اصحاب سے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ دستور اساسی کی ترتیب کے لئے تین سال کی طویل مدت درکار ہے۔ ان کے خیال میں صوبہ وار خود مختاری اٹھارہ مہینے کے بعد مل سکتی ہے۔ میں اپنی حماقت سے یہ سمجھتا ہوں کہ اتنی دیر لگنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر قوم اپنے دل میں طے کر چکی ہو، پارلیمنٹ طے کر چکی ہو۔ وزرا طے کر چکے ہوں اور انھوں نے یہاں کی رائے عامہ کو ہموار کر لیا ہو تو ان کاموں میں دیر نہیں لگا کرتی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایسے موقعوں پر جب ایک رائے کام کرتی ہے تو کچھ دیر نہیں لگتی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہاں ایک رائے نہیں بلکہ بہت سی رائیں کام کر رہی ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی راہ چلتی ہے اور غالباً سب میں انتشار کا رجحان موجود ہے۔ ایسی صورت میں مجھے یقین ہے کہ اس مباحثے کے باوجود ہمیں ذمہ دار مرکزی حکومت نہیں ملے گی اور یہی نہیں بلکہ کانفرنس کا کوئی معقول نتیجہ بھی نہیں نکلے گا۔ مجھے بہت رنج ہے بہت دکھ ہے کہ برطانوی وزرا کا، قوم کا، اور سب ہندوستانیوں کا جو یہاں آئے ہیں، اس قدر قیمتی وقت یوں برباد ہو۔ مگر مجھے اندیشہ یہی ہے کہ باوجود اس آکسیجن کے پیپے کے نتیجہ صفر ہی صفر رہے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا لازمی انجام یہی ہے کہ صوبے کی خود مختاری زبردستی ہمارے گلے منڈھ دی جائے۔

جبر و تشدد کا اثر مجھے سچ مچ یہ خطرہ نہیں ہے۔ مجھے جس بات کا اندیشہ ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہے کہ اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں نہایت سخت تشدد کیا جائے۔ مجھے اس تشدد کی پرواہ نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں تشدد سے فائدہ ہی پہنچے گا۔ اگر یہ تشدد مناسب وقت پر شروع ہو تو میں اس کو کانفرنس کا بہت عمدہ نتیجہ سمجھوں گا۔ جبر و تشدد سے آج تک کسی قوم کو، جو اپنی منزل مقصود کی طرف استقلال سے قدم بڑھا رہی ہو، نقصان نہیں پہنچا۔ کیونکہ یہ تو اس کے لئے آکسیجن کے جھونکے کا کام دیتا ہے مگر وہ جھونکا نہیں جو پروفیسر لیز اسمتھ کی بدولت ہمارے حصے میں آیا ہے۔

میں جس بات سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے برطانوی قوم اور برطانوی وزراء سے اتحاد عمل کا جو باریک رشتہ دوبارہ قائم کیا تھا وہ ٹوٹنے والا ہے اور مجھے پھر یہ اعلان کرنا پڑے گا کہ میں پکا تارک موالات[۵۱] اور سول نافرمانی کرنے والا ہوں اور ترک موالات اور سول نافرمانی کا یہ پیام ہندوستان کے کروروں باشندوں کو پہونچانا پڑے گا۔ خواہ ہندوستان کی فضا پر کتنے ہی غبار اڑائے جائیں اور اس کے میدانوں میں کتنے ہی ٹینک[۵۲] دوڑائے جائیں۔ ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آج یہ چیزیں بچوں کے ننھے دلوں پر بھی اثر نہیں کرتیں۔ ہم ان کو یہ سکھاتے ہیں کہ جب ان کے آس پاس گولیاں پٹاخوں کی طرح چل رہی ہوں تو خوشی سے اچھلیں اور کودیں۔ ہم ان کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے تکلیفیں سہیں۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ چونکہ یہاں کچھ نہیں

---

۵۱ non-co-operator   ۵۲ tank

ہوا اس لئے سارا ہندوستان تہ و بالا ہو جائے گا۔ جب تک کانگریس کھوٹ
سے پاک ہے، جب تک عدم تشدد کا سکہ ہندوستان کے طول و عرض میں
جاری ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے اکثر کہا گیا ہے کہ کانگریس ہی تخویفی
تحریک کی ذمّہ دار ہے۔ میں اس موقع پر پورے زور کے ساتھ اس کی تردید
کرتا ہوں۔ اس کے برخلاف میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ
کانگریس کے عدم تشدد کے عقیدے ہی نے اب تک تخویفی تحریک کی قوت کو روکا
ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے لیکن رفتہ رفتہ
ہمیں کامیابی کی امّید ہے۔ یہ تخویفی تحریک ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتی۔
میں اسی طرح کی آزادی چاہتا ہوں جیسی مسٹر جیکر چاہتے ہیں مگر اس سے زیادہ
وسیع۔ میں عام لوگوں کے لئے پوری آزادی کا طالب ہوں اور مجھے معلوم
ہے کہ تخویفی تحریک سے ان کا بھلا نہیں ہوگا۔ یہ بیچارے بے زبان اور نہتّے
ہیں۔ انھیں کسی کی جان لینا نہیں آتا ہے۔ میں یہاں افراد کا ذکر نہیں کرتا
مگر ہندوستان کے عام لوگوں نے کبھی اس راہ پر قدم نہیں بڑھایا ہے۔

حقیقی ذمہ دارانہ حکومت

چونکہ میں عام لوگوں کے لئے آزادی چاہتا
ہوں اس لئے میرا خیال ہے کہ تخویف
سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کانگریس اگر ایک طرف برطانوی حکومت اور اس کی
تخویف سے جسے قانون نے جائز کر رکھا ہے جنگ کرے گی تو دوسری طرف
نوجوانوں کی خلاف قانون تخویف سے بھی لڑے گی۔ ان دونوں راہوں کے
درمیان لارڈ ارون نے برطانوی قوم کے اور میرے لئے یہ اتحاد عمل کی راہ
کھولی تھی۔ انھوں نے یہ پل بنایا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ میں صحیح سلامت

اس پر سے گذر جاؤں گا۔ چنانچہ میں گذر گیا اور اتحادِ عمل کی خاطر یہاں پہنچا لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ پروفیسر لیز اسمتھ نے فرمایا ہے اور جو کچھ اس طرف سے سر تیج بہادر سپرو، مسٹر شاستری اور دوسرے مقرروں نے کہا ہے اس سے قطع نظر کر کے مجھے تو اس محدود ذمہ دارانہ مرکزی حکومت سے بھی اطمینان نہیں ہوگا جو ان کے پیش نظر ہے۔

آپ جانتے ہیں میں ایسی ذمہ دارانہ مرکزی حکومت چاہتا ہوں جس میں ہمیں فوج اور مالیات پر اختیار حاصل ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت یہاں مجھے یہ چیز نہیں ملے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ برطانیہ کا ایک شخص بھی اس پر آمادہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے پھر جا کر اپنی قوم کو تکلیفیں اٹھانے کی دعوت دینا ہے۔ میں اس مباحثے میں اس لئے شریک ہوا ہوں کہ میں اپنے خیالات کو پوری طرح واضح کر دوں۔ صوبے کی خود مختاری کے متعلق جو باتیں میں اب تک اپنے دوستوں سے گھروں میں بیٹھ کر کہتا رہا ہوں وہ آج میں نے کھلم کھلا اس کانفرنس میں کہہ دی ہیں۔ میں اپنی تقریر کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ میری رائے وہی ہے جو سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے حضرات کی ہے یعنی مجھے دل سے یقین ہے کہ حقیقی صوبہ وار خود مختاری صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مرکزی ذمہ دارانہ حکومت موجود ہو یا پھر مرکزی حکومت اتنی کمزور کر دی جائے کہ صوبے اس سے جو چاہیں کرا لیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ آج اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کانفرنس وفاقی نظام قائم ہونے کی صورت میں مرکزی حکومت کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط رکھنا چاہتی ہے۔

ایک مضبوط مرکزی حکومت جو بیرونی قوت کے ہاتھ میں ہو اور کمزور لوں

کی مضبوط خود اختیاری حکومت، ان دونوں چیزوں کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے میری یہ رائے ہے کہ صوبہ وار خود مختاری کے ساتھ ذمہ دارانہ مرکزی حکومت لازمی ہے۔ مگر میں پھر کہتا ہوں کہ میں مخالف رائے پر بھی غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے یہ یقین دلا دے کہ اس قسم کی صوبہ وار خود مختاری جیسی میں بنگال کے لئے چاہتا ہوں مل سکتی ہے تو میں اُسے فوراً قبول کر لوں گا۔

طریق عمل

کثرت رائے کا اصول

میں نہیں سمجھتا کہ جو کچھ میں آج کہوں گا اس سے مجلس وزرا کے فیصلے پر کوئی اثر پڑے گا۔ فیصلہ تو غالباً پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ایسے معاملات جن کا تعلق ایک پورے برّاعظم کی آزادی سے ہو محض دلیل و حجت سے یا گفت و شنید سے طے نہیں ہوا کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ گفت و شنید کام کی چیز ہے اور اپنے محل پر اثر بھی کرتی ہے لیکن اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں گفت و شنید بالکل بے کار ہے۔ مگر میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ جہاں تک ممکن ہے میں ان حدود کے اندر رہنا چاہتا ہوں جو جناب وزیر اعظم آپ نے اس کانفرنس کے لئے پہلے جلسے میں مقرر کردی تھیں۔ اس لئے میں سب سے پہلے ان رپورٹوں کے متعلق چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں جو اس کانفرنس کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ آپ ان رپورٹوں میں عام طور پر یہ الفاظ پائیں گے کہ اکثریت کی فلاں رائے ہے مگر چند لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے اختلاف کرنے والوں کے نام نہیں ظاہر کئے گئے ہیں۔ میں نے ہندوستان میں یہ سُنا تھا اور جب میں یہاں آیا تو مجھ سے یہی کہا گیا کہ کسی بات کا فیصلہ عام اکثریت کے اصول کے مطابق نہیں کیا جائے گا۔ مجھے ان الفاظ سے اس بات کی شکایت مقصود نہیں کہ رپورٹیں اس طرح مرتب کی گئی ہیں، گویا ان میں کثرت رائے کا معیار مدنظر رکھا گیا ہے۔ بلکہ میں نے اس کا اظہار اس

لئے ضروری سمجھا کہ اکثر رپورٹوں میں آپ کو مخالف رائے بھی نظر آئے گی۔ اور
افسوس ہے کہ زیادہ تر یہ مخالف رائے میری ہوگی۔ میرے لئے یہ کوئی خوشی
کی بات نہیں تھی کہ مجھے اپنے ساتھ کے ڈیلیگیٹوں سے اختلاف کرنا پڑا۔
لیکن میں نے دیکھا کہ اگر میں اس اختلاف کا اظہار نہ کروں تو کانگریس کی صحیح
نمائندگی سے قاصر رہوں گا۔

ایک اور بات کی طرف بھی میں کانفرنس کو توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ
ہے کہ کانگریس کا کسی مسئلے سے اختلاف کرنا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے وفاقی
دستور کی کمیٹی کے ایک ابتدائی جلسے میں کہا تھا کہ کانگریس ہندوستان کے ۸۵
فیصدی آبادی یعنی اس کے کروڑوں بے زبان محنتی نیم فاقہ کش باشندوں کی،
نمائندگی کا دعویٰ رکھتی ہے۔ بلکہ میں نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہا تھا۔ کہ
کانگریس حق خدمت کی بنا پر رئیسوں، زمینداروں اور تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی
کی بھی مدعی ہے۔

کانگریس ہندوستان کی وکیل ہے

اس جلسے میں اور جتنی پارٹیاں ہیں ان میں سے
ہر ایک کسی خاص جماعت کی نمائندہ ہے صرف
کانگریس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ سارے ہندوستان
کی، اس کی کل جماعتوں کی وکیل ہے۔ وہ کوئی فرقہ وارانہ انجمن نہیں ہے۔ وہ ہر
قسم کی فرقہ بندی کی دشمن ہے۔ کانگریس میں نسل، رنگ، عقیدے کا کوئی امتیاز
نہیں۔ اس کا پلیٹ فارم سب کے لئے ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے اس اصول پر
ہمیشہ عمل نہ کر سکی ہو۔ دنیا میں کون سی انجمن اپنے اصولوں پر پورا پورا عمل کرتی
ہے؟ اس بارے میں جہاں تک مجھے علم ہے، کانگریس اکثر قاصر رہی ہے۔
ممکن ہے اس کے نکتہ چینوں کو اس کے قصور کا علم اس سے زیادہ ہو۔ لیکن

مخالف سے مخالف بھی اس بات کو مانے گا، اور ماننے والوں نے مانا بھی ہے کہ ہندوستانی قومی کانگریس کا دائرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کا پیام ہندوستان کی دور و دراز بستیوں میں پہونچ رہا ہے اور جب موقع آن پڑا ہے تو اس نے یہ دکھا دیا ہے کہ ملک کے سات لاکھ گانوؤں میں رہنے والے لوگوں پر اس کا کتنا بڑا اثر ہے۔

مگر یہاں میں یہ دیکھتا ہوں کہ کانگریس بھی اور پارٹیوں میں سے ایک پارٹی سمجھی جاتی ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں۔ میں اسے کانگریس کے لئے کوئی بڑی مصیبت نہیں سمجھتا البتہ اس کام کے لئے سخت مہلک جانتا ہوں جس کے کرنے کی غرض سے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کاش میں تمام برطانوی ارباب سیاست کو اور برطانوی وزرار کو یہ یقین دلا سکتا کہ جو معاملہ وہ کرنا چاہتے ہیں وہ صرف کانگریس ہی سے ہوسکتا ہے۔ کانگریس ہی ایک فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک قومی جماعت ہے جس کا نظام سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے وہی ان تمام اقلیتوں کی وکیل ہے جن کی طرف سے یہاں چند مطالبات پیش کئے گئے ہیں اور جن کی طرف سے دستخط کرنے والوں کا یہ دعویٰ ہے (اور میرے خیال میں غلط ہے) کہ وہ ہندوستان کے ۴۶ فی صدی باشندوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کانگریس تمام اقلیتوں کی وکیل ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔

آج اگر کانگریس کا یہ دعوےٰ تسلیم کر لیا جائے تو معاملات کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صلح کی خاطر، اس مقصد کی خاطر جو ہم سب میں مشترک ہے، ان انگریزوں میں جو اس میز پر بیٹھے ہیں اور ہم ہندوستانی مردوں اور عورتوں میں، مجھے اس دعوے پر زور دینا چاہیئے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ

کانگریس بہت قوی جماعت ہے، ایسی جماعت ہے جس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ حکومت کے مقابلے میں اپنی حکومت چلاتی ہے یا چلانا چاہتی ہے۔ اور ایک طرح سے میں نے اس الزام کی تصدیق کردی ہے۔ اگر آپ کانگریس کے طریق کار کو سمجھ سکتے تو آپ کو بڑی خوشی ہوتی کہ ایک ایسی جماعت موجود ہے جو مقابلے کی حکومت چلاتی ہے اور جس نے یہ دکھا دیا کہ ایک انجمن جس کی رکنیت اختیاری ہے جس کے پاس کوئی قوت نہیں، ان مخالف حالات کے باوجود نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

مگر نہیں۔ آپ نے کانگریس کو دعوت تو دی مگر آپ اس پر اعتبار نہیں کرتے۔ آپ نے اسے بلا تو لیا مگر آپ اس کے اس دعوے کو نہیں مانتے کہ وہ سارے ہندوستان کی نمائندہ ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے اس سرے سے بیٹھ کر آپ اس دعوے کی تردید کرسکتے ہیں اور میں اسے ثابت نہیں کرسکتا۔ لیکن باوجود اس کے آپ مجھے یہ دعویٰ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر بڑی زبردست ذمہ داری ہے۔

گفت وشنید کا طریقہ

کانگریس بغاوت کے اصول کی حامی ہے میں جانتا ہوں کہ ایسی کانفرنس میں جو ہندوستان کی مشکلات کا فیصلہ گفت وشنید کے ذریعے سے کرنے کے لئے منعقد ہوئی ہو بغاوت کا لفظ بھولے سے بھی زبان پہ نہ آنا چاہیئے۔ نہ جانے کتنے مقرر، ایک کے بعد ایک یہ کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان کو اپنی آزادی گفت وشنید کے ذریعے سے دلیل وحجت کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہیئے اور اگر برطانیہ نے ہندوستان کا مطالبہ دلیل وحجت کی بنا پر مان لیا ہے تو اس میں بڑی ناموری ہوگی۔ مگر کانگریس کو اس سے پوری طرح اتفاق نہیں۔ اس کے پاس ایک دوسرا

طریقہ ہے جو آپ لوگوں کو پسند نہیں۔

پرانا طریقہ

میں نے بہت سے مقرروں کو یہ کہتے سنا (یہ واضح رہے کہ میں نے ہر مقرر کی تقریر نہایت ادب اور توجہ سے سنی) کہ اگر ہندوستان میں بغاوت، شورش، تخویف وغیرہ کی آگ بھڑکی تو قیامت ہو جائے گی۔ مجھے تاریخ کے مطالعے کا دعوے نہیں مگر جب میں اسکول میں تھا تو میں نے تاریخ کا بھی ایک پرچہ لیا تھا اور میں نے یہ پڑھا تھا کہ تاریخ کے صفحے ان لوگوں کے خون سے لال ہیں جنھوں نے آزادی کے لئے جنگ کی ہے۔ میری نظر سے کوئی ایسی مثال نہیں گذری کہ قوموں نے بغیر کڑیاں جھیلے آزادی حاصل کی ہو۔ قاتل کا خنجر، زہر کا پیالہ، بندوق کی گولی، نیزے کا پھل یہ سب ہلاکت کی تدبیریں آزادی کے اندھے پرستاروں نے استعمال کی ہیں اور مورخوں نے انھیں قابل الزام نہیں سمجھا۔ میں تخویف پسندوں کی حمایت نہیں کرنا چاہتا۔

تخویف پسندوں کا اور کلکتے کے بلدیے کا ذکر غزنوی صاحب نے چھیڑا۔ اگر وہ یہ بات کہنا بھول گئے کہ صدر بلدیہ نے اس غلطی کی جو ان سے اور مجلس بلدیہ سے بعض کانگریسی ممبروں کے تقرروں میں آکر ہو گئی تھی کس خوبی سے تلافی کر دی۔

میں ان کانگریس والوں کا طرفدار نہیں ہوں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ تخویف پسندوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کانگریس کو جیسے ہی اس واقعے کا علم ہوا اس نے اس کی چارہ جوئی شروع کر دی۔ اس نے فوراً بلدیہ کلکتہ کے صدر سے جواب طلب کیا اور صدر بلدیہ نے ازراہ شرافت بے تامل اپنی غلطی تسلیم کی اور جو کچھ تلافی قانوناً ہو سکتی تھی وہ کر دی۔ میں اس کانفرنس کا وقت اس واقعے کی تفصیل کر کے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ غزنوی صاحب نے ایک نظم کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان چالیس اسکولوں میں جو بلدیہ کلکتہ کے ماتحت

ہیں طلبا یہ نظم پڑھا کرتے ہیں۔ ان کی تقریر میں اور بھی بہت سی غلط بیانیاں تھیں جن کے متعلق میں تفصیل سے بحث کر سکتا تھا۔ مگر مجھے یہ منظور نہیں ہے۔ میں نے یہ دو موٹی موٹی مثالیں بھی کلکتے کے معزز بلدیے کی خاطر، حق کی خاطر، اور ان لوگوں کی خاطر بیان کر دیں جو اس وقت یہاں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہیں۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ نظم بلدیے کے مدرسوں میں کارکنان بلدیہ کے علم میں سکھائی گئی تھی۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ گزشتہ سال ان افسوسناک دنوں میں بہت سی ایسی باتیں ہوئیں، جن کا ہمیں افسوس ہے اور جن کی ہم نے تلافی کر دی ہے۔

اگر کلکتے میں ہمارے بچوں کو وہ نظم سکھائی گئی جو غزنوی صاحب نے سنائی تو میں ان کی طرف سے معافی مانگنے کو حاضر ہوں لیکن پہلے اس کا ثبوت مل جائے کہ اس کے سکھانے والے ان مدرسوں کے معلم تھے اور انھوں نے مجلس بلدیہ کے ایما سے سکھائی۔ اس قسم کے الزام بارہا کانگریس پر لگائے جا چکے ہیں اور بارہا ان کی تردید ہو چکی ہے لیکن میں نے ان چیزوں کا ذکر یہاں اس سلسلے میں کر دیا کہ آزادی کی خاطر لوگوں نے جنگ کی ہے، اپنی جانیں دی ہیں، جن کو اپنے ملک سے نکالنا منظور تھا انھیں مارا ہے اور ان کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔

نیا طریقہ لیکن جب کانگریس کا زمانہ آیا تو اس نے ایک نیا طریقہ نکالا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں، یعنی سول نافرمانی، اور وہ اب تک اس طریقے کی پابند رہی ہے۔ مگر یہاں بھی میری راہ میں ایک دیوار حائل کر دی گئی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی حکومت سول نافرمانی کو گوارا نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ حکومت اسے گوارا نہ کرے گی۔

کسی حکومت نے آج تک کھُلی ہوئی بغاوت کو گوارا نہیں کیا۔ حکومت سول نافرمانی کو گوارا نہیں کرتی تو نہ کرے مگر یہی وہ قوت ہے جس کے آگے حکومتوں نے سر جھکایا ہے، خود برطانوی حکومت نے سر جھکایا ہے۔ (جنوبی افریقہ کی) با اقتدار ہالستانی[1] حکومت کو بھی آٹھ سال کی آزمائش کے بعد واقعات کی منطق سے قائل ہونا پڑا۔ جنرل اسمٹس بڑے بہادر، جنرل جیّد، مدبّر اور سخت گیر حاکم ہیں۔ ان جیسے شخص کے اس بات کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے کہ جو لوگ محض اپنی عزّت نفس کے قائم رکھنے کے لئے لڑ رہے ہوں ان کی جان لی جائے۔ جن باتوں کے منظور کرنے سے وہ ۱۹۰۸ء میں، جب جنرل بوتھا ان کی کمک پر تھے، کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے وہ انھیں سول نافرمانی کرنے والوں کی پوری پوری آزمائش کرنے کے بعد ۱۹۱۴ء میں ماننا پڑیں۔ اور ہندوستان میں لارڈ چیمسفورڈ کو یہی کرنا پڑا۔ بار دولی اور بورساد میں گورنر بمبئی کو یہی کرنا پڑا۔ میں آپ کو جناب وزیر اعظم یہ جتائے دیتا ہوں کہ اب یہ قوت کسی کے روکے نہیں رُکتی۔ میرے دل پہ جو بوجھ ہے وہ اسی کا ہے کہ اب ہندوستان والوں کے لئے پھر اسی انتخاب کا موقع آرہا ہے وہ پھر دوراہے پہ کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کدھر کو جائیں۔ میں مایوسی کے باوجود امید کو نہ چھوڑوں گا۔ میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا، کہ ہندوستان کے معاملات کا باعزت تصفیہ ہو جائے اور اس کی نوبت نہ آنے پائے کہ میں اپنے دیس کے لاکھوں کروروں مردوں، عورتوں بلکہ بچّوں تک کو اس دہکتی آگ کی آزمائش میں ڈالوں۔ میرے لئے یہ کوئی خوشی اور اطمینان کی بات نہیں

---

[1] Dutch، ہالستان (ہالینڈ) کی

کہ ان لوگوں کو پھر ایسی لڑائی لڑاؤں۔ لیکن اگر ہماری قسمت میں یہی ہے کہ ایک بار پھر اس آگ میں تپائے جائیں تو میں بڑی خوشی سے بڑے اطمینان سے یہ سمجھ کر اس میں کود پڑوں گا کہ ہمارا ملک جس بات کو حق سمجھتا ہے وہ کر رہا ہے۔ اور ملک کو یہ اطمینان ہوگا کہ اور جو کچھ ہو وہ جان لیتا نہیں بلکہ جان دیتا ہے، وہ برطانوی قوم کو بلا واسطہ تکلیف نہیں پہنچاتا بلکہ خود تکلیف اٹھاتا ہے۔ پروفیسر گلبرٹ مرے نے مجھ سے یہ بات کہی جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ انھوں نے اپنی فصیح و بلیغ زبان میں جو کہا تھا اسے میں اپنے الفاظ میں دُہراتا ہوں: "کیا آپ ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کے ہزاروں ہم وطنوں کی تکلیف سے ہم انگریزوں کو تکلیف نہیں ہوتی، کیا آپ ہمیں ایسا سنگدل سمجھتے ہیں؟" میں ہرگز ایسا نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو تکلیف پہنچے تاکہ آپ کے دل پر اثر ہو۔ جب آپ کے دل پر اثر ہوگا تب گفت و شنید کا اصل وقت آئے گا۔ اور یوں تو گفت و شنید ہمیشہ ہی ہوا کرتی ہے۔ اس بار جو میں ہزاروں میل کا سفر کر کے گفت و شنید کرنے آیا ہوں تو اس لئے کہ میرا خیال تھا کہ آپ کے ہم وطن لارڈ اروِن نے اپنے ہنگامی ضابطوں[1] سے ہماری اچھی طرح آزمائش کر لی ہے اور انھیں کافی ثبوت مل گیا ہے کہ ہزار ضابطے جاری ہوں، لاکھ لاٹھیاں برسیں، لیکن جو سیلاب آرہا ہے، ہندوستان کی آزادی کے پیاسے مردوں اور عورتوں کے دل میں جذبات کا جو طوفان اٹھ رہا ہے، وہ کسی کے روکے رُکنے والا نہیں۔

---

[1] ordinances

آزادی کی قیمت ابھی اس ساعت میں چند دقیقے باقی ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اب بھی آپ کانگریس کے مطالبے کو سمجھ لیں تو غنیمت ہے۔ میری جان آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے کانگریس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کی جان آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کروروں بے زبانوں کی جان بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک ہوسکے میں یہ نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کی جانوں کی قربانی ہو۔ اس لئے آپ یقین کیجئے کہ اگر کسی طرح باعزت فیصلہ ہوسکے تو میں اس کے لئے سب کچھ تج دینے کو تیار ہوں اگر میں کسی طرح آپ کے دل میں وہ ولولہ پیدا کردوں جو کانگریس والوں میں ہے کہ ہندوستان کو سچی آزادی نصیب ہو تو آپ مجھے مصالحت کے رنگ میں ڈوبا ہوا پائیں گے۔ آپ اس آزادی کا نام جو چاہئے رکھئے۔ گلاب کو کچھ بھی کہئے اس کی پیاری خوشبو وہی رہے گی لیکن میں آزادی کا سچا گلاب چاہتا ہوں۔ کاغذ کے پھول نہیں چاہتا۔ اگر آپ کے دل میں اور کانگریس کے دل میں، اس کانفرنس کے دل میں اور برطانوی قوم کے دل میں ایک لفظ کے ایک ہی معنی ہیں تو مصالحت کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن جب تک یہ یکجہتی نہ ہو، ایک چیز کی ایک ہی تعریف نہ ہو، ہم سب کی زبان پر جو لفظ ہے اس کا ہمارے نزدیک ایک ہی مفہوم نہ ہو مصالحت کی کوئی صورت نہیں۔ بھلا جب ہم زبان سے ایک ہی لفظ کہیں لیکن اس کی تعریف ہر ایک کے نزدیک الگ ہو تو مصالحت کیسے ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے۔ جناب وزیر اعظم، میں نہایت ادب سے کہتا ہوں یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی بات میں انسان

ہو سکے اور ایسا اتفاق ہو سکے کہ مصالحت کا رنگ جمے۔ مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب تک میری سمجھ میں ان اصطلاحوں کی جو ہم آپ ان کٹھن ہفتوں میں استعمال کرتے رہے ہیں کوئی ایسی تعریف نہیں آئی جسے ہم اور آپ سب مان لیں۔

ہماری منزل مقصود

مجھے پچھلے ہفتے ایک صاحب نے جو شگفتہ طبیعت کے ہیں ویسٹ منسٹر کا آئین[ط۱] دکھایا اور کہا آپ نے ڈومینین اسٹیٹس[ط۲] (مرتبہ مقبوضات) کی تعریف کبھی دیکھی ہے؟ میں نے لفظ "ڈومینین" کی تعریف پڑھی اور مجھے ذرا بھی تعجب یا صدمہ نہیں ہوا کہ اس لفظ کی منفی تعریف کی گئی تھی اور وہ بھی عام معنی میں نہیں بلکہ ایک خاص معنی میں۔ اس میں صرف یہ الفاظ تھے: لفظ "ڈومینین" کے تحت میں آسٹریلیا، جنوبی افریقہ کناڈا وغیرہ وغیرہ اور آزاد آئرستانی ریاست آتی ہے۔ میرے خیال میں مصر کا نام اس میں نہیں تھا۔ تب ان صاحب نے مجھ سے پوچھا "آپ نے دیکھا کہ آپ کے ڈومینین کے کیا معنی ہیں"؟ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ڈومینین کس چیز کا نام ہے اور کامل آزادی کسے کہتے ہیں۔ بلکہ مجھے تو ایک طرح سے اور اطمینان ہو گیا۔

میں نے کہا اب میں لفظ "ڈومینین" پر بحثا بحثی کرنے کے جھگڑے سے چھوٹا۔ میں اس اصطلاح سے باز آیا مجھے تو کامل آزادی چاہیے۔ مگر اس طرح بھی چین نہیں ملا۔ بعض انگریزوں نے کہا "آپ شوق سے کامل آزادی لیجئے۔ مگر پہلے یہ بتائیے کہ کامل آزادی کا مفہوم کیا ہے۔ پھر تعریفوں میں وہی اختلاف شروع ہو گیا۔

ط۱۔ Statute of Westminster
جس میں برطانیہ اور اس کی نوآبادیوں کے تعلقات کی تصریح کی گئی ہے۔

ط۲۔ Dominion Status

آپ کے ایک بہت بڑے مدبّر مجھ سے بحث کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا "میں سچ کہتا ہوں مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کامل آزادی سے یہ مراد لیتے ہیں" انھیں معلوم ہونا چاہیئے تھا مگر نہیں معلوم تھا۔ اب میں یہ بھی بتا دوں کہ وہ کیا تھا جو انھیں نہیں معلوم تھا۔ میں نے ان سے کہا "اگر ہم سلطنت کے ماتحت ہوں تو اس کے شریک نہیں سمجھے جا سکتے" انھوں نے فرمایا "ظاہر ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے" میں نے کہا مگر میں تو یہی چاہتا ہوں کہ ہم برابر کے شریک ہوں۔ اس میں بھی میں جبر کو گوارا نہیں کرتا بلکہ اپنی خوشی سے چاہتا ہوں کہ میرا ملک برطانیہ کے ساتھ شریک ہو۔ ہمیں انگریز قوم کے ساتھ شرکت منظور ہے مگر اس شرط پر کہ ہمیں وہی آزادی ملے جو آپ کی قوم کو حاصل ہے۔ مجھے اس شرکت کی آرزو صرف اس لئے نہیں کہ اس میں ہندوستان کا فائدہ ہے، صرف اس لئے نہیں کہ اس میں ہندوستان اور انگلستان دونوں کا فائدہ ہے۔ مجھے اس کی آرزو اس لئے ہے کہ دُنیا اس بوجھ سے نجات پائے جو اسے کچلے ڈالتا ہے۔"

اس گفتگو کو دس بارہ دن ہوئے۔ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی میرے پاس ایک اور انگریز کا خط آیا جنھیں آپ بھی جانتے ہیں اور جنکی آپ بھی عزت کرتے ہیں۔ منجملہ اور باتوں کے وہ لکھتے ہیں "مجھے دل سے یقین ہے کہ دنیا کی امن اور راحت کا دارو مدار ہماری آپ کی دوستی پر ہے" اور اس خیال سے کہ کہیں مجھے غلط فہمی نہ ہو یہ تصریح بھی کر دی ہے "یعنی ہماری قوم اور آپ کی قوم کی دوستی پر" اس کے بعد ان کے جو الفاظ ہیں وہ بھی آپ کو سنانا ضروری ہیں "اور تمام ہندوستانیوں میں آپ ہی ایک شخص ہیں جسے سچے انگریز پسند کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں" وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ خوشامد کے الفاظ استعمال

کریں اور میرے نزدیک انھوں نے یہ آخری جملہ خوشامد کی نیت سے نہیں لکھا ہے۔ مجھ پر اس کا یہ اثر نہیں ہوا کہ اپنی تعریف سمجھ کر پھول جاؤں۔ اس خط میں بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ اگر میں انھیں آپ کے سامنے بیان کر سکتا تو غالباً آپ کو اس جملے کا اصل مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی لیکن اتنا عرض کروں گا کہ، ان الفاظ سے وہ صاحب میری ذات مراد نہیں لیتے۔ میری ذات کوئی چیز نہیں، اور مجھے معلوم ہے کہ کسی انگریز کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ البتہ بعض انگریز اس بنا پر میری وقعت کرتے ہیں کہ میں ایک مقصد کا علمبردار ہوں ایک بڑی قوم کا وکیل ہوں، ایک بڑی انجمن کا جس نے اپنی اہمیت منوا کر چھوڑی ہے، نمائندہ ہوں۔ اس وجہ سے انھوں نے میری نسبت یہ لکھا ہے۔

لیکن جناب وزیر اعظم، یہ مجھے یقین ہے کہ مصالحت کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ کام چلانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ میں تو دل سے دوستی کی آرزو رکھتا ہوں۔ میرا کام یہ نہیں کہ ظالموں سے، اور ان سے جو دوسروں کو غلام بنا کر رکھتے ہیں، ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لوں۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے اور آج کانگریس نے بھی ان اصولوں کو میری طرح عقیدے کے طور پر تو نہیں، مگر ایک ضابطہ عمل کے طور پر مان لیا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ہندوستانی قوم کے لئے جس کی تعداد ۳۵ کروڑ ہے اس سے بہتر اور مناسب کوئی چیز نہیں۔

جس قوم میں ۳۵ کروڑ افراد ہوں اسے نہ قاتل کے خنجر کی ضرورت ہے نہ زہر کے پیالے کی، نہ بندوق کی گولی کی نہ نیزہ و شمشیر کی۔ اسے صرف آزاد ارادے کی ضرورت ہے اور اس کی کہ جو بات ماننے کی نہیں اسے ہرگز نہ مانے شکر ہے کہ آج یہ قوم انکار پر اصرار کرنا سیکھ رہی ہے۔

لیکن یہ قوم آخر کرنا کیا چاہتی ہے ؟ یہ کہ انگریزوں کو اسی وقت یا پھر کبھی نکال باہر کرے ؟ نہیں ۔ آج وہ اپنا مقصد یہی فرض یہ سمجھتی ہے کہ انگریزوں کو راہِ راست پر لائے ۔ میں ہندوستان اور انگلستان کے رشتۂ تعلق کو توڑنا نہیں چاہتا ، بدلنا چاہتا ہوں ۔ میری خواہش ہے کہ اس غلامی کی کایا پلٹ جائے اور وہ میرے ملک کے لئے آزادی بن جائے ۔ اب اسے چاہے کامل آزادی کہیے یا اور کچھ کہیے مجھے اس لفظ پر اصرار نہیں بلکہ اگر میرے ملک والے اعتراض کرینگے کہ تم نے کوئی اور لفظ کیوں منظور کرلیا تو میں ان سے نبٹ لوں گا مگر شرط یہی ہے کہ جو لفظ آپ تجویز کریں اس کے معنی یہی ہوں ۔

مالی دقتیں

اتحاد صنعت و تجارت[1] کے تین ماہرین فن نے اپنے اپنے انداز میں اپنے ماہرانہ تجربے کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے کہ ذمہ دار وزیروں کی کوئی جماعت ملک کے انتظام کو ہرگز نہیں چلا سکتی جب کہ اس کے ذرائع آمدنی میں سے ۸۵ فی صدی اس طرح مکفول کر دیئے گئے کہ ان کا چھڑانا ناممکن ہے ۔ انھوں نے اسی معلومات کی بنا پر آپ کو بتایا ہے کہ مالی تحفظات کا ہندوستان پر کیا اثر پڑے گا اور اس مسئلے کو ایسی اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مجھ سے نہیں ہو سکتا ۔ یہ تحفظات تو ہندوستان کے ہاتھ پیر بالکل شل کر دیں گے انھوں نے اس کانفرنس میں مالی تحفظات سے بحث کی ہے ۔ لیکن اس بحث کے اندر ملک کی حفاظت کا مسئلہ اور فوج کا مسئلہ بھی آگیا ہے ۔ لیکن جہاں میں یہ کہتا ہوں کہ تحفظات جس صورت میں پیش کئے گئے ہیں ناقابل قبول ہیں وہاں میں نے یہ بھی صاف کہہ دیا اور پھر کہتا ہوں کہ کانگریس ان تحفظات کے دینے کا اور ماننے کا عہد کر چکی ہے جو ہندوستان کے لئے مفید ثابت کر دیئے جائیں ۔

---

[1] Federation of Commerce and Industry

دستور وفاقی کی کمیٹی کے ایک اجلاس میں میں نے صاف الفاظ میں، تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ تحفظات ایسے ہونا چاہئیں جن میں برطانیہ کا بھی فائدہ ہو۔ میں ایسے تحفظات نہیں چاہتا جو صرف ہندوستان کے لئے مفید ہوں اور انگلستان کی حقیقی اغراض کو نقصان پہنچائیں۔ ہاں برطانیہ کی فرضی اغراض سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ہندوستان کی ناجائز اغراض اور برطانیہ کی ناجائز اغراض قربان کرنا پڑیں گی۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ اگر ہم سب کے ذہن میں ایک لفظ کے ایک ہی معنی ہیں تو مجھے مسٹر جیکر سے سر تیج بہادر سپرو سے اور دوسرے مقرروں سے جنھوں نے اس کانفرنس میں تقریر کی ہے، اتفاق ہے۔

میں بھی ان حضرات کی طرح یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم اتنی محنت کے بعد ایک معقول حد تک ہم زبان ہو گئے ہیں۔ مگر مجھے تو اس کا رنج ہے، اس وجہ سے مایوسی ہے کہ ایک ہی لفظ کے معنی میرے نزدیک کچھ اور ہیں اور آپ کے نزدیک کچھ اور ہیں۔ مجھے بہت اندیشہ ہے کہ تحفظات کا جو مفہوم مسٹر جیکر کے ذہن میں ہے وہ میرے مفہوم سے مختلف ہے اور کسی اور صاحب کا مثلاً سر سیمویل ہور کا مفہوم ہم دونوں کے مفہوم سے جُدا ہے۔ مگر یہ میرا خیال ہی خیال ہے۔ یقینی طور پر مجھے کچھ معلوم نہیں۔ سچ پوچھئے تو ہم لوگوں کو اب تک کھلم کھلا ایک دوسرے کا سامنا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بہ قول آپ کے معاملے کی بات ابھی تک چھیڑی ہی نہیں۔ میں ابتدا سے اسی فکر میں ہوں، دن رات اس کے لئے بے چین رہتا ہوں کہ ہم قریب آکر ایک دوسرے کا سامنا کریں اور معاملے کی بات چھیڑیں۔ آخر ہم میں مفاہمت کی کوئی صورت کیوں نہیں پیدا ہوتی اور ہم کس لئے اپنا وقت خطابت میں، دھواں دھار تقریروں میں، بحث

مباحثے میں، لوک جھوک میں برباد کر رہے ہیں۔ خدا گواہ ہے مجھے تقریر کرنے کی ہوس نہیں۔ خدا جانتا ہے مجھے بحث مباحثے میں شریک ہونے کا شوق نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آزادی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرانا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ بے شک ہمارے سامنے ایسے مسئلے ہیں جو بڑے بڑے مدبّروں کو زِچ کر دیں۔ ہمارے سامنے ایسے مسئلے ہیں جو دوسرے ملکوں کو کبھی پیش نہیں آتے۔ مگر ہم ان مسئلوں سے زِچ نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے وہ ان باتوں سے نہیں گھبراتے۔ یہ مسئلے اپنی جگہ پہ ہیں اور انھیں حل کرنا ہمارے لئے ضروری ہے جیسے طاعون یا فصلی بخار کے مسئلے کو حل کرنا ضروری ہے۔

ہمیں سانپ بچھو، بندر، شیر کے مسئلے بھی حل کرنا ہیں جن سے آپکو سابقہ نہیں پڑتا۔ ہم ان مسئلوں کو حل کریں گے۔ کیونکہ ہماری زندگی ابتدا سے انھیں کے درمیان گذری ہے۔

ہم ان باتوں سے زِچ نہیں ہوتے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اپنے ملک کے موذی کیڑوں اور جانوروں سے بچ نکلتے ہیں۔ اسی طرح ہم ان الجھیڑوں سے بچ نکلنے کی بھی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈھ لیں گے۔ مگر آج ہم آپ ایک گول میز کے گرد جمع ہیں اور ایک مشترک اصول تلاش کر رہے ہیں جس سے کام چل سکے۔ آپ یقین کیجئے کہ گو میں نے جو مطالبات کانگریس کی طرف سے پیش کئے ہیں ان سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا اور جو تقریریں وفاقی دستور کی کمیٹی میں کی ہیں ان کا ایک حرف بھی واپس نہیں لوں گا۔ مگر میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ مصالحت کروں۔ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ ہر اصول پر غور کروں جو انگریزوں کا دماغ ڈھونڈھ کر لائے یا جو شاستری صاحب، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، جیکر صاحب

جناح صاحب اور سر محمد شفیع صاحب اور ان جیسے اور دستور اساسی کے مبصر سوچ کر نکالیں۔

باہمی اعتماد

میں زرچ ہونے والا نہیں۔ مجھ سے جب تک کہئے یہاں ٹھہروں گا کیونکہ میں خوشی سے یہ نہیں چاہتا کہ سول نافرمانی کو دوبارہ جاری کروں۔ میری آرزو ہے کہ دہلی میں جو عارضی صلح ہوئی ہے وہ مستقل تصفیے کی صورت اختیار کرلے۔ مگر خدا کے لئے آپ لوگ اس عاجز ناتواں باسٹھ برس کے بوڑھے کو ایک ذرا سا موقع تو دیجئے۔ اسے اور اس کی جماعت کو آپ کے دل میں ایک ذرا سی جگہ تو ملے۔ آپ اس جماعت کی طرف سے بدظن ہیں گو آپ کو بظاہر مجھ پہ اعتماد ہے۔ آپ ایک لحظہ کے لئے بھی مجھ میں اور اس جماعت میں جس کے دریا کا میں ایک قطرہ ہوں امتیاز نہ کیجئے۔ میں اس جماعت سے جس کا میں رکن ہوں بڑا نہیں ہوں بلکہ بے انتہا چھوٹا ہوں۔ اس لئے اگر آپ کے دل میں میری جگہ ہے، اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو میری التجا ہے کہ آپ کانگریس پر بھی اعتماد کیجئے ورنہ وہ اعتماد جو آپ کو مجھ پر ہے بالکل بے حقیقت سمجھا جائے گا۔ میرا اقتدار کچھ نہیں سوائے اس کے جو کانگریس کا دیا ہوا ہے۔ اگر آپ کانگریس سے، وہ جیسی کچھ بھی ہے کام لیں تو تخویفی تحریک کا خاتمہ ہو جائے۔ تخویف کی ضرورت ہی نہ رہے آج آپ کو تخویف پسندوں کے گروہ سے اپنی منظم اور باضابطہ تخویف کے ذریعے جنگ کرنا پڑتی ہے کیونکہ آپ واقعات کی طرف سے اور تباہی کی نشانیوں کی طرف سے جان بوجھ کر غفلت کر رہے ہیں، کیا آپ کو یہ ہلاکت کی خبر دینے والی تحریر جسے تخویف پسند اپنے خون سے صفحہ ہستی پر لکھ رہے ہیں کبھی نظر نہ آئے گی؟ کیا آپ کبھی یہ بات نہ سمجھیں گے کہ ہم گیہوں کی روٹی نہیں چاہتے بلکہ آزادی کی روٹی چاہتے ہیں اور آج ہزاروں آدمی ایسے ہیں جنھوں نے قسم کھائی ہے کہ آزادی

حاصل کئے بغیر نہ خود چین سے بیٹھیں گے اور نہ ملک کو بیٹھنے دیں گے؟

میں آپ سے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہلاکت کی نشانیوں کو آنکھ کھول کر دیکھئے۔ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ جس قوم کا صبر ضرب المثل ہے اُسے اتنا نہ ستایئے کہ عاجز آجائے۔ ہندوؤں کا حلم تو مشہور ہی ہے۔ مگر مسلمان بھی ان کے ساتھ رہ کر چاہے یہ اچھا ہو یا بُرا حلیم بن گئے ہیں۔ مسلمانوں کے ذکر سے مجھے اقلیتوں کے مسئلے کا خیال آگیا جس نے سب کو زچ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ ہمارے سامنے موجود ہے اور میں پھر وہی کہتا ہوں جو ہندوستان میں کہا کرتا تھا۔ میں اپنے الفاظ بھولا نہیں ہوں کہ جب تک اقلیتوں کا مسئلہ حل نہ ہو جائے ہندوستان کو سوراج نہیں مل سکتا، آزادی نصیب نہیں ہو سکتی میں اسے خوب جانتا ہوں خوب سمجھتا ہوں اور اس پر بھی میں یہاں اپنے دل میں یہ امید لے کر آیا تھا کہ شاید میں کھینچ تان کر اس مسئلے کو حل کر لوں۔ مگر مجھے اس سے مایوسی نہیں ہے کہ کسی دن اقلیتوں کے مسئلے کا حقیقی حل معلوم ہو جائے گا۔ میں اپنے الفاظ جو میں نے پہلے کہے تھے دُہراتا ہوں کہ جب تک بیرونی حکومت کی پچر ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے، ایک طبقے کو دوسرے طبقے سے الگ کرتی رہے گی اس مسئلے کا حقیقی حل ممکن نہیں۔ مختلف فرقوں میں سچی دوستی نہیں ہو سکتی۔

ایسی صورت میں جو حل بھی نکلے وہ زیادہ سے زیادہ کاغذی حل ہو گا۔ لیکن جہاں یہ پچر ہٹی تو کیا آپ کے خیال میں آپس کے رشتے، گھریلو محبت اتحاد نسل ان سب چیزوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہو گا؟

کیا جب ہندوستان میں برطانوی حکومت نہیں تھی کسی انگریز کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ تو ہندو، مسلمان اور سکھ ہمیشہ آپس میں لڑا ہی کرتے تھے؟

ہندو اور مسلمان مورخوں نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں ہم لوگ آج کل
کے مقابلے میں زیادہ امن کی زندگی بسر کرتے تھے۔ آج بھی گانوؤں میں ہندو اور
مسلمان نہیں لڑتے۔ اس زمانے میں تو کبھی لڑائی کا نام بھی سننے میں نہیں آتا تھا
مولانا محمد علی مرحوم مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے (اور وہ خود بھی اچھے خاصے مورخ تھے)
کہ اگر خدا نے مجھے زندگی بخشی تو میں ہندوستان کی اسلامی حکومت کی تاریخ لکھوں گا
اور ان کاغذات کے ذریعے سے جنہیں انگریزوں نے محفوظ رکھا ہے ثابت کروں گا
کہ اورنگزیب کی جو بری تصویر برطانوی مورخوں نے دکھائی ہے وہ صحیح نہیں ہے،
مغل حکومت کا جو بدنما نقشہ ان کی تاریخوں میں نظر آتا ہے وہ اصلیت سے دور
ہے۔ یہی ہندو مورخ بھی کہتے ہیں۔ یہ لڑائی بہت پرانی ہے۔ یہ اسی وقت سے
ہے جب سے ہم اس شرمناک ذلت میں مبتلا ہیں۔ یہ اسی وقت سے ہے جب سے
انگریز آئے ہیں۔ جیسے ہی کہ برطانیہ اور ہندوستان کا یہ افسوسناک، مصنوعی اور
خلاف فطرت تعلق بدل کر فطری تعلق بن جائے گا اور اس کی حیثیت اختیاری
شرکت کی ہو جائے گی جسے ہر فریق جب چاہے چھوڑ سکتا ہو تو آپ دیکھیں گے
کہ ہندو، مسلمان، سکھ، یورپی، دیسی، انگریز، عیسائی اچھوت سب مل
جل کر رہیں گے۔

آج میرا قصد ہندوستانی رئیسوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کا نہیں ہے،
لیکن اگر میں ان مطالبات کا جو مجھے کانفرنس کے سامنے نہیں بلکہ ان رئیسوں کے
سامنے پیش کرتا ہیں، اظہار نہ کروں تو یہ کانگریس کے ساتھ اور ان رئیسوں
کے ساتھ بے انصافی ہو گی۔ رئیسوں کو اختیار ہے کہ وفاقی نظام میں شریک
ہونے کے لئے اپنی طرف سے جو شرائط چاہیں مقرر کریں۔ میں نے ان سے درخواست
کی ہے کہ جو لوگ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہتے ہیں ان کے لئے

سہولت پیدا کریں۔ میں یہی کر سکتا ہوں کہ یہ تجاویز رئیسوں کے سامنے پیش کر دوں تاکہ وہ ہمدردی کے ساتھ اچھی طرح ان پر غور فرمائیں۔ میرے خیال میں اگر وہ چند حقوق کو خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، ہندوستان کے مشترک حقوق تسلیم کر لیں اور خود اپنی مقرر کی ہوئی عدالتوں سے ان کی جانچ کرا لیں، اگر وہ اپنی رعایا کی نیابت کے محض ابتدائی اصول جاری کر دیں تو ان کی رعایا بہت کچھ مطمئن ہو جائے گی۔ ساری دنیا کو خصوصاً ہندوستان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دل میں جمہوریت کا جوش موجود ہے وہ خالص مطلق العنان حکمراں نہیں رہنا چاہتے بلکہ جارج پنجم شاہ برطانیہ کی طرح دستوری بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔

خود مختار صوبہ سرحد یوں تو سارے ہندوستان کو وہ حقوق ملنا چاہئیں جن کا وہ مستحق ہے اور جنھیں وہ واقعی حاصل کر سکتا ہے لیکن ہمارے ملک کو جتنے حقوق ملیں اور جب ملیں، صوبۂ سرحد کو تو آج ہی کامل حکومت خود اختیاری مل جانا چاہیئے۔ ایسا ہو جائے تو صوبۂ سرحد سارے ہندوستان کے لئے نمونہ بن جائے گا۔ اسی لئے کانگریس یہ رائے دینے کو تیار رہے کہ صوبہ سرحد کو کل ہی سے صوبہ وار خود مختاری مل جائے۔ جناب وزیر اعظم، اگر آپ اپنی مجلس وزرا سے یہ تجویز پاس کرا لیں کہ صوبہ سرحد کل سے مکمل خود مختار صوبہ بن جائے تو ہمارا اثر وہاں کے جرگوں پر جیسا چاہیئے ہو جائے گا اور جب کبھی سرحد پار کے لوگ ہندوستان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے تو ہم دم بھر میں ان جرگوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیں گے۔

شکریہ مجھے جو کام سب سے آخر میں کرنا ہے وہ میرے لئے نہایت خوشگوار ہے۔ غالباً آپ کے ساتھ بیٹھ کر گفت و شنید کرنے کا یہ میرے لئے آخری موقع ہے۔

میں اپنی طرف سے یہ نہیں چاہتا۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ جنگ کا آخری قدم اٹھانے سے پہلے آپ کے کمروں میں آپ کے ساتھ میز پر بیٹھوں، آپ سے گفت وشنید کروں، آپ سے التجا کروں، آپ کے سامنے عاجزی سے گھٹنوں کے بل جھک جاؤں۔
لیکن اس کا انحصار مجھ پر نہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ اتحاد عمل کرنے کی مسرت نصیب ہو گی یا نہیں۔ یہ زیادہ تر آپ پر منحصر ہے، بلکہ ممکن ہے آپ پر بھی نہ ہو۔ یہ بہت سی باتوں پر موقوف ہے جو نہ آپ کے اختیار میں ہیں نہ میرے اختیار میں۔ اس لئے مجھے یہ خوشگوار فرض ادا کرنے کی اجازت دیجئے کہ میں حضور ملک معظم اور ملکہ معظمہ سے لے کر اپنے مسکن مشرقی لندن کے غریب سے غریب لوگوں تک سب کا شکریہ ادا کروں۔
مشرقی لندن کے غریبوں کی اس بستی میں رہ کر میں انھیں کا ہو رہا۔ انھوں نے مجھے اپنے خاندان کا رکن، جیتا رکن بنا لیا ہے۔ یہ بہت بڑی دولت ہے جو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے یہاں جتنے لوگوں سے سابقہ پڑا انھوں نے میرے ساتھ سراسر اخلاق اور خلوص برتا۔ مجھے بہت سے انگریزوں سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ میرے لئے بڑے فخر کا مقام ہے۔ انھوں نے ایسی ایسی باتیں غور سے سنیں جو سچی سہی مگر انھیں ناگوار ہوئی ہوں گی۔ اگرچہ مجھے اکثر مجبور ہو کر ان سے اس قسم کی باتیں کہنا پڑیں مگر انھوں نے کبھی ذرا بھی آزردگی یا خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ ان چیزوں کی یاد کبھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتی۔ مجھ پر چاہے جو کچھ گزرے، اس گول میز کانفرنس کا چاہے جو انجام ہو، ایک مسرت یقیناً میرے دل میں رہے گی اور وہ یہ ہے کہ بڑوں سے لے کر چھوٹے تک سب کے سب میرے ساتھ انتہائی اخلاق اور انتہائی محبت سے پیش آئے۔ میرا خیال ہے کہ اس محبت کو دیکھ کر جو انسانیت کا جوہر ہے میری انگلستان آنے کی محنت

وصول ہوگئی۔

میرے دل میں انسانی فطرت کے نیک ہونے کا جو اٹل عقیدہ تھا وہ اس بات سے اور بھی گہرا اور پختہ ہو گیا کہ گو انگلستان کے مردوں اور عورتوں کے خیالات ان جھوٹی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں، جن سے اکثر آپ کے اخباروں کے صفحے سیاہ ہوتے ہیں، گو لنکا شائر میں لوگوں کو شاید ایک حد تک مجھ سے خفا ہونے کا حق تھا، مگر مجھے مزدوروں تک کے دلوں میں خفگی یا آزردگی کا شائبہ نظر نہیں آیا۔ مجھ سے انھوں نے ایسا برتاؤ کیا، گویا میں انھیں میں کا ایک ہوں۔ میں یہ کبھی نہ بھولوں گا۔

میں ہزاروں لاکھوں انگریزوں کی دوستی سے مالا مال ہو کر جا رہا ہوں۔ میں انھیں جانتا تک نہیں مگر جب صبح کو میں آپ کے شہر کی گلیوں میں ٹہلتا ہوں تو مجھے ان کی آنکھوں میں محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ساری مہمان نوازی یہ ساری مہربانی میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو گی خواہ میرے بدنصیب ملک کا انجام کچھ بھی ہو۔ میں آپ کے صبر و تحمل کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

---

(۱۴)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

جناب وزیر اعظم اور دوستو، جناب صدر کا شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری اور عزت مجھے عطا کی گئی ہے اور میں نے نہایت مسرت سے اس ذمہ داری اور عزت کو قبول کیا ہے۔ وہ صدر جو اپنے جلسے کی کارروائی کو سلیقے اور تہذیب کے ساتھ انجام دے ہمیشہ شکریے کا مستحق ہوتا ہے، خواہ حاضرین جلسے کے، یا خود صدر کے فیصلوں سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔

جناب والا، مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ذمے دُہرے فرائض تھے۔ آپ کا کام نہ صرف یہ تھا کہ جلسے کی کارروائی کو باوقار اور بے تعصبانہ طریقے سے انجام دیں۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ ہم لوگوں کو ملک معظم کی حکومت کے فیصلے سے مطلع کریں۔

آخری خدمت جو آپ نے صدر کی حیثیت سے انجام دی وہ ان سب معاملات کے متعلق، جن پر کانفرنس نے غور کیا ہے، ملک معظم کی حکومت کے سوچے سمجھے فیصلے سے ہم سب کو مطلع کرنا تھا۔ آپ کے کام کے اس حصے سے میں قطع نظر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرے لئے زیادہ خوشگوار وہ طریق کار ہے جو آپ نے کانفرنس میں اختیار کیا اور میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وقت کی قدر کرنے میں ہم سب کو آپ سے مفید سبق حاصل ہوا۔ حضرات صدر اکثر اس چیز کی طرف سے جو ان کا پہلا فرض ہے غفلت کرتے ہیں اور مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرے ملک میں یہ تکلیف دہ قاعدہ عام ہے۔ ہم لوگ وقت کی قدر جیسی کرنا چاہیئے نہیں کرتے۔ جناب وزیر اعظم میں اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہوں

کہ ہندوستان واپس جاکر اپنے ہم وطنوں کو بتاؤں کہ برطانیہ کے وزیر اعظم نے ہمیں کس طرح وقت کی قدر کرنا سکھایا ہے۔

دوسری چیز جو ہم نے دیکھی وہ آپ کی حیرت انگیز محنت ہے۔ آپ نے اسکاٹستان کی آب و ہوا میں، جو جفاکشی کا گھر ہے، پرورش پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس عرصے میں نہ خود آرام لیا اور نہ ہمیں آرام لینے دیا۔ آپ نے بڑی تندخوئی کے ساتھ ہم میں سے ہر ایک سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ایسے ایسے بڑھوں کو بھی جیسے میرے دوست اور محترم بھائی پنڈت مدن موہن مالوی ہیں یا میں خود ہوں، نہیں چھوڑا۔

آپ نے اس بے رحمی سے، جو ایک اسکاٹی کے شایان شان ہے، میرے دوست اور محترم رہنما شاستری جی کو کام لیتے لیتے تھکا مارا۔ کل آپ نے خود ہی ہم سے کہا تھا کہ آپ کو ان کی طبیعت کی ناسازی کا علم تھا لیکن آپ نے احساس فرض کے آگے شخصی مراعات کو نظر انداز کر دیا۔ آپ کی یہ بات نہایت قابل قدر ہے اور مجھے آپ کی حیرت انگیز محنت ہمیشہ یاد رہے گی۔

مگر اجازت ہو تو اس سلسلے میں یہ عرض کروں کہ گو میں ایسے خطے کا رہنے والا ہوں جو استوائی[1] علاقے سے ملا ہوا ہے اور جہاں کی آب و ہوا کے متعلق خیال ہے کہ وہ انسان کو آرام طلب بنا دیتی ہے لیکن شاید وہاں میں آپ کا مقابلہ محنت اور مشقت میں کر سکوں۔ مگر یہ کوئی بات نہیں۔ اگر آپ کی کل کی محنت آپ کی کارکردگی کا محض ایک نمونہ ہے، اگر آپ چوبیس گھنٹے مسلسل کام کر سکتے ہیں، جس کا موقع دار العوام میں کبھی کبھی پیش آتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آپ مجھ پر سبقت لے جائیں گے۔

---

[1] equatorial یعنی خط استوا کے قریب کا۔

آپ کی راہ اور ہماری راہ اور

ان وجوہ کی بنا پر میں نہایت خوشی کے ساتھ شکریے کی تحریک پیش کرتا ہوں مگر ایک وجہ ان سب سے بڑھ کر ہے کہ میں اس ذمہ داری کو قبول کروں اور جو عزت مجھے بخشی گئی ہے اس کی قدر کروں۔ ایک حد تک اس کا امکان ہے (میں خاص کر کے ایک حد تک کہتا ہوں کیونکہ ابھی میں آپ کا اعلان ایک بار دو بار، تین بار، غرض جتنی مرتبہ ضرورت ہو گی پڑھوں گا اس کے ایک ایک حرف پر ایک ایک نقطے پر غور کروں گا اگر اس کے کوئی پوشیدہ معنی ہیں تو انھیں سمجھوں گا اور اگر اس کے بعد بھی میں اسی نتیجے پر پہونچا جس کا اس وقت احتمال ہے تو اس صورت میں یہ ہو گا) کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری راہ آپ کی راہ سے جدا ہو جائے۔

اس وقت ہمیں اس سے غرض نہیں کہ میری آپ کی راہ ایک ہے یا الگ الگ ہے۔ آپ کا حق ہے اور میرا فرض ہے کہ میں تہ دل سے آپ کے شکریے کی تحریک پیش کروں۔ اس زندگی میں ہمیں یہ بات ہمیشہ نصیب نہیں ہوتی کہ اگر ہم ایک دوسرے کی رائے کی وقعت کرتے ہیں تو ہم میں اتفاق رائے بھی ہو۔ اس کی توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے خیالات کا پورا پورا لحاظ رکھیں گے، ہمیشہ مصالحت پر آمادہ رہیں گے خواہ ہمیں اپنے اصولوں سے دست بردار ہونا پڑے۔ اس کے برعکس فطرت انسانی کی شان یہ ہے کہ ہم زندگی کے طوفانوں کا مقابلہ کریں اور اس میں کبھی کبھی حقیقی بھائیوں کو الگ الگ راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپس کی مخالفت کے ختم ہونے کے بعد وہ یہ کہہ سکیں کہ ہمارے دل میں ایک دوسرے کی طرف سے بغض نہیں تھا۔ اور لڑائی میں بھی ہمارا طرز عمل

شریفانہ اور سچا ہیا نہ رہا۔ اگر میں آخر میں اپنے اور اپنے ملک کے متعلق اور جناب
وزیراعظم آپ کی اور آپ کے ملک کی نسبت یہ بات کہہ سکوں کہ گویا ہماری
راہوں کا الگ ہونا مبارک ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری راہ کدھر جائے گی۔
خیر وہ کسی طرف جائے اس کا رُخ آپ کی راہ کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ بہر
حال آپ اس کے مستحق ہیں کہ میں تہ دل سے آپ کے شکریہ کی تحریک پیش کروں ۔

حصۂ دوم

سات سمندر پار سے

(۱)

میگھانی کا پیام آخری لمحے تک معاملہ ڈانواں ڈول تھا۔ گاندھی جی کے جہاز میں سوار ہونے سے پہلے کسی کو یقین نہ تھا کہ وہ جا رہے ہیں۔ انگلو انڈین اخباروں کے شملے کے نامہ نگار خوش ہوئے کہ خدا خدا کرکے یہ امن میں خلل ڈالنے والا یہ بیڈھب آدمی جس نے ناک میں دم کر رکھا تھا یہاں سے ٹلا۔ یہی جذبہ حکام کے دل میں موجزن تھا۔ ہر وقت کی نگرانی ایسی چیز ہے کہ جسے ارباب حکومت کبھی برداشت نہیں کر سکتے اور گاندھی جی کی زندگی کا سہارا۔ یہی ہر وقت کی نگرانی یہی دائمی احتساب ہے۔ مگر کوئی یہ سمجھے کہ گاندھی جی چند ہفتے کے لئے یہاں سے چلے جائیں گے تو اس نگرانی میں کمی ہو جائے گی سچ پوچھئے تو ۲۷ اگست کا خط ہوم سکریٹری کے نام، جو اب تصفیہ ثانی[1] کا ایک جزو بن گیا ہے، کانگریس کی طرف سے اسی نگرانی کا وعدہ ہے اور گاندھی جی کی طرف سے اس بات کا اظہار ہے کہ اگر وہ انگلستان گئے تو اس ڈر سے لرزتے ہوئے جائیں گے کہ نہ جانے ہندوستان میں کیا ہوا کیا نہ ہو۔

جب راجپوتانہ جہاز بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہوا تو گاندھی جی کی خدمت

---

[1] وہ تصفیہ جو اگست ۱۹۳۱ء میں لارڈ ولنگڈن اور مہاتما گاندھی کے درمیان ہوا۔

میں بہت سے تار پیش کئے گئے۔ ان میں سے ایک وائسرائے کی طرف سے تھا بہت سے دوستوں اور رفیقوں کے تھے جن میں سلامتی سے پہنچنے اور خیر و خوبی سے واپس آنے کی دعا تھی اور یہ وعدہ تھا کہ آپ کی غیر موجودگی میں کانگریس کا جھنڈا لہراتا رہے گا۔ دو تاروں میں بڑی تہ کی بات تھی۔ ایک میں تھا "خدا آپ کی راہ نورِ ہدایت سے روشن کرے"۔ دوسرے میں تھا "آپ جیتے تو بہت کچھ جیتیں گے، ہارے تو بہت کچھ ہاریں گے۔ خدا کرے آپ کی جیت ہو" مگر ایک تار میں خود گاندھی جی کے قول کے مطابق ان کی حالت کی صاف اور سچی تصویر تھی۔ یہ گجراتی زبان میں ایک رخصتی نظم تھی ہمارے نوجوان شاعر میگھانی کی۔ انگریزی میں اس کے نغمۂ شیریں اور اس کے روحانی کیف کو ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پچھلے پندرہ دن میں یعنی ۱۳ اگست کو گفت و شنید کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد سے گاندھی جی کی دل کی تہ میں جو جذبات و خیالات تھے اسے شاعر کے وجدان نے آنکھ سے دیکھا تھا۔ شاعر کے الفاظ کا مفہوم یہ تھا "آپ نے اپنی عمر میں بہت سے کڑوے گھونٹ پیئے ہیں۔ جائیے اب یہ زہر کا آخری پیالہ بھی پی لیجئے۔ آپ نے سچ سے جھوٹ کا، محبت سے نفرت کا، کھرے پن سے کھوٹ کا سرمیدان مقابلہ کیا ہے۔ آپ نے سخت سے سخت دشمن کی طرف سے بھی بے اعتباری روا نہ رکھی۔ جائیے جو کڑوے سے کڑوا گھونٹ آپ کو پینا پڑے پی ڈالیے۔ ہماری مصیبتوں کے خیال سے قدم نہ روکئے۔ (یہی زمانہ تھا کہ چاٹگام کی خبریں آہستہ آہستہ آرہی تھیں)۔ آپ نے ہمیں ہنسی خوشی تکلیفیں سہنا سکھایا ہے۔ ہمارے نرم دلوں کو فولاد کی طرح مضبوط کر دیا ہے، آپ خالی ہاتھ بھی لوٹے تو کیا برا ہے۔ خود آپ کا جانا ہی بھلائی کا باعث ہوگا جائیے اور انسانوں کو محبت اور برادری کا پیام پہونچائیے۔ انسانوں کے

دل زخموں سے چور اس مرہم کے لئے تڑپ رہے ہیں جسے وہ جانتے ہیں، آپ اپنے ساتھ لائیں گے۔

ہمارا سامان سفر گاندھی جی نے ایک دوست کو تار دیا کہ سب سے نیچے درجے کی پانچ جگہیں ہمارے لئے محفوظ کرلیں۔ سب سے نیچا اس جہاز میں دوسرا درجہ تھا اس لئے ہمیں دوسرے درجے میں سفر کرنا پڑا۔ مگر گاندھی جی کو جیسے ہی دم لینے کی فرصت ملی ان کی تیز نظروں نے ہماری کیبنوں[1] کے سامان کی تلاشی لینا شروع کی۔ انھوں نے کہا اسے خوش قسمتی سمجھئے کہ آپ لوگ دوسرے درجہ میں سفر کررہے ہیں اگر کہیں عرشے پر سفر کرتے تو یہ چھکڑوں بھر سامان کس کے سنبھالے سنبھلتا۔ ہم لوگوں نے طرح طرح کے عذر پیش کئے۔ کسی نے کہا وقت بہت کم تھا، ہمیں چند گھنٹوں کے اندر تیاری کرنا پڑی۔ کسی نے کہا ہم نے یہ سوٹ کیس مانگ لئے ہیں۔ گھر پہنچتے ہی انھیں واپس کردیں گے۔ ایک صاحب بولے، دوستوں کے پاس جو فاضل چیزیں تھیں وہ انھوں نے زبردستی ہمارے حوالے کردیں، ہم کیا کرسکتے تھے۔ ایک نے فرمایا ہمیں تو کچھ معلوم نہیں تھا جو دوست واقف کار تھے انھوں نے رائے دی کہ فلاں فلاں چیزیں رکھ لو۔ ہمارے پاس وہی چیزیں ہیں جو انھوں نے بتائی تھیں۔

ان عذروں نے معاملے کو اور خراب کردیا۔ گاندھی جی سمجھے کہ ہم یہ توجیہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیش کررہے ہیں۔ ان کے دل پر یہ بات تیر کی طرح لگی کہ ملک کے غریبوں کا وکیل ایسے ایسے قیمتی سوٹ کیس چاہے وہ تحفے کے ہوں یا مانگے کے، لے کر جائے۔ ہم میں سے ہر شخص پر خوب ڈانٹ

---

[1] Cabins جہاز کے اندر رہنے اور سونے کے کمرے۔

پڑی"۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تیاری کے لئے وقت نہیں تھا۔ بجائے اس کے کہ جو کچھ ہاتھ لگا تم لوگوں نے لے کر رکھ لیا تم دوستوں سے کہتے کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں اور جیرا جبنی کے کھادی گودام سے دو چار سوتی اور اونی چیزیں لے لیتے۔ مگر تمھیں تو جو کچھ ملا تم نے شوق سے لے لیا۔ گویا تمھیں، انگلستان میں کوئی پانچ برس رہنا ہے۔ میں نے تم سے کہا کہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جن چیزوں کی ضرورت ہو وہاں لے لیں اور واپسی کے وقت غریبوں کو دے ڈالیں۔ مانا کہ تم نے سب سوٹ کیس واپس کرنے کا وعدہ کر لیا ہے مگر اس سے کیا تمھارا قصور کم ہو گیا؟ اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ تم انھیں، ہمیشہ رکھو گے۔ لیکن تمھارا اتنے بہت سے چمڑے کے صندوقوں کا قبول کرنا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمھارے دل میں غریبی اور ترک ملکیت کا کیا تصور ہے تم کہتے ہو کہ ان میں سے بعض چیزیں پرائی ہیں اور دوستوں کے پاس بیکار پڑی تھیں۔ یا تو تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو یا مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ اگر یہ چیزیں بیکار تھیں تو ان دوستوں نے پھینک کیوں نہ دیں۔ اگر تم ان کی ضرورت نہ ظاہر کرتے تو وہ تمھیں ہرگز نہ دیتے۔ یہ بھی مہمل بات ہے کہ تم نے واقف کار لوگوں کے مشورے پر عمل کیا اگر ان کی رائے پر چلنا تھا تو انھیں کے ساتھ رہتے۔ یہاں تم میرے ساتھ ہو تو تمھیں وہ کرنا چاہئے جو میں کہوں"۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ ہم لوگ سمندر کے سفر کو سہنے کے لئے غیر معمولی طور پر موزوں ثابت ہوئے تھے۔ لیکن یہ سرزنش ایسی تھی کہ انسان کے سر میں خود بخود چکر آنے لگے۔ ایک تدبیر ہماری سمجھ میں آ گئی اور اب یہی بہترین تدبیر تھی کہ ضروری اور غیر ضروری چیزوں کی الگ الگ فہرست بنا لیں اور غیر ضروری چیزیں عدن سے واپس کر دیں۔

چنانچہ اب ہم اسی میں لگ گئے۔

یہ اتنا کام تھا کہ پہلے تین دن اسی میں صرف ہو گئے اور چوتھے دن ہماری فہرستیں معائنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ گاندھی جی نے کہا میں تمہاری فہرستوں میں دخل نہیں دوں گا اگرچہ میرا جی یہی چاہتا ہے کہ تمہیں لندن کی گلیوں میں اسی حالت میں پھرتے دیکھوں جیسے تم شملے میں پھرا کرتے تھے۔ اگر تم شملے میں دھوتی کرتا اور چپل پہن کر سب جگہیں جا سکتے ہو، تو یقین مانو کہ لندن میں بھی یہ ممکن ہے۔ اگر میں دیکھوں کہ تمہارے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں تو میں خود تمہیں آگاہ کر دوں گا۔ اور تمہارے لئے اور اونی کپڑے خرید لوں گا۔ مگر تمہیں کوئی چیز اس خیال سے نہ تو پہننا چاہیئے اور نہ ساتھ رکھنا چاہیئے کہ اگر یہ نہ ملا تو وہاں کے لوگ دیکھ کر چونکیں گے۔ یقین مانو کہ وہاں کے لوگ اگر چونکیں گے تو یہ دیکھ کر کہ تمہارے پاس یا میرے پاس اس ٹھاٹھ کے سوٹ کیس ہیں۔ ایک چمڑے کے تھیلے کی طرف جو ہمیں ایک کارخانے نے تحفے میں دیا تھا، اشارہ کر کے فرمایا "اگر ہندوستان میں کھادی کے تھیلے سے تمہارا کام چل جاتا ہے تو انگلستان میں کیوں نہ چلے گا اور کیا تمہارے خیال میں لوگ وہاں ایسے نفیس تھیلوں میں اپنے کاغذات رکھتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ایسے تھیلے شاید تمہیں لمبارڈ اسٹریٹ کے دولتمند صرافوں یا تاجروں کے ہاتھ میں نظر آئیں یا بڑے بڑے مدبران میں اہم سرکاری کاغذات رکھ کر لے جاتے ہوں لیکن تمہارے ہاتھوں میں تو یہ بہت ہی بے تکے معلوم ہوں گے۔ ایک دوست نے ہمیں ایک ؟ دی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب یہ اس سیدھے سادے معیار سے جانچی گئی کہ ہمیں کوئی ایسی چیز ساتھ نہیں رکھنا چاہیئے جو معمولی طور پر ہمارے مقدور میں نہ ہو تو اس کا بھی وہی انجام ہوا۔ مگر اس قسم کی چیزوں پر خوب ہنسی ہوتی

تھی اور گاندھی جی کا غصہ کم ہو جاتا تھا۔ ایک دوست نے ایک امریکہ کا بنا ہوا سفری پلنگ دیا تھا کہ گاندھی جی عرشے پر استعمال کر سکیں۔ گاندھی جی نے اُسے دیکھ کر کہا "اچھا! یہ سفری پلنگ ہے۔ میں سمجھا ہاکی کے ڈنڈے ہیں۔ ہٹاؤ ان ہاکی کے ڈنڈوں کو۔ تم نے مجھے کبھی ایسی چیزیں استعمال کرتے دیکھا ہے؟ اس وقت اتفاق سے شعیب قریشی صاحب ہمیں اس مصیبت سے نجات دینے کے لئے پہونچ گئے۔ گاندھی جی نے فوراً ان کی طرف مخاطب ہو کر خوش مزاجی سے کہا "بھئی شعیب۔ اگر نواب صاحب کے ساتھیوں میں سے کسی کو کشمیر کی شال کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہنا۔ جس دوست نے مجھے یہ سات سو روپے کی قیمتی باریک شال جو چھلّے میں سے گذر جاتی ہے بھیجی تھی اس نے شاید یہ خیال کیا ہو گا میں اسے اوڑھ کر گول میز کانفرنس میں یہ دکھانے جاؤں گا۔ کہ میں ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کا کیسا اچھا نمائندہ ہوں! بیگم صاحب سے کہو کہ مجھے اس بیش قیمت ملک سے نجات دیں اور اس کے عوض مجھے سات ہزار روپیہ دیدیں جو غریبوں کے کام آئے۔ غریبوں کا تنہا نمائندہ اس کے سوا اور کیا کرے۔

گاندھی جی کی سرزنش کا بے جا نہ ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ اس کاٹ چھانٹ کے بعد سات سوٹ کیس اور کیبن ٹرنک بیکار سمجھ کر الگ کر دیئے گئے کہ عدن سے واپس بھیج دیئے جائیں۔

سب سے اچھی طرح سمندر کا سفر سہنے والا	سمندر پر شور ہے اور بہت سے لوگ ابھی تک اس قابل نہیں ہیں

کہ گاندھی جی سے اچھی طرح گفتگو یا بحث کر سکیں۔ غالباً ان سے اچھا سمندر کا سفر سہنے والا راجپوتانہ جہاز پر کوئی شخص نہیں انھوں نے اپنے لئے دوسرے درجے

کے عرشے کا ایک کونا منتخب کر لیا ہے جہاں وہ دن کا اکثر حصّہ اور ساری رات بسر کرتے ہیں۔ ایک دن برلا جی نے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ نے یہ جگہ خاص کر کے چھانٹی ہے کہ ہم سب ڈر کر بھاگ جائیں۔ ہمیں یہاں پرار تھنا کے لئے چند منٹ بیٹھنا پڑتا ہے تو ایک مصیبت ہو جاتی ہے۔"

مگر ہندوستانی مسافروں میں سے بہت سے اب سردی اور وران سے نجات پاتے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کل شام کو ہماری پرار تھنا میں ۲۲ آدمی حاضر تھے۔ گاندھی جی نے اپنے کسی معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر اٹھتے ہیں اور قریب قریب اتنا ہی کام کر لیتے ہیں جتنا ہمیشہ کرتے تھے۔

جہاز کے افسر

مجھے اعتراف ہے کہ جہاز کے افسر نہ صرف گاندھی جی کے ساتھ بلکہ ہم سب کے ساتھ جو کھادی کے کرتے اور دھوتی اور کھادی کی ٹوپیاں پہنے سارے جہاز پر پھرا کرتے ہیں۔ غیر معمولی طور پر شائستگی اور اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں۔ رنگ کا تعصب اور نسل کی تفریق جس کی اکثر پی اینڈ او کے ہندوستانی مسافر شکایت کیا کرتے ہیں۔ اس جہاز پر کم سے کم اس سفر میں کہیں نظر نہیں آتی۔

(۴)

عدن پہلی بندرگاہ جہاں جہاز ۱۶۶۰ میل کے کٹھن سفر کے بعد ٹھہرتا ہے۔ عدن ہے جو بمبئی کے عین مغرب میں واقع ہے۔ یہ شہر آتش فشاں پہاڑیوں کے علاقے میں بسا ہوا ہے (چنانچہ وسط شہر کو اب تک آتش فشاں کا دہانہ کہتے ہیں) اور مسافروں کو جہاز پر سے شہر کے آس پاس کی ننگی پہاڑیاں انگاروں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر صدیوں تک مختلف سرداروں کی حکومت رہی ہے۔ ۱۸۳۹ء میں جب یہ برطانیہ کے قبضے میں آیا تو ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی ۶۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔ اگر اس کی تسخیر کے صحیح حالات معلوم ہوتے تو ایک دلچسپ داستان ہوتی اور شاید انیسویں صدی کے متعدد کارناموں میں جو شہنشاہی پرست غارتگروں نے انجام دیئے ایک اور اضافہ ہو جاتا۔ برطانیہ کے مدرسوں میں لڑکوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ سلطان نے سالانہ رقم کے معاوضے میں عدن ہمارے حوالے کر دیا تھا لیکن اس نے عہد شکنی کی اور ایک برطانوی جہاز کو لوٹ لیا جس کی وجہ سے قلعے پر حملہ کرنا پڑا۔ اور ۱۸۳۹ء میں اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ بحر احمر کی، جو دنیا کی اہم ترین بحری شاہراہوں میں سے ہے حفاظت ضروری تھی اور اس کی صرف یہی صورت تھی کہ ایک بھاری فوج عدن میں اور جزیرہ پیرم میں رکھی جائے جو عدن سے سو میل آگے مغرب کی طرف واقع ہے اور جس کی حفاظت اس قدر سختی سے کی جاتی ہے کہ عدن کے ریزیڈنٹ کی جب تک اجازت نہ ہو کوئی شخص وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔

اب عدن کی آبادی ۵۴۰۰۰ ہے جس میں ۳۱۰۰۰ عرب ہیں ۶۵۰۰

سمالی ہیں اور ۵۰۰۰ ہندوستانی جو زیادہ تر گجراتی یا بمبئی کے کچھی ہیں۔
یہ شہر ۹۲ برس سے بمبئی کی حکومت کے ماتحت ہے اور اب یہ تجویز ہے کہ حکومت ہند
کی ماتحتی میں منتقل کر دیا جائے۔ عدن کے ہندوستانی اس کی مخالفت کر رہے ہیں،
جس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہاں کے اکثر باشندے بمبئی سے آئے ہیں اور وہاں تجارتی
تعلقات رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر بمبئی کو خود اختیاری حکومت ملے، جو اب
یقینی بات ہے، تو عدن اس کے فائدے سے محروم نہ رہے۔ پھر ایک اور سبب
بھی ہے کہ اگر عدن مرکزی حکومت کے ماتحت رہا تو اغلب یہ ہے کہ وہ غیر آئینی
یا نیم فوجی علاقہ قرار دیا جائے گا اور عمومی زندگی[ل] کا خاتمہ ہو جائے گا۔

قومی جھنڈا ہندوستانی لوگ چاہتے تھے کہ گاندھی جی اور گول میز کانفرنس
کے اور ممبروں کا خیر مقدم کریں مگر رزیڈنٹ نے کہا کہ اگر تم
قومی جھنڈا نصب کرنے پر اصرار کرو گے تو میں ان لوگوں کے آنے کی اجازت نہیں
دوں گا۔ یہ بیچارے اسی بات پر زیادہ زور نہیں دے سکے یہاں تک کہ خود گاندھی
جی نے فرامرز کاؤس جی ڈنشا صاحب کو یہ رائے دی کہ رزیڈنٹ کو ٹیلیفون
کریں کہ گاندھی جی ان شرائط پر سپاسنامہ ہرگز قبول نہیں کریں گے اور اس سے
یہ کہیں کہ حکومت ہند اور کانگریس میں آج کل صلح ہے اس لئے حکومت کو اور
کچھ نہیں تو صلح کے خیال سے قومی جھنڈے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔
یہ دلیل کارگر ہوئی اور رزیڈنٹ نے ناگوار صورت حال سے بچنے کے لئے
یہ اجازت دے دی کہ جس جگہ گاندھی جی اہل شہر کا سپاسنامہ قبول کریں،
وہاں ہندوستانی جھنڈا نصب کیا جا سکتا ہے۔
ایک بات جس پر میں نے غور کیا یہ تھی کہ گو انتقال حکومت کے مسئلے کا کچھ

[ل] Public life

دن سے بڑا زور شور رہے لیکن گاندھی جی کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا
گیا اس میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا اس کا بجز اس کے اور کوئی سبب سمجھ میں
نہیں آتا کہ لوگ حکام سے ڈرے ہوئے تھے۔ پھر بھی چند نوجوانوں نے کانگریس
کی اس آگ کی جو بمبئی میں روشن ہے، کچھ چنگاریاں عدن پہنچا دی ہیں
اور گجراتیوں کی بدولت جو قومی تحریک سے باخبر معلوم ہوتے ہیں، سفید موٹے
کپڑے کثرت سے نظر آتے تھے۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سچ مچ کھادی
کے تھے یا نہیں۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاکر گاندھی جی نے لوگوں کو کانگریس کا پیام پہنچایا
اور چونکہ ان کے استقبال میں عرب بھی شریک تھے چنانچہ سپاس نامہ گجراتی اور
عربی دونوں زبانوں میں پڑھا گیا تھا اس لئے انھیں عربوں سے خطاب کرنے
کا موقع بھی مل گیا۔

سپاس نامے کے جواب میں اور ۳۲۸ گنی کی نذر کے شکریے میں گاندھی جی
نے کہا:۔ "آپ حضرات نے میری جو عزت افزائی فرمائی ہیں اس کا شکریہ ادا
کرتا ہوں۔ اصل میں یہ کانگریس کا اعزاز ہے جس کی نمائندگی گول میز کانفرنس
میں میں کرنے والا ہوں۔ مجھے یہ خبر پہنچی کہ آپ کی کارروائی میں قومی جھنڈے
کے سبب سے کچھ دقتیں پیش آگئی ہیں۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہندستانیوں
کا کوئی جلسہ، خصوصاً ایسا جلسہ جس میں لیڈر بلائے گئے ہوں، بغیر قومی جھنڈے کے
کیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے قومی جھنڈے کی لاج رکھنے
کے لئے لاٹھیاں کھائیں اور بعض نے اسی بات پر جان دے دی اور آپ کسی
ہندوستانی لیڈر کا اعزاز بغیر قومی جھنڈے کی عزت کے کر ہی نہیں سکتے۔ پھر آج
کل حکومت میں اور کانگریس میں صلح ہے۔ کانگریس حکومت کی دشمن نہیں ہے

بلکہ درست ہو گئی ہے۔ اس لئے قومی جھنڈے کی محض اجازت دے دینا یا اسے گوارا کر لینا کافی نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جہاں کہیں ہندوستانی نمائندے بلائے جائیں وہاں یہ جھنڈا خاص امتیاز کے ساتھ نصب کیا جائے۔"

ہندوستان اور دنیا کا امن

میں آپ کو کانگریس کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ وہ ایسی علیحدگی اور آزادی نہیں چاہتی جو دنیا کے امن کے لئے خطرہ بن جائے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر ہندوستان، جس کے اندر نوع انسانی کا پانچواں حصہ آباد ہے، عدم تشدد اور حق پرستی کے ذریعہ آزاد ہو گیا تو یہ سارے ہی نوع کی خدمت کے لئے ایک بہت بڑی قوت ہو گی۔ برعکس اس کے آج یہ ہندوستان جسے اپنی حکومت میں کوئی دخل نہیں، دنیا کے لئے ایک خطرہ ہے۔ یہ ایک بے دست و پا ملک ہے جس کی وجہ سے دوسری قوموں کے دل میں حرص اور رقابت پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے لوٹ کر زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن جب ہندوستان میں یہ بات پیدا ہو جائے گی کہ وہ لوٹے جانے پر راضی نہ ہو، اپنی حفاظت آپ کر سکے، اپنی آزادی عدم تشدد اور حق کے ذریعے حاصل کرے، تو وہ ایک امن کی قوت بن جائے گا اور ہماری پرشور دنیا میں صلح و آشتی کی فضا پیدا کر دے گا۔"

عربوں سے خطاب

"اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ اس جلسے کے کرنے میں عرب اور دوسری قوم کے لوگ بھی ہندوستانیوں کے ساتھ شریک ہوں۔ ان سب لوگوں کو جو امن کے طالب ہیں، مل جل کر دائمی امن قائم کرنا چاہیئے۔ یہ عظیم الشان جزیرہ نما جو حضرت محمدؐ اور اسلام کا مولد ہے ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے کہ ہمارا گھر وہ گھر ہے جس میں

آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ ہم بزدلی اور خوف کے مارے ایک دوسرے کا گلا دبوچتے ہیں۔ ہندو بزدلی اور خوف کے سبب سے مسلمان سے ڈرتا ہے اور مسلمان بھی بزدلی اور خیالی خوف کی وجہ سے ہندو سے گھبراتا ہے۔ اسلام نے اپنی ساری تاریخ میں بہادری اور امن پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے ڈرنا کوئی فخر کی بات نہیں۔ اسی طرح ہندوؤں کے لئے بھی یہ فخر کی بات نہیں کہ وہ مسلمانوں سے ڈریں چاہے ان مسلمانوں کی پشتی پر ساری دنیا کے مسلمان کیوں نہ ہوں۔ کیا اب ہم اتنے گر گئے ہیں کہ اپنے سائے سے بھی بھڑکتے ہیں؟ آپ لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ پٹھانوں سے ہماری صلح ہے انھوں نے پچھلی لڑائی میں ہمارا ساتھ دیا اور اپنے نوجوانوں کو آزادی کی راہ میں قربان کر دیا۔ میں آپ لوگوں سے جو پیغمبر اسلام کے ہم وطن ہیں درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہندوستان کے اندر ہندو مسلمانوں میں صلح کرانے میں مدد دیجئے۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ آپ کس طرح مدد دیجئے مگر یہ کہے دیتا ہوں جب ارادہ پکا ہو تو راہ نکل ہی آتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ عربستان کے عرب یہ صورت حال پیدا کرنے میں ہماری دستگیری اور مدد کریں کہ مسلمان ہندو کی اور ہندو مسلمان کی مدد کرنا اپنی آن سمجھنے لگیں۔"

اس کے بعد میں آپ کو بس یہ پیام پہنچانا چاہتا ہوں کہ اپنے گھروں میں کتائی اور بنائی کا کام شروع کر دیجئے۔ آپ کے بعض خلفا کی زندگی سادگی کی تصویر تھی اور اگر آپ اپنا کپڑا خود بنائیں تو اسلام کے اصول کے مطابق اس میں کوئی ذلت کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ شراب نوشی کا مسئلہ ہے جو آپ کے نزدیک تو اور بھی بری چیز ہے۔ آپ کے شہر میں تو شراب کا ایک قطرہ بھی نہ ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ یہاں اور قومیں بھی رہتی ہیں اس لئے عربوں کو یہ کرنا پڑے گا کہ دوسروں

کو سمجھا بجھا کر عدن میں شراب نوشی بند کرائیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہمارے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ گہرے اور اچھے ہو جائیں گے۔"

سر راہ پیام سلام | چاہے آپ بیچ سمندر میں کیوں نہ ہوں پھر بھی بیرونی دنیا سے تعلق باقی رہتا ہے اور لاسلکی خبریں نہ صرف ساحل سے جہاز میں بلکہ ایک جہاز سے دوسرے میں پہنچتی رہتی ہیں چنانچہ ہمیں بڑی حیرت اور خوشی ہوئی کہ بمبئی سے روانگی کے تین دن کے اندر دوستوں کے بہت سے لاسلکی پیام پہنچے۔ "سٹی آف بڑودا" جہاز کے ہندوستانی مسافروں کا سلام اور "کراکویا" جہاز سے کئی پیام پہنچے۔ سب سے زیادہ تعجب اور مسرت اس پیام سے ہوئی جو بربرا کے ہندوستانیوں کی طرف سے آیا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ بربرا بھی کوئی جہاز ہے جس نے ہمیں سلام بھیجا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ بربرا خلیج عدن کے جنوبی ساحل پر برطانوی سالستان کا صدر مقام ہے اور ۱۸۸۴ء سے برطانیہ کی نگرانی میں ہے۔

بیگم زاغلول | اور اب جب کہ ہم سویز کے قریب پہنچ رہے ہیں ہر چند گھنٹے کے بعد قاہرہ کے ہندوستانیوں اور مصریوں کے پیام آتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر بیگم زاغلول کا یہ پیام ہے " اس مبارک موقعے پر جب ہندوستان کا قائد اعظم مصر کے سمندر سے گزر رہا ہے میں خلوص کے ساتھ سلام بھیجتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ ہندوستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو" میں یہاں ایک اور لاسلکی نقل کرتا ہوں جو مصر کے ممتاز اخبار البلاغ نے بھیجی تھی۔ "اخبار البلاغ آپ کی ذات کے واسطے سے ہندوستان کو سلام بھیجتا ہے اور کانفرنس میں ہندوستان کی پوری کامیابی کی دعا کرتا ہے۔"

City of Baroda ۵۱

جہاز پر گاندھی جی کے سب سے بڑے دوست ان انگریزوں کے جو اپنے وطن جا رہے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بچے نہ جنس کی تفریق کرتے ہیں نہ رنگ کی۔ چنانچہ ہمارے جہاز پر یہ تماشا اکثر دیکھنے میں آتا تھا کہ گاندھی جی بچوں کے کان کھینچ رہے ہیں یا پیٹھ ٹھونک رہے ہیں اور یہ لوگ ان کے صبح یا شام کے کھانے کے وقت ان کی کیبن کے دروازے میں اپنے چھوٹے چھوٹے سر ڈال کر جھانک رہے ہیں۔ عام طور پر ان سے پوچھا جاتا ہے "کھجور لوگے یا انگور؟" وہ خوشی خوشی انگور کی رکابی لے جاتے ہیں اور دم بھر میں خالی کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ کئی کئی منٹ تک حیرت اور مسرت کے ساتھ چرخے کے چکر کا تماشا دیکھا کرتے ہیں۔ ان دوستوں کا ذکر تفصیل سے میں کسی اور موقع پر کروں گا۔

چرخا گاندھی جی کے چرخے پر سب کی نظریں لگی رہتی ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ گو مرد اور عورت سب عمر بھر کپڑے پہنتے ہیں مگر انھیں روئی یا کتائی یا بُنائی سے کچھ بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ جب گاندھی جی اور میرا بین بیٹھ کر چرخا چلاتی ہیں تو لوگ عجیب عجیب سوال کرتے ہیں جن پر ہنسی آتی ہے لیکن چرخے سے جو دلچسپی پیدا ہوئی ہے وہ محض سطحی نہیں ہے۔ جہاز پر جو ہندوستانی نوجوان اعلےٰ تعلیم کے لئے انگلستان جا رہے ہیں وہ کتائی کے معاشی پہلو اور اس صنعتی دور میں چرخے کی حیثیت کے متعلق بہت سے سوال کیا کرتے ہیں۔ ان کی ناواقفیت پر اس لحاظ سے حیرت ہوتی ہے کہ اب تو کئی سال سے چرخا ملک کے سامنے موجود ہے۔

ہماری پرارتھنا[1] صبح کی پرارتھنا اتنے سویرے ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے لیکن شام کی پرارتھنا میں قریب قریب کل ہندوستانی (جن کی تعداد ۴۲ سے زیادہ ہے اور جن میں ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ، سبھی شامل ہیں) اور خال خال یورپی بھی شرکت کرتے ہیں۔ ان دوستوں میں سے بعض کی درخواست پر پرارتھنا کے بعد پندرہ منٹ تک، گفتگو بھی ہونے لگی ہے۔ ہر شام کو ایک سوال کیا جاتا ہے اور گاندھی جی دوسرے دن اس کا جواب دیتے ہیں۔ ہندوستانی مسافروں میں سے ایک نوجوان مسلمان نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ آپ اپنا ذاتی خیال عبادت کے متعلق بیان کیجئے۔ یہ کوئی نظری بحث نہ ہو بلکہ وہ واردات جو آپ کے قلب پر عبادت کے وقت گذرتی ہے۔ گاندھی جی اس فرمایش سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے بڑے ذوق وشوق سے اپنی ذاتی واردات بیان کرنا شروع کی۔ انھوں نے کہا "نماز ہی نے میری جان بچائی ہے اس کے بغیر میں کب کا مجنوں ہو گیا ہوتا۔ میری آپ بیتی پڑھیئے تو معلوم ہو گا کہ مجھے ذاتی اور عمومی دونوں طرح کی زندگی میں بہت سے تلخ سے تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ ان کے سبب سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے میرا جی چھوٹ گیا لیکن میں نے اپنے آپ کو محض عبادت اور دعا کے سہارے سے سنبھالا۔ یہ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ عبادت حق کی طرح میری زندگی کا جزو نہیں بن سکی ہے۔ اسے میں نے ضرورت سے زیادہ مجبور ہو کر اختیار کیا تھا کیونکہ میں ایسی روحانی کلفت میں مبتلا تھا کہ اس کے بغیر کسی طرح چین نہیں آسکتا تھا۔ جوں جوں میرا عقیدہ خدا کے بارے میں پختہ ہوتا گیا عبادت کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ جب تک

---

[1] دعا اور عبادت، نماز

عبادت نہ کروں زندگی بے لطف اور بے کار معلوم ہوتی تھی۔ میں جنوبی افریقہ میں عیسائیوں کی نماز میں شریک ہوا مگر ان سے میرے قلب میں کوئی کیفیت نہیں پیدا ہوئی۔ وہ خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتے تھے مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ کوشش سراسر ناکام ہوئی۔ ابتدا میں تو میں نہ خدا کو مانتا تھا اور نہ عبادت کا قائل تھا۔ ایک عرصے تک مجھے اس عقیدے کے بغیر اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اس زمانے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جسم کو غذا کی ضرورت ہے اسی طرح روح کو عبادت کی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو غذا جسم کے لئے اتنی ضروری نہیں جتنی عبادت روح کے لئے ہے کیونکہ جسم کی تندرستی کی خاطر اکثر فاقے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن عبادت کا فاقہ نہیں سنا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ عبادت کی زیادتی سے روح اکتا جائے۔ دنیا کے تین سب سے بڑے ہادیوں یعنی بودھ، مسیح اور محمدؐ کی سند موجود ہے کہ انھیں عبادت کے ذریعہ نور معرفت حاصل ہوا اور بغیر عبادت کے ان کو زندگی دوبھر تھی۔ اور دور کیوں جائیے آپ کو اپنے ہی ملک میں لاکھوں کروروں ہندو، مسلمان اور عیسائی ملیں گے جنھیں روزمرہ عبادت سے تسکین قلب حاصل ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یا تو یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں یا انھیں ان کا نفس دھوکا دیتا ہے۔ خیر اگر یہ زندگی کا سہارا جس کے بغیر مجھے دم بھر جینا دشوار ہے جھوٹ ہی ٹھہرا تو میرے جیسے طالب حق کو یہ جھوٹ بہت پیارا ہے۔ گو سیاسی مطلع پر مجھے اکثر مایوسی کا منظر نظر آتا ہے مگر میرے سکون قلب میں کبھی خلل نہیں پڑتا بلکہ بہت سے لوگ میرے اس سکون پر رشک کرتے ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سکون، عبادت کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ میں کوئی عالم نہیں ہوں مگر یہ میرا عاجزانہ دعویٰ ہے کہ میں عابد ہوں۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ عبادت کی شکل کیا ہو۔ یہ ہر شخص کے

اپنے ذوق پر موقوف ہے مگر بعض بنی بنائی راہیں پہلے سے موجود ہیں اور سلامتی اسی میں ہے کہ آدمی قدیم ہادیوں کے نقش قدم پر چلے۔ میں نے اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کر دیا۔ اب اس کا امتحان ہر شخص خود کر سکتا ہے کہ روز مرّہ عبادت کے ذریعے اس کے روحانی سرمایہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے"۔

دوسرے دن شام کو ایک اور نوجوان نے کہا "مشکل یہ ہے کہ آپ ابتدا خدا کے عقیدے سے کرتے ہیں اور ہم انکار سے ابتدا کرتے ہیں"۔

گاندھی جی نے کہا "تو بھائی خدا کا عقیدہ آپ کے دل میں پیدا کرنا تو میرے امکان میں نہیں۔ بعض باتیں اپنا ثبوت آپ ہوتی ہیں اور بعض میں ثبوت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ خدا کا وجود بھی ہندسے کے علوم متعارفہ[1] کی طرح ہے۔ میں عقلی ادراک کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس معاملے میں عقل کی سعی کم و بیش رائگاں جاتی ہے کیونکہ عقلی دلائل سے جتنا جی چاہے خدا پر عقیدہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ عقل کی وہاں تک رسائی نہیں وہ عقل کے ماورا ہے۔ بہت سے مظاہر ایسے ہیں جن سے خدا کے وجود پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔ مگر آپ ماشاء اللہ خود صاحب فہم ہیں۔ مجھے اس قسم کی عقلی توجیہوں کی ضرورت نہیں ہے تو آپ سے یہی کہوں گا کہ عقلی توجیہوں کو بالائے طاق رکھیئے اور بچوں کی طرح سیدھا سادا عقیدہ پیدا کیجئے۔ اگر میں ہوں تو خدا بھی ہے۔ میں تو اپنی وجہ وجود اسی کی ذات کو سمجھتا ہوں اور یہی حال اور کروڑوں آدمیوں کا ہے۔ چاہے وہ اسے الفاظ میں نہ ادا کر سکیں مگر ان کی زندگی شاہد ہے کہ یہ عقیدہ ان کی ہستی کی بنیاد ہے۔ میں آپ سے بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ اس فطری عقیدے کی طرف جو اب جا تا رہا ہے پھر رجوع کیجئے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بہت کچھ جو آپ نے سیکھا ہے جس نے آپ کی نظروں کو خیرہ

---

[1] Axioms

کر دیا ہے اور پیروں میں لغزش پیدا کر دی ہے بھول جائیے اس ایمان سے ابتدا کیجئے جو عاجزی کی نشانی اور اس کا اعتراف ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور کائنات میں ہماری ہستی ایک ذرہ سے بھی کم ہے۔ میں نے ذرے سے کم اس لئے کہا کہ ذرہ تو اپنے قانون حیات کا پابند ہے اور ہم اپنی جہالت کی خیرہ سری سے قانون فطرت کے منکر ہو گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا دل عقیدے سے خالی ہے ان کے لئے میرے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ البتہ اگر انسان خدا کے وجود پر ایمان لے آئے تو پھر عبادت کی ضرورت کا تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ یہ عجیب و غریب دعوٰے ہرگز درست نہیں کہ ہماری ساری زندگی عبادت ہے۔ اس لئے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ایک مقررہ وقت پر رسم نماز ادا کریں۔ بڑے بڑے بزرگوں نے بھی جن کی ذات وجود مطلق سے ہم آہنگ تھی، یہ دعوٰے نہیں کیا۔ ان کی زندگی واقعی مسلسل عبادت تھی۔ پھر بھی وہ شاید ہماری ہدایت کی خاطر مقررہ اوقات پر نماز ادا کرتے تھے اور روز خدا سے اپنا پیمان وفا تازہ کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خدا کو ہمارے عہد و پیمان کی حاجت نہیں مگر ہمیں چاہیئے کہ ہر روز اس کی تجدید کرتے رہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم ایسا کریں تو ہر بلا سے محفوظ رہیں گے۔"

ہم نے بحر قلزم میں شمال کے رخ ۱۲۰۰ میل طے کر لئے ہیں اور اب سویز پہونچنے والے ہیں۔

نحاس پاشا کا پیام ذیل کا پرجوش پیام نحاس پاشا صدر جمعیت وفد کی طرف سے پہنچا۔ یہ وہ جماعت ہے جو آجکل مخالف حکومت ہے اور مصر کی آزادی کے لئے جس کی راہ میں زاغلول پاشا لڑتے اور مارے گئے، جنگ کر رہی ہے:۔

راجپوتانہ جہاز

مصر کی طرف سے جو آج اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہا ہے میں آپ کا اس حیثیت سے استقبال کرتا ہوں کہ آپ اس ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما ہیں جو اسی مقصد کی خاطر جد و جہد میں مصروف ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ کا سفر سلامتی سے گزرے اور آپ کی واپسی خیر و خوبی سے ہو۔ خدا آپ کو اپنے مقصد میں ایسی کامیابی دے جو آپ کے عزم و استقلال کے شایان شان ہو۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی واپسی کے وقت مجھے آپ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوگا اور آپ فراعنہ کی سرزمین کو اپنے قدم سے عزت بخشیں گے اور جماعت وفد بلکہ ساری مصری قوم کو اس کے اظہار کا موقع دینگے کہ خواہ آپ کے سفر کا نتیجہ کچھ بھی ہو وہ آپ کے کارناموں کی جو آپ نے اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے لئے انجام دیئے ہیں، قدر کرتی ہے اور آپ کے عظیم الشان ایثار کو جو آپ نے اپنے اصول کی پابندی میں دکھایا ہے، احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے اور آپ کی سعی کے صلے میں زبردست اور دائمی فتح عطا فرمائے۔ سویز اور پورٹ سعید میں ہمارے نمائندے ہماری طرف سے زبانی سلام اور خیر مقدم کہیں گے"

مصطفےٰ النحاس پاشا صدر وفد

بیگم زاغلول کا پُر اثر پیام۔ البلاغ کا پرجوش خیر مقدم اور پھر نحاس پاشا کی لاسلکی یہ ہمارے لئے سہ گونہ نعمت ہے جس کی یاد ہمیں ہمیشہ عزیز رہے گی۔

خلیج سوئیز میں داخل ہونے کے چند گھنٹے کے بعد ہماری کشتی متعدد رہنما بینارد ں کے قریب سے گذری جنھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں اس سمندر میں جہاز رانی کس قدر دشوار ہو گی۔ خلیج کے جنوبی حصے میں کثرت سے چٹانوں کے سلسلے اور جزیرے ہیں اور آگے چل کر کوہ سینا کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ چند میل کے فاصلے پر اس نخلستان کے ہرے بھرے درخت نظر آتے ہیں جہاں حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے بحر قلزم کو عبور کر کے اور فرعون کے لشکر سے نجات پا کر جشن منایا تھا۔ خلیج سوئیز کے مشرقی کنارے کا چپہ چپہ ہمارے ملک کے تیرتھوں کی طرح ماضی کی داستانوں کا خزانہ ہے۔ بحر قلزم کے مشرقی ساحل کے پہاڑ ننگے اور ناہموار ہیں۔ اس سرزمین کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کے آغوش سے دنیا میں عظیم الشان مذہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کیونکر پیدا ہوئے۔ جب انسان یہ سوچتا ہے کہ ان مذاہب کی اصل ایک ہی تھی اور دنیا کے سارے مذاہب ایشیا ہی کی پاک سرزمین سے نکلے تو بڑی شرم آتی ہے کہ آج ان مذاہب کے پست فطرت پیرو ان کے جلیل القدر بانیوں کو اس قادر مطلق کو جس نے ان سب کو نور عرفاں عطا کیا تھا اس حد تک بھول گئے کہ انھیں ان سب عقیدوں کے اندر اتحاد کا کوئی نقطہ نہیں سوجھتا۔ جتنے پہلو نظر آتے ہیں وہ اس بات کے کہ ایک دوسرے سے اور اسی کے ساتھ خالق اکبر سے جُدا ہوتے جائیں۔

سوئیز / بحر قلزم سارے قرون وسطےٰ میں بہت بڑی تجارتی شاہراہ تھی یہاں تک کہ واسکوڈی گاما نے راس امید کا چکر لگایا اور ایک ایسی راہ ڈھونڈھ

نکالی جو محفوظ بھی تھی اور کم خرچ بھی۔ لیکن نہر سوئیز کے کھل جانے سے پھر بحر قلزم دنیا کی ایک اہم شاہراہ بن گئی۔ نہر سوئیز فرانس کے زبردست انجنیر فرڈینان دو لیسپ کا کارنامہ ہے۔ اس کا شاندار مجسمہ جس کا رنگ سمندر کے پانی کی مناسبت سے لاجوردی سبز ہے، بحر روم کے دہانے کے اندر ایک بندر پر واقع ہے اور ہر مسافر کی نظر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ نہر کے بننے میں دس سال لگے اور اس پر شرکت نہر سوئیز کے دو کروڑ ستانوے لاکھ پچیس ہزار پونڈ صرف ہوئے۔ اس میں سے نصف سرمایہ یورپ میں فراہم ہوا اور نصف خدیو نے لگایا۔ لیکن ۱۸۶۹ء میں نہر کا افتتاح ہونا تھا کہ برطانوی سامراج کی اشتہائے ملک گیری تیز ہو گئی۔ یہ نہر ہندوستان سے آمد و رفت کے لئے بہت اہم قرار دی گئی بلکہ یہ سمجھا جانے لگا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا دارومدار اس پر ہے کہ نہر سوئیز پر برطانیہ کا قبضہ ہو۔

آزاد مصر میں بیگم زاغلول پاشا اور مصطفےٰ نحاس پاشا صدر وفد کے پرجوش پیاموں کا ذکر پہلے ہی کر چکا ہوں۔ مصر کے اخباروں کے متعدد نامہ نگار گاندھی جی سے جہاز پر ملنے آئے اور نحاس پاشا کے نمائندے نے سوئیز اور پورٹ سعید دونوں جگہ ان سے ملاقات کی۔ قاہرہ کے ہندوستانی تاجروں کی طرف سے جو زیادہ تر سندھی ہیں ایک وفد سوئیز اور پورٹ سعید دونوں جگہ گاندھی جی کی خدمت میں آیا اس نے سپاسنامہ پیش کیا اور بہت اصرار کیا کہ واپسی میں قاہرہ ضرور تشریف لائیے گا۔ مجھے پورٹ سعید میں معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ گو ہندوستانی وفد کے گاندھی جی کی خدمت میں آنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا مگر حکام مصری وفد کو اجازت دینے کے خلاف تھے اور بڑی مشکل سے نحاس پاشا کے صرف ایک نمائندے کو اجازت ملی۔

اس سلسلے میں اگر مصر کی موجودہ حالت کا اختصار سے ذکر کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے اس کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میں مصریوں سے طویل گفتگو کر چکا ہوں اور جو کچھ ان پر گزرتی ہے اس کا مجھے اچھا خاصا اندازہ ہے۔ جابر حاکم کا طور طریق سب کہیں ایک سا ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر آپ کو کسی ملک کے عام حالات معلوم ہو جائیں تو جزوی بات کو آپ خود بخود سمجھ لیں گے یہ تو میرے خیال میں کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ مصر کو حقیقی آزادی حاصل ہے لیکن جو حالات مجھے معلوم ہوئے ان کا سان گمان بھی نہ تھا۔

باوجود مصری بادشاہ اور مصری وزیر ہونے کے مصر کی آزادی اتنی ہی محدود ہے جتنی ہندوستان کی ہے۔ زاغلول پاشا نے وہ جماعت قائم کی جو وفد مصری کہلاتی ہے اس کے صدر اب نحاس پاشا ہیں جو ایک زمانے میں زاغلول پاشا کے پرائیوٹ سکرٹری تھے اور کچھ عرصے وزیر اعظم بھی رہے ہیں لیکن برطانوی حکومت کو وفد کے مقاصد گوارا نہ تھے اور اسے شاہ فواد اور صدقی پاشا جیسے مل گئے جو خوشی سے اس کے آلہ کار بننے کو تیار تھے۔

نحاس پاشا برطانوی مجلس وزرا سے گفت و شنید میں ناکام رہے اور شاہ فواد نے پارلیمنٹ کو معطل کر دیا اور صدقی پاشا کو گویا مختار کل بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سال انتخابات کا پوری طرح مقاطعہ کیا گیا سارے ملک میں ہڑتال ہوئی اور بقول مصریوں کے تین بار "قتل عام" کی نوبت پہنچی۔

جو باتیں مجھ سے بیان کی گئیں ان کی تصدیق کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں مگر کہنے والوں نے کہا کہ جب ریل کے کارخانے کے مزدوروں نے ہڑتال کی، اور نعرہ لگایا "وفد کا بول بالا" تو ان پر سپاہیوں نے گولیاں چلا دیں۔ میں نے پوچھا۔ "کیا مزدور تشدد سے بالکل باز رہے؟" میرے مخاطب نے جواب دیا

ان کے پاس ہتھیار تو تھے نہیں مگر انھوں نے لوہے کے ٹکڑے اٹھا کر سپاہیوں پر پھینکے۔ ان سپاہیوں نے ۷۰ آدمی مار ڈالے اور ایک ہزار کے قریب زخمی کر دیے۔ یہ زخمی ہسپتال کے اندر بھی فوجی پہرے میں رکھے گئے اور جب اچھے ہو گئے تو انھیں ملزم قرار دے کر حکومت کے خلاف سیاسی مظاہرے کا مقدمہ چلایا گیا۔ موجودہ مجلس مقننہ میں حکومت کے پٹھو بھرے ہوئے ہیں اور ملک کا انتظام صدقی پاشا کے آدردوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے پوچھا "اخبارات کا کیا حال ہے"؟ اس کے جواب میں وہی سنا جو ہندستان میں دیکھا کرتے ہیں۔ بلکہ وہاں اس سے بھی بدتر صورت ہے۔ "ہمارے اخباروں کے مطبعوں میں پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ پروف کی پہلی کاپی اسے دکھانا پڑتی ہے اور اگر اس کے خیال میں مضمون قابل اعتراض ہے تو وہ پورے پرچے کو ضبط کر لیتی ہے۔" میں نے پوچھا "اور عام لوگوں کی کیا کیفیت ہے"؟ "طالب علم ہمارے ساتھ ہیں۔ عورتیں بھی بیگم زاغلول کی صدارت میں جو مصریوں کی ماں کہلاتی ہیں جد و جہد کر رہی ہیں اور اعتدال پسند یا لبرل پارٹی جو پہلے وفد کی مخالف تھی اب اس کی موید ہے۔ اس پارٹی کے صدر محمد محمود پاشا کو ایک بلوے میں زدوکوب کیا گیا تب سے وہ وفد کے بڑے حامی ہو گئے ہیں۔" پورٹ سعید میں ہمارے پاس جو تار پہنچے ان میں ایک محمود پاشا کا تھا اور ایک شریفہ ریاض پاشا کا جو عورتوں کی اس جماعت کی صدر ہیں جو سعد (زاغلول پاشا) سے منسوب ہے اگرچہ اخباروں کا بہت سخت احتساب ہوتا ہے پھر بھی ان میں سے بارہ اخباروں نے، جن میں سے تین کی روزانہ اشاعت چالیس ہزار سے پچاس ہزار تک ہے، گاندھی جی کے متعلق خاص مضامین لکھے دو اخباروں نے خاص نمبر نکالے اور نحاس پاشا، بیگم زاغلول پاشا، محمود پاشا وغیرہ کے تار تو سبھی نے چھاپے۔

کوئی تعجب نہیں کہ مصر بھی ہماری طرح برطانوی حکومت سے بیزار ہے۔ اور اس پر مُصر ہے کہ گاندھی جی واپسی میں وہاں تشریف لائیں۔ ہر شخص کی فرمائش تھی کہ بھارت ماتا کی طرف سے اس کی چھوٹی بہن مصر کے نام کوئی پیام دیجئے۔ اور گاندھی نے جتنے پیام بھیجے ان سب میں اس عظیم الشان ملک کو کامیابی کی دعا دی۔ ان سب کا خلاصہ یہ تھا کہ کیا اچھا ہو اگر مصر عدم تشدد کا اصول اختیار کرے۔ ایک انگریز اخبار نویس سے جو انھیں سوئیز میں ملا۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ "میں مشرق اور مغرب کا اتحاد دل سے پسند کروں گا بشرطیکہ اس کی بنیاد وحشیانہ قوت پر نہ ہو۔"

محبت کا قانون اس عرصے میں شام کی پرارتھنا کے بعد جتنی گفتگو ہوئی، سب عدم تشدد کے متعلق ہوئی اور ان مصری دوستوں کو بھی جو سوئیز سے جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ ایک اس قسم کی گفتگو سننے کا موقع ملا۔ ایک دن شام کو گاندھی جی نے فرمایا "جان بوجھ کر یا بے جانے ہوئے ہم روزمرہ ایک دوسرے کے ساتھ عدم تشدد سے پیش آتے ہیں۔ میں نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ زندگی ہلاکت کے درمیان قائم رہتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہلاکت کے قانون سے برتر ایک قانون موجود ہے۔ اسی قانون کے ماتحت منظم معاشرے کا وجود ممکن ہے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ جب قانون حیات یہی ٹھہرا تو ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں بھی اسی کی پابندی کرنا چاہیئے۔ جہاں کہیں کوئی نزاع پیش آئے، جب کبھی آپ کا کسی حریف سے مقابلہ پڑ جائے اس پر محبت کے ذریعے فتح حاصل کیجئے۔ میں نے بڑے بھلے طریقے سے اپنی زندگی میں اس قانون پر عمل کیا ہے۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ میری ساری مشکلیں حل ہو گئی ہوں۔ مگر یہ میں نے ضرور دیکھا، کہ

محبّت کے قانون سے جتنا کام چلتا ہے ہلاکت کے قانون سے ہرگز نہیں چلتا۔ ہندوستان میں ہم نے اس قانون کی عمل درآمد بہت بڑے پیمانے پر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ عدم تشدّد کا پیام تیس کروڑ آدمیوں تک پہنچ چکا ہے لیکن یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جتنی دور تک اتنے تھوڑے سے وقت میں یہ پیام پہنچا ہے اور کوئی آج تک نہیں پہنچا ہم سب مساوی حد تک عدم تشدد کے پابند نہیں رہ سکے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے یہ محض ایک طرزِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر بھی آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ملک نے عدم تشدد کے سایۂ عاطفت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا" عدم تشدد کی ذہنی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اچھی خاصی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اپنی روز مرّہ زندگی کا ضابطہ بنانا پڑتا ہے خواہ دل چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو۔ اس کی مثال سپاہی کی زندگی کی سی ہے۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ جب تک خود ہمارا دل سچے دل سے ساتھ نہ دے، خالی خولی ظاہری عمل محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس سے انسان خود بھی نقصان اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ کمال کا درجہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب دل اور جسم اور زبان میں جیسی چاہیے ویسی ہم آہنگی ہو۔ لیکن اس میں ہمیشہ سخت ذہنی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مجھے یہ نہیں کہ غصہ نہ آتا ہو مگر میں قریب قریب ہمیشہ اپنے جذبات کو ضبط کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو مگر میرے اندر ہمیشہ یہ کشمکش موجود رہتی ہے کہ ہر لحظہ اور ساعت اپنے ارادے سے عدم تشدد کے قانون پر عمل کروں۔ ایسی کشمکش سے انسان کی قوت بڑھتی ہے۔ عدم تشدد قوی کا حربہ ہے۔ کمزور کے عدم تشدّد میں تو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں بناوٹ نہ ہو۔ خوف اور محبّت میں تناقض ہے۔ محبّت جو دیتی ہے

آنکھ بند کرکے دیتی ہے ماسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ عوض میں کیا ملے گا محبّت ایک طرف ساری خدائی کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف خودی سے لڑتی ہے اور آخر میں کُل جذبات پر غالب آتی ہے۔ میرا اور میرے ساتھ کام کرنے والوں کا روز مرّہ کا تجربہ ہے کہ ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم جی میں ٹھان لیں کہ حق اور عدم تشدّد کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانا چاہیئے۔ کیونکہ حق اور عدم تشدّد میرے نزدیک ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

محبّت کا قانون کششِ ثقل کے قانون کی طرح اپنا عمل کرتا رہتا ہے خواہ ہم اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں جس طرح ایک سائنس داں قوانین فطرت سے مختلف طریقے سے کام لے کر جادو کے سے کرتب دکھاتا ہے وہ شخص بھی جو قانون محبّت سے علی صحت کے ساتھ کام لے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز کرشمے دکھا سکتا ہے کیونکہ عدم تشدد کی قوت فطرت کی مادّی قوتوں سے کہیں زیادہ عجیب اور پُر اسرار ہے۔ جن لوگوں نے ہمارے لئے محبت کا قانون دریافت کیا وہ آج کل کے سائنسدانوں سے بڑے سائنسداں تھے۔ البتہ ہماری تحقیق ابھی یہاں تک نہیں پہنچی کہ ہر شخص اس قانون کے عمل کا پورا مشاہدہ کرسکے۔ اگر اسے وہم کہئے تو میں تو اسی وہم میں مبتلا ہوں۔ جتنا میں اس قانون پر عمل کرتا ہوں اتنی ہی مجھے اپنی زندگی اور کائنات کی ترتیب خوشنما اور خوش گوار معلوم ہوتی ہے اس سے مجھے وہ سکون قلب اور اسرار فطرت کا وہ عرفان حاصل ہوتا ہے جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔

کریٹ پورٹ سعید سے روانہ ہونے کے بعد پہلی زمین جو نظر آتی ہے وہ جزیرہ کریٹ کا جنوبی کوہستانی ساحل ہے۔ یہ قدیم زمانے میں فنیقی تمدن کا مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جزیرہ بہت زرخیز اور اس کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔ ساحل اطالیہ کے قریب پہنچنے تک سمندر میں کسی قدر تلاطم رہا۔ شہر سوئیز سمندر سے

بہت خوبصورت نظر آتا تھا اور فرانسیسی افسروں کے یکساں مکانات جو نہر سوئیز کے
مغربی ساحل پر بنے ہوئے ہیں بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن اس منظر کو اس
شاندار مرقع سے کوئی نسبت نہ تھی جو نقاش فطرت نے خلیج میسینہ میں بنایا تھا۔ سمندر
جو اب گہرے لاجوردی رنگ کا ہو گیا تھا ایک پُرسکون جھیل کے مانند تھا جس پر ہمارا
جہاز خاموشی سے تیرتا چلا جا رہا تھا۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر دو ایک میل کے فاصلے
سے اطالیہ کے خوبصورت پہاڑ نظر آتے تھے۔ یہ ان پہاڑوں کی طرح جو ہمیں اب تک
ملے ننگے اور بے رونق نہیں تھے بلکہ سرو اور زیتون کے درختوں سے سر سبز تھے
اور ان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے خوبصورت قصبے واقع تھے۔ ریگیو یورپ کا پہلا
قصبہ تھا جو ہمیں صاف صاف نظر آیا۔ اس کے مقابل میں میسینہ واقع ہے جو اس سے
بھی زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ جب کشتی اس خلیج سے نکلتی ہے تو جی چاہتا ہے؛
کاش ہم حسن فطرت کے ان مناظر میں کچھ دیر اور ٹھہر سکتے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھے
سمندر اور ساکن ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ بہت دور پر پانی میں ایک جہاز کا جو
پوری رفتار سے جا رہا ہے، عکس نظر آتا ہے جسے دیکھ کر "نقشہ بحر میں نقش جہاز"
یاد آتا ہے۔

خدا جانے جب گاندھی جی نے یہ الفاظ کہے کہ "زندگی ہلاکت کے درمیان قائم
رہتی ہے" تو انھیں یہ خیال تھا یا نہیں کہ اس نکتے کا برعکس حکیمانہ قول پہلے سے موجود
ہے۔ "عین زندگی میں ہم موت کے منہ میں ہوتے ہیں"۔ گویا اس قول کے ثبوت میں
جزیرہ اسٹرومبولی آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے، جیسے بیچ سمندر میں ایک عظیم الشان
مستادون[1] بیٹھا ہو۔ یہ جلتا ہوا آتش فشاں پہاڑ ہے جو اس وقت تو گھنے بادلوں میں

---

[1] mastadon. ہاتھی کی قسم کا جانور جس کے سینہ میں دانت
ہوتے تھے۔ اب معدوم ہے۔

چھپا ہوا تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ جب بادل نہ ہوں تو اس میں سے شعلے اٹھتے ہیں اور پگھلا ہوا مادّہ اڑ کر دور تک پہنچتا ہے۔ یہ جان بوجھ کر کہ کسی دن یہ پہاڑ خوفناک طریقے سے زیادہ بڑے دائرے میں پھٹے گا اور آس پاس کی سب چیزوں کو آتشین مادّے میں غرق کردے گا، لوگوں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے خوشنما گاؤں اس کے دامن میں آباد کرلئے ہیں۔ یہاں زمین سے بھاری فصلیں اُگتی ہیں کیونکہ آتش فشانی مادّے نے جو ہلاکت کے ساتھ تخلیق کی قوت بھی رکھتا ہے، انھیں زرخیز بنادیا ہے۔ سچ ہے ہلاکت کے درمیان زندگی قائم رہتی ہے۔

اسی طرح مایوسی کے درمیان امّید قائم رہتی ہے۔ چنانچہ ہمیں یہ امّید ہے کہ ہم کل مارسلیز اور پرسوں لندن پہنچ جائیں گے۔ آج سہ پہر کو ہم آبنائے بونی فاسیو سے گزرے۔ یہ جزیرہ سارڈینیا کو کارسیکا سے جو نپولین کا مولد ہے جُدا کرتی ہے۔ یہاں بھی بڑے دلکش مناظر نظر آئے۔

لندن کے خطوط

مارسیلز میں جب ہمارا جہاز مارسیلز میں لنگر انداز ہوا تو یورپ کی سرزمین پر گاندھی جی کا استقبال سب سے پہلے مادمازیل مادلین رولاں نے کیا۔ یہ فرانس کے مایہ ناز فرزند رومین رولاں کی بہن ہیں جو حق اور عدم تشدد کی محبت کی خاطر اپنی خوشی سے جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔
موسیو رولاں نے بڑی کوشش کی کہ خود آئیں لیکن صحت کی خرابی نے نہ آنے دیا۔ اور انھیں اسی پر اکتفا کرنی پڑی کہ اپنی ہمشیر کے ذریعے خلوص و محبت کا پیام بھیجیں۔ ان کے ساتھ موسیو پریوا اور ان کی نیک دل بیوی بھی آئیں۔ یہ وہ سوئستانی دوست ہیں جن کا موسیو رولاں سے بڑا میل جول ہے اور جنھوں نے حق اور عدم تشدد کی تبلیغ میں بہت کچھ کیا ہے۔ قومی معاملات میں عدم تشدد کا برتنا بالکل نئی چیز ہے گویا یہ ایک قوت ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہے جس طرح کوئی سائنس دان کسی نئے قانون طبیعی کے عمل اور استعمال کی تفصیل بیان کرتا ہے بالکل اسی انداز میں موسیو پریوا نے قانون محبت کے عمل اور اس کے امکانات پر بحث کی ہے۔ انھوں نے گاندھی جی کو اپنی نئی کتاب "قوموں کے حب وطن کا تصادم"[1] دکھائی اس میں انھوں نے اس قسم کے تجربات کا ذکر کیا ہے، جن میں بعض بالکل نئے ہیں مثلاً جید سوئستانی حامی امن سیریسول کا تجربہ؟

---

[1] Le Choc de Patriolismes

عسکریت[1] سے لڑنے کے لئے ان خطوں میں جنھیں لڑائی یا دوسری مصیبتوں نے برباد کر دیا ہے، امدادی کام جاری کرتے ہیں اور آج کل ویلس کے کان کنوں کی امداد میں مصروف ہیں۔ موسیو پریوا نے مجھ سے کہا "آپ خود انھیں تلاش کر کے ان سے ملئے۔ وہ اتنے شرمیلے ہیں کہ انھیں گاندھی جی کے گلے پڑنا گوارا نہ ہوگا۔"

طالب علموں سے خطاب دوستوں میں پہلے پہل ہمارا خیر مقدم (استقبال) مارما زیل رولان اور موسیو پریوا نے کیا۔ تو اجنبیوں میں فرانس کے طلبہ یعنی مارسیلز کے جدید اور قدیم طلبہ، کی انجمن کے اراکین نے ہمیں سب سے پہلے یہ عزت بخشی۔ ان لوگوں نے "ہندوستان کے روحانی سفیر" کے اعزاز میں ایک صحبت منعقد کی اور گاندھی جی کا استقبال اس حیثیت سے کیا کہ وہ مغرب کے لئے جسے لوٹ کے لالچ نے اندھا کر دیا ہے روشنی اور ان ملکوں کے لئے "جو جنگ کے زخموں سے چور چور ہیں" مرہم لے کر آئے ہیں۔ اپنے جواب میں گاندھی جی نے انھیں دوست اور ہم مکتب کہہ کر خطاب کیا۔ "میں فرانس پہلی بار سنہ ۱۸۹۰ء کی نمائش میں شریک ہونے آیا تھا۔ اس کے بعد سے آپ میں اور مجھ میں زیادہ گہرا اور زیادہ مضبوط رابطہ قائم ہو گیا ہے۔ یہ رابطہ آپ ہی کے ممتاز اور معروف ہم وطن رومیں رولان کی بدولت ہے جنھوں نے اپنے ذمہ اس ناچیز پیام کی ترجمانی کا کام لے لیا ہے جو میں تیس بتیس سال سے اپنے ہموطنوں کو پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کے ملک کی روایات سے اور روسو اور وکٹر ہوگو کے حکیمانہ اقوال سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے اور اس نازک موقع پر جب میں ایک نہایت مشکل کام انجام دینے لندن

---

[1] Militarism وہ طرز خیال جس کے مطابق فوجی قوت سے اپنے ملک اور دوسرے ملکوں پر حکومت کرنا جائز سمجھا جاتا ہے۔

جارہا ہوں آپ حضرات کی طرف سے جو گویا میرے ہم مکتب ہیں یہ خیر مقدم میرے لئے بڑی ہمت افزائی کا باعث ہے۔"

انھوں نے ان نوجوانوں کو جو ایک جنگ جُو قوم سے ہیں عدم تشدّد کی تبلیغ کی۔ انھوں نے کہا کہ عدم تشدد کمزوروں کا حربہ نہیں بلکہ ان کا جو سب سے قوی ہیں۔ قوت کے معنی صرف جسمانی طاقت کے نہیں۔ اور اس شخص کے لئے جو عدم تشدد کا پابند ہے جسمانی طاقت کی ضرورت نہیں مگر دل کی طاقت ناگزیر ہے۔ یہ لوگ بڑے جوش و خروش سے نعرہ ہائے تحسین بلند کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے تقریر کے دوران میں یہ مثال دی کہ دیکھو ایک طاقتور زولو ایک یورپی لڑکے کے آگے جس کے ہاتھ میں ریوالور ہو تھر تھر کانپتا ہے اور اس کا مقابلہ ہندوستان کی عورتوں سے کرو جو بے جھجک لاٹھی کی مار کھاتی ہیں اور لاٹھی کے بلے سہتی ہیں۔ دشمن کا مقابلہ کرکے مرنا اور مارنا بے شک بہادری کا کام ہے لیکن دشمن کے ہاتھ سے زخم کھانا اور بدلہ نہ لینا اس سے بڑھ کر بہادری ہے اور اسی کا سبق ہندوستان سیکھ رہا ہے۔ آخر میں انھوں نے اس مسئلے کے ایک اور پہلو کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔ اس عدم تشدد کی جنگ کو دوسرے الفاظ میں تزکیۂ نفس کا عمل، کہہ سکتے ہیں جس سے یہ مُراد ہے کہ جو قوم اپنی آزادی کھوتی ہے اپنی ہی کمزوریوں سے کھوتی ہے اور جوں ہی وہ ان کمزوریوں کو دور کردے اُسے پھر سے آزادی مل جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی قوم مستقل طور پر محکوم بن کر نہیں رہ سکتی جب تک وہ بالارادہ یا بلا ارادہ حاکموں سے تعاون نہ کرے۔ بلا ارادہ تعاون یہ ہے کہ انسان جسمانی ضرر کے خوف سے ظالم یا جابر کے آگے سر جھکا دے۔ میں نے اس تحریک کی ابتدا ہی میں یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ اس قسم کی تحریکوں میں اصل چیز انسان کی سیرت ہے۔ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی تھی

کہ سچی تعلیم کے معنی یہ نہیں کہ بچّے کے دماغ میں واقعات اور اعداد و شمار ٹھونس دئے جائیں بلکہ یہ ہیں کہ اس کی سیرت کو نشو ونما دی جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ فرانس کے طلبہ ذہنی قابلیت کے مقابلے میں سیرت کی پختگی پر کہاں تک زور دیتے ہیں، مگر اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ عدم تشدد کے اثرات پر غور کریں تو یہ دیکھیں گے، کہ جب تک انسان پختہ سیرت نہ رکھتا ہو عدم تشدد کی کوشش محض بیکار ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہماری آپ کی شناسائی اسی جلسے پر ختم نہ ہو جائے گی بلکہ، یہ ابتدا ہو گی آپ میں اور میرے ہم وطنوں میں گہرے پُرجوش تعلقات کی۔ ایک ایسی تحریک میں جو ہم ہندوستان میں چلا رہے ہیں ہمیں ساری دنیا کی اصولی ہمدردی کی ضرورت ہے اور اگر آپ ہماری تحریک کا اور ان وسائل کا جو ہم استعمال کرتے ہیں غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ سمجھیں کہ ہم آپ کی ہمدردی اور تائید کے مستحق ہیں تو مجھے امید ہے کہ آپ ہمدردی میں دریغ نہ کریں گے۔

اخبار والے بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ساری دنیا میں ایک سی ہوتی ہیں۔ آپ کہیں بھی جائیے ان میں فرق نہ پائیے گا مثلاً خفیہ پولیس یا صنعتی شہر یا اخبار کے وہ نمائندے جن کا کام خبریں گھڑ کر پھیلانا ہے۔ میں سمجھا تھا کہ ہندوستان کے ساحل سے لنگر اٹھانے کے بعد اس دروغ بافی کے ہنگامہ سے نجات مل جائے گی جو انگلو انڈین اخباروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر توبہ کیجئے۔ انگلستان کے رجعت پسند فرقے کے اخبارات اس معاملے میں دنیا کے سارے اخباروں سے بڑھ گئے ہیں۔ ہمارے ملک کے رجعت پسند اپنے رفیقوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے جو انگلستان میں ہیں۔ اس کا ایک نمونہ جو اچھی طرح انگشت نما ہو چکا ہے ڈیلی میل کا نمائندہ تھا جس نے گاندھی جی سے راجپوتانہ جہاز پر گفتگو کی تھی۔ یہ طالب علموں کی اس صحبت میں موجود تھا اور اس نے اپنے

اخباروں کو کئی تار بھیجے جن میں محض شرارت سے گاندھی جی کے الفاظ کو غلط معنے پہنائے اور جھوٹ کا طومار باندھ دیا۔ جب ہم اسپیشل ٹرین میں پولون سے مارسیلز جا رہے تھے تو راستے میں گاندھی جی نے ان حضرت کی خوب خبر لی۔ اس نے ظاہر کیا تھا کہ یہ صحبت باغی ہندوستانی طلبا کی طرف سے تھی۔ حالانکہ اس کے منعقد کرنے والے محض مارسیلز کے فرانسیسی طلبہ تھے۔ پھر بغیر اس کے تقریر میں سے کوئی حوالہ دیتا اس نے لکھ بھیجا تھا کہ گاندھی جی نے برطانوی حکومت سے نفرت پھیلانے کی کوشش کی۔ اس سے کہا گیا کہ اپنے بیان کی تائید میں کوئی ایک فقرہ بھی پیش کرے۔ اس نے اپنی صفائی کے طور پر یہ مہمل سی بات کہی "مجھے تعجب ہوا کہ آپ نے خواہ مخواہ سیاست کی بحث چھیڑ دی۔" گاندھی جی نے کہا یہ آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں سیاست کو اپنی زندگی کے گہرے سے گہرے مسائل سے جدا نہیں کر سکتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ میری سیاست منافی اخلاق نہیں ہے بلکہ عدم تشدد اور حق میں گھل مل گئی ہے۔ جیسا میں بارہا کہہ چکا ہوں۔ مجھے ہندوستان کا برباد ہو جانا گوارا ہے مگر یہ گوارا نہیں کہ وہ حق اور عدم تشدد کو کھو کر آزادی حاصل کرلے۔" اس کے بعد اس نے کچھ بے سروپا اعتراض کئے مگر ان کا ثبوت نہ دے سکا۔ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ اسے اس طرح جواب دہی کرنا ہو گی۔ گاندھی جی نے کہا "مسٹر..... آپ سچ کے دائرے کے باہر باہر منڈلا رہے ہیں۔" جب گاندھی جلسے میں گئے تو ہمیں سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ مگر ڈیلی میل والے کرم فرما کی رپورٹ یہ تھی۔ "گاندھی کو مایوسی ہوئی کہ ان کا استقبال کچھ یوں ہی سا ہوا۔" گاندھی جی نے پوچھا "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے مایوسی ہوئی؟ اور یہ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ برطانوی کرنل نے جو عورتوں کی انگیا تحفے کے طور پر بھیجی تھی اس پر مجھے غصہ آیا حالانکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ ہنسی آئی" اس نے جواب دیا "ہنسی آنے

سے شاید آپ کا مطلب یہی تھا کہ غصّہ آیا۔" گاندھی جی نے کہا" تو خیر آپ اب سن لیجئے کہ میں ظرافت سے اتنا مَس رکھتا ہوں کہ مجھے ایسی باتوں پر غصّہ نہیں آتا۔ اگر مجھ میں یہ چیز نہ ہوتی تو اب تک مجنوں ہو گیا ہوتا۔ مثلاً مجھ پر آپ کا یہ مضمون پڑھکر جنون سوار ہو جاتا۔ میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ آپنے اس مضمون میں اول سے آخر تک ایسی باتیں بھردی ہیں جنھیں سچ سے ذرا بھی لگاؤ نہیں اور میں آپ سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ مگر میں یہ نہیں کرتا اور آپ جب کبھی تشریف لائیں آپ سے گفتگو کرنے کو حاضر ہوں۔" وہ اس سرزنش سے پریشان تو معلوم ہوتا تھا لیکن ندامت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

مگر اخبار کے دربار میں سچ کا گذر مشکل ہے یہاں تک کہ مشہور اخبار نویس بھی جن کی نیت غلط بیانی کی نہیں ہوتی۔ سچی بات میں رنگ آمیزی کا شوق ضرور رکھتے ہیں مثلاً مسٹر ملس امریکہ کے ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمائندے جو عرصے سے ہمارے ساتھ ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ گاندھی جی کو کون سی باتیں ناپسند ہیں، ان کی جہاز کی زندگی بیان کرنے میں رنگ آمیزی سے باز نہ رہ سکے۔ انھوں نے پرارتھنا کا منظر دکھایا، چرخے کی دلکشی کا ذکر کیا اور بہت سی اور دلچسپ باتیں بیان کیں لیکن انھیں یہ خیال ہوا کہ جب تک ایک بلی نہ ہو جو روز شام کو گاندھی جی کے دودھ میں حصّہ بٹایا کرے اس وقت تک تصویر بے رنگ رہے گی۔ اسی طرح مسٹر سولوکومب جنھوں نے گاندھی جی سے یراودا جیل میں گفتگو کی تھی۔ اور اسے شائع کر کے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ایوننگ اسٹینڈرڈ میں گاندھی جی کی وسعت قلب کی تعریف کرتے وقت یہ سوچے کہ جب تک کوئی مثال نہ دی جائے یہ حقیقت اچھی طرح واضح نہیں ہوگی۔ اس لئے انھوں نے اپنے تخیل سے کام لے کر لکھ دیا کہ جب شاہزادہ ویلس ہندوستان آئے تھے تو گاندھی جی ان کے

آگے تعظیماً منہ کے بل زمین پر گر پڑے تھے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا "مسٹر سولو کو مب
مجھے آپ سے ایسی توقع نہ تھی۔ اگر یہ تخیل ہے تو یہ بات تو آپ کے تخیل کے لئے بھی قابل
فخر نہیں۔ میں ہندوستان کے غریب سے غریب بھنگی، غریب سے غریب اچھوت
کے آگے جھکنے کو اس کے پیر چھونے تک کو تیار ہوں کیونکہ اس پر صدیوں سے
جو ظلم ہو رہا ہے اس میں میرا بھی حصہ ہے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ میں خود بادشاہ کے
سامنے زمین بوسی کروں تو پھر شاہزادہ ویلس کا کیا ذکر ہے، کیونکہ میری نظر میں
وہ برخود غلط قوت کے نمائندے بن کر آئے تھے۔ میں کسی ہاتھی کے آگے ہرگز
نہیں جھکنے کا چاہے وہ مجھے پیروں سے کچل ڈالے۔ ہاں ایک چیونٹی کے آگے
جھکنے کو تیار ہوں کہ کہیں میں نے بے جانے اس پر پیر نہ رکھ دیا ہو۔" ڈی ولیرا
کے اخبار آئرش پریس نے بجا طور پر اپنا اصول عمل "سچی خبریں" قرار دیا ہے
اور پہلے ہی پرچے میں لکھا ہے "ہم کبھی جان بوجھ کر اس اخبار سے یہ کام نہ لیں گے
کہ اپنے دوستوں کو گمراہ کریں یا اپنے مخالفوں کو بدنام کریں۔" بہت ہی کم اخبار
ہیں جو اس اصول پر عمل کرتے ہوں۔ مگر کسی ملک کے لوگوں کی بصیرت کا اندازہ
اس کے اخباروں سے کرنا ٹھیک نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جس ملک میں اخباروں
کی اشاعت دس دس بیس بیس لاکھ ہو وہاں ان کا رائے عامہ پر بے حد
مضر اثر پڑ سکتا ہے۔

لندن میں فرنیڈس ہاؤس کی صحبت بہت اچھی رہی۔ جلسے میں ہر طبقے اور
ہر خیال کے لوگ موجود تھے کہ بقول لارنس ہاؤس مین صاحب
کے "قوم کے مہمان" کا خیر مقدم کریں۔ ہاؤس مین صاحب صدر تھے اور ان سے
اچھا صدر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے شکریئے اور خیر مقدم سے آگے
بڑھ کر یہ یقین دلایا کہ انگلستان کے لوگ روز بروز ہندوستان کے ہمدرد ہوتے جا رہے

ہوتے جاتے ہیں اور چاہے کانفرنس کا انجام کچھ بھی ہو یہ ہمدردی باقی رہے گی۔
انھوں نے کیا سچی بات کہی کہ گاندھی جی اس مقصد کے علمبردار ہیں جسے لوگ عام طور پر سمجھ نہیں سکتے یعنی سیاست اور مذہب کا اتحاد۔ انھوں نے فرمایا "کلیسا کے نزدیک ہر شخص گنہگار ہے لیکن سیاست میں ہم اپنے سوا اور سب کو گنہگار سمجھتے ہیں۔ یہ بات ہماری روزمرہ زندگی پر بالکل صادق آتی ہے۔ مسٹر گاندھی ہم سے یہ کہنے آئے ہیں کہ اپنے دلوں کو ٹٹولو اور یہ بتاؤ کہ تمھارا کیا مذہب ہے۔"

کنگسلے ہال

سچ کے طور پر گاندھی جی کا استقبال اس سے بھی زیادہ گرمجوشی سے ہوا۔ مس موریل لیسٹر نے بڑے خلوص اور محبّت سے گاندھی جی سے اصرار کیا کہ میرے ساتھ کنگسلے ہال میں ٹھہریے۔ کنگسلے ہال کی داستان گوشِ دل سے سننے کے لائق ہے کہ کس طرح مس لیسٹر اپنے دکھے ہوئے دل کے تقاضے سے اس پر آمادہ ہوئیں کہ ہنگامہ خیز شراب خانوں کے قریب مصیبت افلاس، گندگی، بداعمالی کی فضا میں جا کر بس جائیں کس طرح انھوں نے ہندوستان کا سفر کیا اور ڈاکٹر ٹگور اور گاندھی جی کی مہمان رہیں، کس طرح کنگسلے ہال کا افتتاح ہوا اور وہ چند رفیقوں کے ساتھ وہاں رہنے لگیں تاکہ ان محلّوں میں جہاں خاندانوں کی تباہی، کام حاصل کرنے کی ناکام کوشش، اقدامِ خودکشی اور اس کے بعد ذلّت اور مایوسی کے منظر آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں، لوگوں کی دلدہی اور دستگیری کریں، انھیں راحت و مسرّت کا پیام پہنچائیں۔ یہ قصّہ نہایت پر اثر انداز میں مس لیسٹر کی کتاب "میرے ہندو میزبان"[1] میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہونا چاہیئے تھا اور یہی ہوا کہ گاندھی جی کو کنگسلے ہال میں ٹھہرنے کی

---

[1] Miss Murial Lester: My Host the Hindu.

دعوت دی گئی اور انھوں نے یہاں بالکل وہی فضا پائی جو انھیں دل سے پسند ہے۔ اس بستی کے لوگ اپنے یہاں آپ جھاڑو دیتے ہیں اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے ہیں، کپڑے دھوتے ہیں، اور جو ان کا مہمان ہو اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ روزمرّہ کے کام میں شرکت کر کے حلال کی روٹی کھائے۔ مجھے نہ جین ایڈمس سے ملنے کا شرف حاصل ہوا نہ ہل ہاؤس کے دیکھنے کا مگر میں نے ان خاتون کی اور اس مکان کی تعریف بہت سنی ہے اور مس لیسٹر کی یہ کوشش ہے کہ لندن میں ہل ہاؤس کا جواب بنا کر کھڑا کر دیں۔ ان کی دلی آرزو ہے کہ محبت الٰہی کی روح کنگسلے ہال میں سرایت کر جائے، اس کے ایک ایک ذرّے میں بس جائے، وہ روح جو انسان کو خدمت، ضبط نفس اور قربانی پر ابھارتی ہے۔" ممکن ہے کہ جس کام سے گاندھی جی یہاں آئے ہیں اس میں کبھی اس کی ضرورت پیش آجائے کہ وہ اپنے دوستوں کی سہولت کے لئے کہیں ان کے قریب جا کر رہیں مگر ظاہر ہے کہ انھیں اس جگہ کے چھوٹنے کا بڑا قلق ہوگا۔ جب کبھی ہم باہر نکلتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے بچے ہنستے کھیلتے ہمارے ساتھ ہو لیتے ہیں اور ہم سے دوستی کے پینگ بڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ دیو داس سے اکثر پوچھا کرتے ہیں " اچھا بتاؤ تمہارے ابّا بادشاہ سے کب ملیں گے؟" ایک اور سوال یہ ہوا کرتا ہے "کیا تمھارے ملک میں لڑکے بالکل ہمارے جیسے ہوتے ہیں؟" ایک لڑکی دوسری سے جو اس کے قریب کھڑی تھی کہتی ہے "یہ لوگ اس پوشاک میں عجیب سے معلوم ہوتے ہیں" وہ کیا معقول جواب دیتی ہے "ہم بھی انھیں ایسے ہی معلوم ہوتے ہوں گے" ایک بھولا بھالا بچہ پوچھتا ہے "تمہارے باپ تو موٹر کار میں بیٹھ کر جایا کرتے ہیں تمھیں ایک نہیں لے دیتے؟" ایک شریر لڑکا دور سے چلا کر کہتا ہے "اجی آپ کا پتلون کہاں ہے؟"

مہربانی کا برتاؤ | مگر ان باتوں میں مہربانی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ مخالف اخباروں کو بھی مجبور ہو کر "مہاتما" کی تصویریں شایع کرنا پڑتی ہیں جن سے ان کی پھیلنے میں مدد ملی۔ جب کبھی گاندھی جی کی موٹر کار گاڑیوں کے ہجوم کی وجہ سے کھڑی ہو جاتی ہے تو لاری چلانے والے، سڑک پر کام کرنے والے مزدور پٹری پر پھول بیچنے والے، دکانوں میں گوشت بیچنے والے انھیں پہچان لیتے ہیں اور یا تو ادب کے ساتھ قریب آجاتے ہیں یا محبت سے مسکرا دیتے ہیں۔

روزانہ بیسیوں خط گاندھی جی کے نام انگلستان اور براعظم یورپ کے ہر حصے سے آیا کرتے ہیں جن میں ان کا خیر مقدم اور ان کی مشن سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پرانے دوست جو انھیں ان کی طالب علمی کے زمانے سے جانتے ہیں ملنے کو آتے ہیں۔ اور سب انگریزوں نے (جن میں سول سروس والے بھی شامل ہیں) جو ان سے پہلے کے تعلقات رکھتے تھے اب ان تعلقات کو تازہ کر لیا ہے۔ چند روز ہوئے سر جارج پرلس ملنے کو آئے تھے۔ کہتے تھے کہ میں گاندھی جی کا ممنون احسان ہوں۔ بس ان سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔ دیہات سے بہت سی دعوتیں آیا کرتی ہیں کہ ہفتہ کے آخری دن یہاں آکر خاموشی سے گزاریئے اور آرام کر لیجئے اور بعض اوقات ہمدردی کا اظہار محسوس شکل میں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں پچاس پونڈ کا نوٹ ملفوف تھا اور اس کا مضمون یہ تھا "آپ نے سینیچر کو جو تقریر پوسٹن روڈ پر فرینڈس ہاؤس میں کی اور جو پیام کنگسلے ہال سے عام لاسلکی کے ذریعے نیو یارک بھیجا وہ میں نے نہایت دلچسپی سے ٹائمز میں پڑھا۔ ان دونوں تقریروں میں آپ کے اقوال اس قدر دلنشیں اور جامع ہیں کہ میری دعا ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں سننے والے انھیں غور سے سنیں اور سمجھیں۔ مجھے ہندوستان سے بہت مدت سے دلچسپی ہے۔ جنگ کے زمانے میں مجھے ان ہندوستانی سپاہیوں

اور ڈاکٹروں کی میزبانی کا فخر حاصل ہوا تھا جو یہاں کے ہسپتال میں تھے۔ اگر آپ یہ چیک جو میں آپ کے اور آپ کی تعلیم سے ہمدردی کے اظہار کے طور پر بھیج رہا ہوں، قبول فرمائیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی اسے آپ اپنی مرضی سے اپنے کام کے جس شعبے میں جی چاہے صرف کیجئے خدا کرے کہ کانفرنس میں آپ کی موجودگی سے کام آسان ہو جائے اور آپ کو ہمارے ملک کی آب و ہوا سے تکلیف نہ پہنچے۔ لنکا شائر سے جو بے شمار خطوط آئے ان میں سے ایک میں یہ الفاظ ہیں "اجازت ہو تو میں کہوں، اگو اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کہ میں لنکا شائر کے ایک کپڑے کے کارخانے کا مزدور ہوں اور مجھے انڈین نیشنل کانگرس کے لیڈروں کے طرز عمل سے ایک حد تک نقصان پہنچا ہے مگر اس کے باوجود میں مسٹر گاندھی کا بے حد مداح ہوں اور لنکا شائر میں میرے بہت سے ساتھی مسٹر گاندھی کی مدح میں میرے شریک ہیں۔" ہم ایک اور خط کا اقتباس نقل کرتے ہیں جو کسی قدر طویل ہے۔ یہ بھی ایک مزدور کا خط ہے اس لئے اس سے یہ خوش گوار نتیجہ نکلتا ہے کہ گاندھی جی کی حق اور عدم تشدد یا تزکیۂ نفس کی تحریک لنکا شائر تک میں پھیل گئی ہے۔ "خدا نے آپ کو اپنی جانب سے رہنما بنایا ہے، نہ صرف ہندستانیوں کا جو شراب خواری میں مبتلا ہیں جن پر ہماری شرمناک شراب کی تجارت ظلم توڑ رہی ہے، بلکہ آپ ہم سب کے بزرگ ترین رہنما اور بزرگ ترین عیسائی ہیں کیونکہ اور سب تو شراب کے شیطانوں سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ میں امتناع شراب نوشی کا بڑا زبردست حامی ہوں اور اگر آپ کبھی راکڈیل آئیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں ہر قسم کے جلسے کے بعد چند منٹ کی تقریر میں یہ ثابت کرتا ہوں کہ امتناع شراب نوشی سب سے موثر علاج ہے اور صرف مسٹر گاندھی ہی ایسے شخص ہیں جو واقعی اپنا ایک اصول رکھتے ہیں اور جرأت کے ساتھ ہر جگہ اپنا جھنڈا بلند

کرتے ہیں ۔ اب تو جب میں کسی مجمع کے قریب جاتا ہوں تو لوگ کہا کرتے ہیں
"لو، گاندھی کے رفیق آ گئے مگر یقین کیجیے کہ میں آپ کی جوتیاں سیدھی کرنے کے
قابل بھی نہیں - میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کے ذریعے سے ہمارے ملک پر جو
شراب کا بندہ ہے، یہ ثابت کر دے کہ یہ ہزاروں شیطان کے گھر یہ شراب کے
کارخانے اُن مزدوروں کی بدولت چل رہے ہیں جو کپڑے کے کارخانوں اور دوسرے
کارخانوں میں کام کرتے ہیں، جو اپنی مزدوری کارخانوں سے شراب خانوں میں
پہنچاتے ہیں اور پھر ہمارے ہندوستانی بھائیوں سے کہتے ہیں کہ مال سب ہم
سے خریدو مگر اپنے ملک کا بھی کام چلاتے رہو اور ہمیں شراب پینے دو، خوب
پینے دو، جی کھول کر پینے دو ! ! آخر میں میں پھر دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کی آپ
کے بیٹے کی اور آپ کے پیارے رفیقوں کی دستگیری کرے اور وہ دن آئے
کہ انگلستان خدا کا شکر ادا کرے کہ آپ کی کوشش سے یہاں یہ منحوس تجارت
موقوف ہوئی ۔ تب آپ کے وطن کے دن پھریں گے اور ہم سب مل کر یہ گیت
گائیں گے "تعریف اس خدا کو جس کی ذات برکتوں کا سرچشمہ ہے"

بہت سے دوستوں نے خیر مقدم کے خطوط کے ساتھ کتابیں بھی بھیجی
ہیں۔ میں یہاں صرف دو مثالیں دیتا ہوں ۔ مسٹر بریلیسفورڈ نے اپنی کتاب
"باغی ہندوستان[1]" کی ایک جلد بھیجی اور مجھے لکھا کہ جس طرح آپ نے ہندوستان
کے گاؤں مجھے دکھائے تھے میں انگلستان کے گاؤں آپ کو دکھانے کو تیار
ہوں - یہ کتاب اور اخبار نویسوں کی تحریروں کی طرح نہیں ہے۔ اس میں
بڑے پتے کی باتیں ہیں اور بڑی جرائت اور صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے
مگر کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے مسٹر بریلیسفورڈ ثابت نہ کر سکتے ہوں -

---
[1] Rebel India

انھوں نے یہ کتاب اس موقع پر شایع کی ہے کہ "باغی ہندوستان" کو برطانوی جوئے سے آزاد ہونے میں مدد ملے۔ ایک اور کتاب جسے دیکھکر بڑی حیرت اور خوشی ہوئی۔ "گاندھی سے دو دو باتیں"[1] ہے۔ یہ بریگیڈیر جنرل کروزیر نے بھیجی تھی اور اس کے ساتھ ایک رقعہ مس لیسٹر کے نام تھا کہ "مسٹر گاندھی کو تعجب ہوگا کہ ایک فوجی آدمی ان کا مداح ہے۔" اس کتاب میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جنھیں پڑھ کر انسان کی رگوں میں خون جم جائے اور ان سب کا ذمہ دار مصنف برطانوی حکومت کو قرار دیتا ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسے آئرستان میں اپنے عہدے سے استعفا دینا پڑا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب اسے حکم دیا گیا تھا کہ جن لوگوں نے بے چاری بے والی ووارث وفادار عورتوں کے ساتھ ظلم کیا ہے ان کے جرم سے چشم پوشی کرے۔ وہ برطانوی حکومت پر "اعلےٰ مقاصد سے غداری کرنے" کا الزام لگاتا ہے۔ وہ پرمعنی انداز سے پوچھتا ہے کہ انگلستان کے اخبار اس سیدھے سادے نیک دل ہندو کے متعلق جھوٹی باتیں کیوں مشہور کرتے ہیں کہ وہ ایک نیم برہنہ فقیر ہے جو عیسائی مشنروں کو ہندوستان سے نکال دینا چاہتا ہے۔ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس کی وجہ وہی ہے جو اس کی تھی کہ یہ اخبار ۲۱-۱۹۲۰ء میں آئرستانیوں کے متعلق جھوٹی باتیں مشہور کرتے تھے اور ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ اپنے اپنے بھلے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔ یہ اخباری "وفاداری" اخباری "حب وطن" بھی عجب ڈھونگ ہے۔ وفاداری کس کی؟ اخباروں کی "حب وطن" کس وطن کا؟ خدا جانے یا لارڈ روورمیئر جانیں ....

ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے، فرانس کو آزادی مل سکتی ہے۔ جرمنی کو آزادی مل سکتی ہے، سب کو آزادی مل سکتی ہے، اس کی نہیں کہ جو چاہیں کریں

---

[1] A word to Gandhi

بلکہ اس کی کہ جو چاہیئے وہ کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ حبّ وطن کا مذہب جو دنیا نے اختیار کر رکھا ہے مٹ جائے اور اس کی جگہ مذہب انسانیت کا دور دورہ ہو۔ اس سے بڑھ کر سخت الزامی تحریر جس کا جواب دینا ناممکن ہے، شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔

کانفرنس کی تیاری گاندھی جی بھی اسی قسم کی فرد جرم لگانے کے لئے انگلستان آئے ہیں اور انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے خاص انداز کی وجہ سے ان الزامات کا زور اور اثر اور بڑھ جائے۔ کیونکہ ایک ایک لفظ جو ان کی زبان پر آتا ہے ان کے دل کی ٹکسال سے حق اور عدم تشدد کا ٹھپّا لئے ہوئے نکلتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ابتدائی تقریر جو انھوں نے گول میز کانفرنس میں کی، کامل آزادی کے مطالبے پر مشتمل ہونے کے باوجود لوگوں کو ناگوار نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے جب انھوں نے دارالعوام میں "باغی ہندوستان" کا ذکر کیا اور لنکا شائر کو تلقین کی کہ اس نے ہندوستان کے جو گناہ کئے ہیں ان کا کفارہ ادا کرے تو پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے بھی برا نہیں مانا۔ اسی وجہ سے جب انھوں نے سختی سے احتجاج کیا کہ وفاقی دستوری کمیٹی کی کارروائی میں بڑی دیر لگتی ہے اور برطانوی ہند کے نمائندوں کی جماعت میں حکومت نے سب اپنے آدمی بھر دئے ہیں تو کسی کو ذرا بھی اعتراض نہیں ہوا۔ "انگلستان اور ہندوستان میں محبت کا نازک رشتہ" "اپنی خوشی کی شرکت جو اپنی مرضی سے ختم کی جا سکی، وہ شرکت نہیں جو ایک قوم زبردستی دوسری کے گلے منڈھ دے"۔ "ہندوستان اب محکوم بن کر نہیں رہ سکتا اور نہیں رہے گا" یہ وہ فقرے ہیں جو ہمارے ساحل انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے یہاں بچے بچے کی زبان پر ہوں گے۔

حکومت نے کارروائی میں جو ڈھیل ڈال رکھی ہے اس پر مہاتما جی واقعی بہت جز بز ہیں اور اپنی طرف سے پورا زور لگا رہے ہیں کہ جلدی کی جائے۔ ایسی حالت میں جب تجارت کے موازنے میں اتنا خسارہ ہے جتنا کبھی نہیں ہوا تھا جب بے روزگاروں کی تعداد نہیں لاکھ تک پہونچنے کا اندیشہ ہے، جب فرانس ہوائی جہاز سے ڈھیروں سونا لئے جا رہا ہے، جب چانسلر صاحب میزانیے کا لیکھا جوکھا برابر کرنے کی جی توڑ کر کوشش کر رہے ہیں، جب سرکاری ملازم تک بغاوت پر آمادہ ہیں، ممکن ہے حکومت کو ہندوستان کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملے۔ ممکن ہے اس وقت وہ گاندھی جی کی اس تجویز پر غور کرنے پر مائل نہ ہو کہ اگر ہندوستان برابر کا شریک بنا لیا جائے تو اس سے میزانیے کے عارضی طور پر نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے برابر کرنے میں مدد ملے گی۔ اگر وہ اس موقع پر چیمبرلین کے زبردست الفاظ یاد کرے جو انھوں نے لورپول میں سچی ندامت کے لہجے میں کہے تھے تو اس کے لئے بہت مفید ہے۔ "کبھی کبھی وہ وقت بھی آتا ہے جب عاقبت اندیشی سے زیادہ جرأت میں سلامتی نظر آتی ہے۔ جب اللہ کا نام لے کر کوئی بڑا کام کر ڈالنے سے جو لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دے، ان کے جذبات میں ہلچل ڈال دے، ایسا جادو کا اثر ہوتا ہے کہ سیاست و تدبیر سے ہرگز نہ ہو سکتا۔"

(۴،۳،۲)

بچھوے کی چال ناظرین کو خیال ہوگا کہ گاندھی جی نے ۷ دسمبر کو وفاقی دستوری کمیٹی میں ملک معظم کے مشیروں سے نرمی اور عاجزی کے ساتھ ایک "شکایت کا" اظہار کیا تھا اور لارڈ سینکی کے ذریعے ان سے التجا کی تھی کہ ہندوستانیوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کریں اور ان جزوی چیزوں کے متعلق جو آگے چل کر طے ہو سکتی ہیں، طول طویل بحث چھیڑنے کے بجائے صاف صاف بتا دیں کہ اصل معاملے میں وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور اپنی تجاویز ایک معین شکل میں پیش کریں۔ لیکن ابھی تک وہی گھس گھس چلی جارہی ہے۔ سب لوگ ایک دائرے میں چکر کاٹ رہے ہیں لیکن مرکز کے قریب پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ رہے گاندھی جی تو وہ کانگریس کے مطالبات کمیٹی کے سامنے پیش کر چکے ہیں او اس نے انھیں جو ہدایت دی ہے اس کے تمام پہلو سمجھا چکے ہیں۔

بات یہ ہے کہ برطانوی قوم کو اس وقت اپنی پڑی ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک تدبیر سوچ کر نکالتی ہے مگر اس سے بس چند روز کام چلتا ہے۔ اُدھر ہندوستان میں حکومت کا رویہ وہ ہے جسے گاندھی جی "اڑنا اور اڑے رہنا" کہتے ہیں۔ وزیر ہند ان کوششوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو برطانیہ کی "قومی حکومت" اپنے مالیات اور اپنے سکے کی ساکھ دوبارہ قائم کرنے کے لئے عمل میں لائی ہے مگر اس کی کوشش نہ یہاں ہو رہی ہے اور نہ ہندوستان میں کہ ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت پر دوبارہ اعتماد پیدا ہو۔

لارڈ ارون خاص کر کے الگ تھلگ رہتے ہیں کہ ان پر ہندوستان کے

معاملات میں خواہ مخواہ مداخلت کرنے کا الزام نہ آئے۔

ہندوستان کے مطالبات

گاندھی جی کو جتنا وقت ملتا ہے اس کا ایک ایک لحظہ اس کام میں صرف کرتے ہیں کہ برطانوی جمہور کے سامنے ہندوستان کے مطالبات دلیلوں کے ساتھ پیش کریں۔ انھوں نے "ڈیلی میل" میں ایک مضمون لکھا جس میں اس ساہوکار کا جس کے وہ "منیم" ہیں یعنی "ہندوستانی قومی کانگریس" کا تعارف کرایا۔ اور دار العوام میں مزدور جماعت کے ممبران پارلیمنٹ کے ایک خاص جلسے میں ایک مختصر اور پُرمغز تقریر کی جس میں ہندوستانی مطالبات کو وضاحت کے ساتھ سمجھایا۔ انھوں نے ان بے بنیاد خیالات اور تعصبات کی سختی سے تردید کی جو تعلیم یافتہ انگریزوں تک کے دل میں راسخ ہو گئے ہیں کیونکہ انھیں خاص کر کے غلط تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ آپ لوگ برگزیدۂ خلائق ہیں کیونکہ آپ غریب سے غریب معمولی مزدوروں کے نمائندے ہیں۔ مگر میں ہندوستان کے معاملے میں آپ میں اور دوسری سیاسی پارٹیوں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ مجھے تو سبھی پر یکساں ڈورے ڈالنا ہیں۔ لیکن مزدوروں کے نمایندوں کے سامنے انھوں نے ہندوستان کے افلاس کے پہلو پر بہت تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا "میں آپ کے دل سے یہ خیال خام دور کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے غریب لوگ برطانوی امن پر جان دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ برطانیہ کے جوئے کو اتار کر پھینکنا چاہتے ہیں کیونکہ ان سے اب فاقے نہیں کیے جاتے۔ جب آپ کے ملک میں جو کہیں زیادہ خوشحال ہے وزیر اعظم کی تنخواہ اوسط فی کس آمدنی کے پچاس گنے سے زیادہ نہیں ہے اور ہندوستان میں وائسرائے کی تنخواہ ایک ہندوستانی

کی اوسط آمدنی کے پانچ ہزار گنے کے برابر ہے تو ظاہر ہے کہ کیا انجام ہوگا۔ ہندستان کی اوسط آمدنی اتنی ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بہت بڑی تعداد کی واقعی آمدنی صفر ہو گی"۔ فوج کے مسئلے پر بھی بحث ہوئی مگر جتنی توجہ افلاس کے سوال پر کی گئی تھی اس کے مقابلہ میں اس پر کچھ بھی نہیں ہوئی۔ مزدور جماعتوں کے ممبروں کے دل میں اپنے روزگاروں کا خیال منڈلا رہا تھا۔ اور وہ پھر پھر کر لنکاشائر کے کپڑے کی بابت سوال کرتے تھے۔ گاندھی جی نے ان سے بہت پُراثر لہجے میں کہا "یہ تو بتائیے کہ جب ہندوستان اپنا کپڑا آپ پیدا کر سکتا ہے تو کیا وہ اخلاقاً اس پر مجبور ہے کہ آپ سے کپڑا خریدے۔ کیا لنکاشائر کا جو ہندوستان کو برباد کرکے آباد ہوا ہے، یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے کیے کی تلافی کرے؟" ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک ممبر نے اس اکھڑپن سے جو اہل برطانیہ کا حصہ ہے صاف صاف کہا "اگر آپ ہمارا کپڑا نہیں خریدتے تو ہم آپ کی چائے اور سن نہیں خریدیں گے۔" گاندھی جی نے کہا "بے شک آپ نہ خریدیے۔ یہ تو من بھائے کا سودا ہے۔ ہم کب چاہتے ہیں کہ اپنی چائے اور سن زبردستی آپ کے سر منڈھیں۔"

پارلیمنٹ کی تینوں پارٹیوں کا جو جلسہ ہوا اس میں اس سے بھی زیادہ رونق تھی۔ وہاں گاندھی جی نے دوستانہ التجا کرنے کے بجائے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ مضبوط دلیلوں کے ساتھ پیش کیا اور بہت تفصیل کے ساتھ "تحفظات" وغیرہ پر بحث کی۔ انھوں نے کہا "جب تک ہمیں فوج پر اور امور خارجہ پر اختیار نہ حاصل ہو وہ چیز جو ہمیں ملے گی کامل آزادی کیا معمولی حکومت خود اختیاری بھی نہیں کہی جاسکتی۔ وہ محض ایک پوست ہوگا مغز سے خالی۔ جو ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی اسے ہاتھ تک لگائے"۔ انھوں نے سرحد کے

ہوتے کا بھی پردہ فاش کر دیا اور کہا کہ جس طرح ہم پہلے بہت سے حملوں کا مقابلہ کر کے سلامت رہے اسی طرح آئندہ بھی رہیں گے۔ "برطانوی امن" محض ایک فرضی چیز ہے۔ ہندوستانیوں کو برطانوی ہند کے مقابلے میں دیسی ریاستوں میں زیادہ امن نصیب رہا۔" اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ آپ نہ ہوں گے تو ہمیں خود کشی کرنا پڑے گی یا ہم ایک دوسرے کو کھا جائیں گے۔ اور یہ کیا ضروری ہے کہ ہم ہر انگریز سپاہی یا انگریز افسر کو نکال باہر کریں۔ ان میں جن کی ہمیں ضرورت ہوگی انھیں ہم رکھیں گے اگر وہ ہماری شرطوں پر رہنا چاہیں۔ مگر مجھ سے یہ کہا جاتا ہے کہ انگریز سپاہی تو کیا کوئی ملکی افسر بھی ہماری ماتحتی میں نہیں رہے گا۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں اس نسلی غرور کو سمجھنے سے معذور ہوں۔ ہم لوگ، جس سے مراد صرف کانگریس ہی نہیں بلکہ ہر پارٹی کے لوگ ہیں، اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ برطانوی حکومت کی عمارت میں اوپر کی منزل نیچے کی منزلوں سے بھاری ہے اور پھر فوجی خرچ قوم کو کچل کر مارے ڈالتا ہے۔ ہمیں معمولی سے معمولی آزادی ملنے کی سب سے بڑی پہچان یہی فوجی اختیارات ہیں۔ تحفظات کے تحت میں یہ سوال بھی آتا ہے کہ سول سروس موجودہ صورت میں باقی رہے۔ مگر بات یہ ہے کہ سول سروس والے کتنے ہی قابل، محنتی اور کام کے ہوں اگر وہ حد سے زیادہ مہنگے پڑے تو ان کے رکھنے سے کیا فائدہ؟ ہمارا کام بغیر آپ کے ماہرین فن کی امداد کے بھی چل جائے گا جس طرح ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا کام زندگی بھر بغیر ماہر فن طبیبوں کی مدد کے چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو اتنی بھاری تنخواہیں اس لئے دی جاتی ہیں کہ گویا اس کا بیمہ ہو جائے کہ وہ رشوت نہ لیں گے۔ تو جناب بیمے کی یہ قسط تو بہت زیادہ ہے۔ ہندوستانی ملازم رشوت بھی لیں

تب بھی مٹھی بھر سول سروس والوں کی تنخواہ اور الاؤنس کی آمدنی ان کی مجموعی آمدنی سے بڑھی ہوئی رہے گی۔"

مالی تحفظات موجودہ تحفظات کی رو سے آمدنی میں سے اسی فی صدی تو باہر والوں کی جیب میں جائیں گے اور صرف بیس فی صدی ہمارے ہاتھ میں رہ جائیں گے۔ اسی میں ہمیں تعلیم حفظان صحت وغیرہ کا کام چلانا پڑے گا۔ میرا تو ایسی آزادی کو دور ہی سے سلام ہے۔ مجھے یہ منظور ہے کہ جبراً محکوم بنا کر رکھا جاؤں اور باغی کہلاؤں مگر ایسی حکومت کی باگ ہاتھ میں لینا منظور نہیں جس کا پانچ برس یا دس برس کے بعد دوالہ نکل جائے۔ میری عاجزانہ گذارش ہے کہ کوئی خود دار ہندوستانی بھی اس صورت حالی کو قبول نہیں کر سکتا۔ میں سول نافرمانی کر کے اپنی جان خطرہ میں ڈالوں گا۔ میں جیل جاؤں گا اور لاٹھی کھاؤں گا مگر یہ مجھ سے نہ ہو گا کہ غلام بن کر آپ کے ساتھ تعاون کروں جو میری ناچیز رائے میں ان دونوں تحفظات کا منشا ہے۔

یورپی طبقہ اقلیتوں کے تحفظات کے تحت میں گاندھی جی نے ان معاشی تحفظات پر بحث کی جن کا مطالبہ ہندوستان کی ایک اقلیت یعنی یورپیوں کی طرف سے کیا گیا تھا۔ مطالبہ کیا تھا، محض دھاندلی تھی۔ اس میں انگریزوں کی بھی ذلت تھی اور ہندوستانیوں کی بھی۔ مٹھی بھر یورپیوں کا تیس کروڑ "غلاموں" سے حفاظت چاہنا ایسی چیز تھی جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ضمانت یا تحفظ کا مطالبہ دشمنوں سے ہوتا ہے دوستوں سے کبھی نہیں ہوتا۔ یورپی ہندوستان کی جو خدمت کریں گے اسے قبول کرنے کے بعد ہندوستانیوں کا یہ فرض ہو گا کہ ان کی

حفاظت کریں۔ بس اسی تحفظ پر انھیں قناعت کرنا چاہیئے۔ انھوں نے صاف صاف کہا "اگر برطانوی تجارت ہندوستان کے لئے مفید ہے تو اُسے کسی تحفظ کی ضرورت نہیں اور اگر وہ ہندوستان کے لئے مضر ہے تو لاکھ تحفظ ہوں سب بیکار ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ انگلستان کے یہ تیس کروڑ شریک جب ان کے سر سے بوجھ ہٹ جائے گا، بہت خوشحال ہوں گے اور انگلستان کو بہت مدد دیں گے۔ یہ کسی فرد یا کسی قوم کو نہیں لوٹیں گے بلکہ ایسی شرکت کے قائم کرنے میں ہاتھ بٹائیں گے جو بہت سی قوموں کے لئے مفید ہو۔ یہ وہ شرکت ہوگی جسے دیکھنے کے لئے دیوتا آسمان سے زمین پر اتر آئیں گے۔ یہ وہ شرکت ہوگی جسے سب لوگ سر آنکھوں سے قبول کریں گے، جو مدتوں قائم رہے گی، جس میں انسانوں کا بھلا ہوگا۔

کارخانے بمبئی کے کارخانوں کے مالکوں سے جو "معاملہ" ہوا ہے وہ ان لوگوں کی نظر میں گاندھی جی کا بڑا کمزور پہلو ہے۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ "معاملہ" صرف بمبئی والوں سے نہیں بلکہ احمد آباد کے کارخانوں کے مالکوں سے بھی ہوا ہے۔ مگر یہ "معاملہ" اسی حد تک ہے کہ کھادی کا کپڑا بننے والے ملوں کے مقابلے سے محفوظ رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کارخانوں کے مزدوروں کی وہ حالت ہے جسے بھوکوں مار کر کام لینا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن کارخانوں کے مالک نرمی سے اثر ڈالنے سے اور سمجھانے بجھانے سے راہ پر آتے جاتے ہیں اور احمد آباد کے مزدوروں کی انجمن بقول مسٹر ٹام شا کے دنیا بھر میں سب سے اچھی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ وفاقی دستوری کمیٹی میں گاندھی جی نے جو دوسری تقریر کی تھی اس سے ہندوستان میں

بعض دوست کھٹک گئے اور یہاں بعض دوستوں کو بہت تعجب ہوا۔ گاندھی جی نے کھلم کھلا کہہ دیا ہے کہ وہ ہر رئیس سے جو وفاقی نظام میں شریک ہونا چاہیے کم سے کم کیا توقع رکھتے ہیں اور ریاستوں کے لوگوں سے وعدہ کرلیا ہے کہ اس سے کم پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ اس تقریر میں رئیسوں سے درخواست تھی کہ ان شرطوں کو پورا کریں اور اپنی تجاویز کمیٹی کے سامنے پیش کریں۔ اس میں دبنے یا ہار مان لینے کی کون سی بات ہے؟ ماننے نہ ماننے کا سوال تو اس وقت اٹھے گا جب تجویزیں کمیٹی کے سامنے آئیں۔

تقریر کے جس پہلو پر یہاں کے لوگوں کو تعجب ہوا وہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے بالواسطہ انتخاب کا اصول تسلیم کرلیا۔ مگر انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ گاندھی جی کی تجویز کا اہم جزو واحد مجلس مقننہ اور بالغوں کا حق رائے دہندگی (جس میں سوائے چال چلن کے کوئی قید نہ ہو) بھی ہے جس سے بقول ان کے ہمیں اس کا موقع ملتا ہے کہ "ہر جماعت کے معقول مطالبات پورے کرسکیں، صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ نام نہاد اچھوتوں، عیسائیوں اور ہر قسم کے مزدوروں کے بھی۔"

گاندھی جی کی قیام گاہ بڑے آدمیوں سے جو جو باتیں ہوئیں، ان کا ذکر چھوڑ کر ہم اپنے کنگسلے ہال کے غریبوں کی بستی کا ذکر کرتے ہیں۔ بہت سے دوست گاندھی جی سے اس کی شکایت کر چکے ہیں کہ وہ ہوٹلوں اور محلوں سے اتنی دور آکر ٹھہرے ہیں۔ بعض انگریز دوستوں نے اپنے مکان جو سینٹ جیمس پیلیس کے قریب ہیں ان کے رہنے کے لئے پیش کئے لیکن گاندھی جی نے یہ قصد کرلیا ہے کہ ان غریبوں کا گھر جو سچ مچ ان کا گھر بن گیا ہے، چھوڑ کر کہیں نہ جائیں گے۔ ممکن ہے وہ اپنا

ایک دفتر الگ رکھیں اور وہاں دوستوں سے ملا کریں۔ (بعض ہندوستانی دوست اپنے مکان اس کے لئے پیش کر چکے ہیں) مگر انھیں یہ گوارا نہ ہوگا کہ مشرقی لندن کے دوستوں سے جو ان سے صبح ٹہلتے وقت صاحب سلامت کیا کرتے ہیں یا ان چھوٹے چھوٹے بچوں سے جو انھیں گھیر لیا کرتے ہیں اور موقع پا کر باتیں چھیڑ دیتے ہیں جدا ہو جائیں۔ سچ پوچھئے تو گاندھی جی کو جس چیز میں سب سے زیادہ لطف آیا وہ ان لوگوں کے ساتھ ایک خاص صحبت تھی۔

انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے اپنے آشرم کے بچوں کے جھرمٹ میں ہوں۔ وہ ان کے بھولے بھالے مگر دقیق اور پر معنی سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

ان بچوں نے پوچھا "مسٹر گاندھی آپ کی زبان کون سی ہے؟" گاندھی جی، انھیں انگریزی زبان اور ہندوستانی زبانوں کے آسان الفاظ کے مادّے بتائے اور یہ ثابت کیا کہ ہم ہیں لاکھ فرق ہو پھر بھی ہم ایک باپ کے بیٹے ہیں، انھیں اپنے بچپن کے قصے سنائے اور یہ سمجھایا کہ بار کہا کر چپ ہو رہنا بدلہ لینے سے کہیں اچھا ہے۔ بچوں کے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ وہ اس قسم کے کپڑے کیوں پہنتے ہیں اور لندن میں ان کے درمیان کیوں رہتے ہیں انھوں نے کہا "میرے نزدیک گول میز کانفرنس کا اصل کام یہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض دوست مجھے اپنا گھر دے سکتے ہیں یہ بھی معلوم ہے بعض فیاضی سے میری خاطر روپیہ خرچ کر سکتے ہیں، مگر میں مس لیسٹر کے گھر میں خوش ہوں کیونکہ یہاں مجھے تھوڑا سا مزہ اس زندگی کا ملتا ہے جس کے بسر کرنے کا میں عہد کر چکا ہوں۔ انھوں نے میرے لئے معمول سے زیادہ زیر باری نہیں اٹھائی۔ یہ تو ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کر سکتا ہے مگر انھیں اور ان کے رفیقوں کو میری وجہ سے بہت زحمت ہوئی

اور بہت زیادہ کام کرنا پڑا۔ انھوں نے وہ کمرے جن میں مَیں رہتا ہوں خالی کردیئے ہیں اور خود برآمدے میں سوتے ہیں۔ ایک تو انھیں اپنا کام کرنا ہے دوسرے میری اور میرے ساتھیوں کی وجہ سے اور کام بڑھ گیا ہے مگر وہ اسے بڑی خوشی سے انجام دیتے ہیں۔ میں ایسی جگہ کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ یہ ایسی قوی دلیل ہے کہ چارلی اینڈریوز ہرگز اس کی مخالفت نہیں کرسکتے۔" جس دن دوسرے مکان میں اُٹھ کر جانے کی بحث درپیش تھی اسی دن ایک بوڑھی دبلی پتلی پستہ قد خاتون جن کی آنکھیں جوش سے چمک رہی تھیں محض گاندھی جی سے مصافحہ کرنے آئیں۔ لوٹتے وقت وہ میری طرف مُڑکر کہنے لگیں "اس جگہ کو چھوڑ کر جانے کا خیال بھی دل میں نہ لایئے۔ یہ مُوریل کا گھر نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھیوں کے یا ہم لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ اس کے بھائی کی یادگار ہے اور اس کی زندگی کا مقصد یہی تھا جس کا مجسمہ مسٹر گاندھی کی ذات ہے۔ یہ خاص ان کے رہنے کی جگہ ہے۔" ان خاتون کی عمر اسّی برس کے قریب ہے یہ مس ہیوز ہیں جن کے والد "ٹام براؤن کا اسکول کا زمانہ"[1] کے مصنّف تھے۔

گاندھی جی کے دوست

اس جگہ کی اہمیت کا اندازہ سب سے بڑھ کر اس بات سے ہوسکتا ہے کہ عام آدمیوں میں سے کتنوں کو یہاں گاندھی جی سے ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ انھیں ملاقاتوں سے زندگی کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اور جینے کا لطف آتا ہے نہ کہ ان لوگوں کی ملاقات سے جو زندگی کو شطرنج کی بساط سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک سارا کمال یہ ہے کہ دوسرے کو مات دے دیں۔ میں ان قابلِ قدر ملاقاتوں میں سے دو ایک کا ذکر کروں گا۔ یہ دن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی

---

[1] Tom Browns School Days.

جی کے دستخط لینے کے لئے وقف ہے اور جن جن لوگوں کو اس میں کامیابی ہوئی ان سب نے اپنا اپنا قصہ سُنایا۔

ایک شلنگ کا اچھا مصرف

ایک دن ہین پلاٹن جو مس لیٹر کے رفیق ہیں، صبح سے شام تک ہمارا کام کرتے رہتے ہیں کبھی گاندھی جی کے پاس جا کر ان کے کام میں مخل نہیں ہوتے۔ ایک کتاب لے کر گاندھی جی کے دستخط لینے آئے اور کہنے لگے "مسٹر گاندھی میں نے یہ کتاب ایک شلنگ میں خریدی تھی۔ میں اس زمانے میں ڈیلی ہیرالڈ کے دفتر میں ملازم تھا۔ یہ کتاب تنقید کے لئے آئی تھی لیکن یہ اس حیثیت کی نہیں سمجھی گئی کہ اس پر تنقید کی جائے اس لئے یہ قابل فروخت کتابوں میں ڈال دی گئی اور میں نے اسے ایک شلنگ میں خرید لیا۔ میں نے اسے گھر لے جا کر اوّل سے آخر تک پڑھا اور فوراً اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ میں نے ان لوگوں سے جو کنگسلے ہال میں جمع ہوا کرتے تھے آپ کا تعارف کرایا اور آپ کے متعلق کئی لیکچر دیئے۔ اس تاریخ سے میری آپ کی ملاقات کا آغاز ہوتا ہے۔

گاندھی جی نے خوشی اور تعجب کے ساتھ کہا "تو موریل سے میرا تعارف آپ ہی نے کرایا؟" انھوں نے جواب دیا "اس کا دعوےٰ تو میں نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے وہ آپ کو پہلے سے جانتی ہوں۔ مگر دوسرے دوستوں کو البتہ آپ کا مفصّل حال میری تقریروں سے معلوم ہوا جو اسی کتاب پر مبنی تھیں۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو خود میرے دل میں آئی تھیں مگر میں ظاہر نہ کر سکا تھا۔"

گاندھی جی ہنس کر بولے "تو میں نے اپنے سب خیالات آپ سے لئے ہیں یا یوں کہیئے کہ آپ نے مجھ سے لئے ہیں۔ بہر حال آپ نے اپنا روپیہ نفع کے کام میں لگایا ہے کہ نہیں؟" انھوں نے کہا "بے شک اس سے بڑھکر نفع کی چیز اور کیا

ہوسکتی ہے مگر یہ آپ بھی تسلیم کریں گے کہ میں نے اس سے جو کام لیا ہے اس کی بنا پر میں آپ سے دستخط لینے کا مستحق ہوں۔"

ناظرین پوچھئے تو وہ کون سی کتاب تھی۔

آٹھ بچوں کا باپ ایک اور شخص آیا جو بحری فوج میں نوکر رہ چکا تھا۔ اور میرا بہن کے والد سے واقف تھا۔ چونکہ وہ اس کے امیر البحر کی بیٹی تھیں اس لئے وہ ان پر اپنا حق سمجھتا تھا ایک دن وہ صبح کو ٹہل کر واپس آ رہی تھیں کہ وہ ان کے پیچھے ہو لیا اور اس نے گاندھی جی سے دستخط لینے کے لئے اپنا یہ استحقاق جتایا "میں اکیس برس بحری فوج میں رہ چکا ہوں میں نے آپ کے والد کی ماتحتی میں کام کیا ہے اور میرا داماد گاندھی جی کو بکری کا دودھ پہنچاتا ہے۔ مہربانی کر کے مجھے ان کے دستخط دلا دیجئے۔" اس کی التجا بیکار نہیں گئی۔ گاندھی جی نے اسے بلوایا۔ اس نے آکر پھر اپنی سوانحعمری دہرائی اور اب کے اس میں اتنا اور اضافہ کر دیا۔ "میں آپ کے اور کام کے لئے دعا کرتا ہوں۔ میرا اس دنیا سے جی بھر گیا ہے۔ میں نے لڑائی کے زمانے میں فوجی خدمت کی اور خدا جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ ہم لوگوں کو سالونیکا سے گیلی پولی جانے کا حکم دیا گیا۔ ہم سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور ہم نے وہ وہ مصیبتیں اٹھائیں جو بیان نہیں ہو سکتیں۔ اب کے لڑائی ہوئی تو میں چاہے قید ہو جاؤں مگر فوجی خدمت نہیں کروں گا۔ بڑی ہولناک چیز ہے۔ مجھے آپ کے مقصد کے لئے لڑنا زیادہ پسند ہے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔" اس کے پاس اس کی بیٹی اور داماد کی تصویریں بھی تھیں جو دودھ پہنچایا کرتے تھے۔

وہ جانے کو تھا کہ گاندھی جی نے پوچھا "تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

اس نے کہا "جناب آٹھ ہیں۔ چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔"

گاندھی جی بولے "میرے چار لڑکے ہیں۔ تو آدھی دور تو میں بھی تمھارے ساتھ دوڑ سکتا ہوں۔" گھر بھر میں خوب قہقہہ پڑا۔

چارلی چیپلن | شاید بہت کم لوگوں کو یہ یقین آئے گا کہ جب گاندھی جی سے کہا گیا کہ چارلی چیپلن آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو انھوں نے سادگی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ سالہا سال سے گاندھی جی کی زندگی کا یہ رنگ ہے کہ جو چیز ان کے روزمرّہ کے کام میں جو انھوں نے اپنے لئے مقرر کر لیا ہے، دخل نہ رکھتی ہو، اس کے سُننے یا دیکھنے یا پڑھنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ مسٹر چیپلن غریبوں کے طبقے سے ہیں، انھیں کی خدمت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور انھوں نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو ہنسایا ہے، تو وہ اس پر راضی ہو گئے کہ ڈاکٹر کٹیال کے گھر پر اُن سے ملاقات کریں، جنھوں نے گاندھی جی کے قیام لندن کے زمانہ میں اپنی خدمات اور اپنی موٹر کار ہم لوگوں کے لئے وقف کر دی تھی۔ میں نے مسٹر چیپلن کو ملنسار اور منکسر مزاج پایا اور جیسے وہ فلم میں معلوم ہوتے ہیں وہ بات بالکل نظر نہ آئی لیکن غالباً ان کا کمال یہ ہے کہ اپنے آپ کو چھپائیں۔ گاندھی جی نے تو ان کا ذکر نہیں سنا تھا مگر انھوں نے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کے چرخے کا ذکر سُن رکھا تھا کیونکہ سب سے پہلا سوال انھوں نے یہی کیا کہ آپ مشینوں کے خلاف کیوں ہیں۔ گاندھی جی اس سوال سے خوش ہوئے اور انھیں یہ سمجھانے لگے کہ ہندستان کے کل کسان سال میں چھ مہینے بیکار رہتے ہیں اس لئے میری نظر میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ان کی پرانی ضمنی صنعت جو انھوں نے کھو دی ہے پھر سے ان کے ہاتھوں میں آجائے۔ انھوں نے پوچھا "تو یہ صرف کپڑے کی

حد تک ہے؟ گاندھی جی نے کہا "جی ہاں۔ کپڑے اور کھانے کے معاملے میں کسی قوم کو دوسروں کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم پہلے کسی کے محتاج نہیں تھے اور چاہتے ہیں کہ پھر وہی بات ہمیں حاصل ہو جائے۔ انگلستان کو جو بڑے پیمانے پر کپڑا پیدا کرتا ہے چاہیئے کہ اپنے مال کے لئے کوئی اور بازار ڈھونڈھے۔ ہم اپنے تجارتی لوٹ کہتے ہیں۔ جب لٹیرا انگلستان دنیا کے لئے خطرناک ہے تو ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان بھی لٹیرا بن جائے اور مشینوں سے کام لے کر اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ کپڑا پیدا کرنے لگے تو وہ کیسا کچھ، خطرناک نہ ہوگا۔

مسٹر چیپلین فوراً بات کی تہ کو پہونچ گئے اور کہنے لگے "تو یہ مسئلہ صرف ہندوستان تک محدود ہے، فرض کیجئے آپ کو ہندوستان میں روس کی سی آزادی میسر ہوتی۔ آپ اپنے بے روزگاروں کے لئے دوسرے کام مہیا کر سکتے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام ہو سکتا تب تو آپ مشینوں کو حقیر نہ سمجھتے آپ بھی اس کی حمایت کرتے کہ کام کے گھنٹے کم ہوں اور مزدوروں کو زیادہ فرصت ملے؟"

گاندھی جی نے کہا "بے شک۔"

اس مسئلے پر گاندھی جی سے خدا جانے کتنی بار لوگ گفتگو کر چکے ہیں مگر میں نے باہر کے لوگوں میں سے کوئی غیر ماہر فن ایسا نہیں دیکھا جس نے معاملے کو اتنے جلدی سمجھ لیا ہو۔ اس کا سبب غالباً ان کی بے تعصبی اور ہمدردی تھی۔

اس ہمدردی کا پورا اظہار اس وقت ہوا جب سروجنی دیوی نے انھیں یاد دلایا کہ وہ انگلستان کا جیل خانہ دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ انھوں نے

کہاں ہیں امیروں کے مجمع کا سامنا کر سکتا ہوں مگر ان قیدیوں سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ اگر خدا کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو تو بھی آج انھیں کے ساتھ ہوتا۔ انسان کچھ کر تو سکتا نہیں۔ اپنی بے بسی پر جھلا کے رہ جاتا ہے۔ ہم میں اور ان میں سوائے اس کے کیا فرق ہے۔ کہ وہ کٹہرے کے اندر ہیں ؟ میں اس کا حامی ہوں کہ جیل خانوں میں ایک سرے سے اصلاح ہو۔ جرم بھی بیماریوں کی طرح ایک بیماری ہے اور اس کا علاج جیل خانے میں نہیں بلکہ اصلاح خانے میں ہونا چاہیئے۔"

سلطنت نہیں بلکہ قوموں کی شرکت

گاندھی جی نے ایک طالب علم کے سوال کے جواب میں کہا "لاہور کا رزولیوشن اور کراچی کا رزولیوشن بالکل ایک ہے۔ کراچی کے رزولیوشن میں لاہور کے رزولیوشن کا ذکر اور اس کی مزید تائید ہے۔ لیکن اس میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ برطانیہ کے ساتھ باعزت شرکت کامل آزادی کے منافی نہیں ہے۔ جس طرح امریکہ اور انگلستان میں شرکت ممکن ہے اسی طرح ہندوستان اور انگلستان میں بھی ممکن ہے۔ کراچی کے رزولیوشن کا منشا اس حد تک قطع تعلق کا ہے کہ ہم سلطنت کے اندر نہیں رہنا چاہتے مگر ہندوستان کا انگلستان کے ساتھ شریک ہو کر رہنا کوئی ناممکن چیز نہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب میں "مقبوضات کے مرتبے" پر جان دیتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم ہوا کہ "مقبوضات کا مرتبہ" وہ ہے جو ایک ہی خاندان کی ریاستوں یعنی آسٹریلیا، کناڈا، جنوبی افریقہ، نیوزیلینڈ وغیرہ کو حاصل ہے۔ یہ سب انگلستان کی بیٹیاں ہیں اس معنی میں جس میں ہندوستان نہیں آسکتا۔ ان ملکوں کی اکثر آبادی کی مادری زبان انگریزی ہے اور انھیں جو مرتبہ ملا ہے اس میں

انگلستان کے ساتھ رشتے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لاہور کانگریس نے ہندوستانیوں کے دل سے سلطنت کے اندر رہنے کا خیال مٹا دیا اور ان کی منزل مقصود کامل آزادی قرار دی۔ کراچی کانگریس نے اس کی تشریح کر دی کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے بھی ہم برطانیہ کے ساتھ شرکت کر سکتے ہیں۔ بہ شرطیکہ اس کی یہ خواہش ہو۔ جب تک سلطنت کا خیال باقی ہے ہماری سیاست کا مرکز ڈاؤننگ اسٹریٹ ہو گی۔ لیکن جب ہندوستان برطانیہ کا آزاد شریک ہو گا تو بجائے ڈاؤننگ اسٹریٹ کے دہلی مرکز بن جائے گی۔ آزاد شریک کی حیثیت سے ہندوستان دنیا کے سامنے جو لڑائی اور خونریزی سے عاجز آگئی ہے ایک نئی چیز پیش کرے گا جہاں کہیں لڑائی چھڑنے کا اندیشہ ہو گا تو ہندوستان اور برطانیہ کی مشترکہ کوشش یہ ہو گی کہ اُسے روکے۔ فوجی قوت سے نہیں، بلکہ اپنی مثال کے اثر سے، جس سے بچنا ناممکن ہے۔ ممکن ہے یہ آپ کو بے سر و پا دعوے معلوم ہو اور آپ اس پر ہنسیں۔ مگر قوم کا نمائندہ جو آپ کے سامنے حاضر ہے یہی مطالبہ کرنے کو آیا ہے اور اس سے کم پر ہرگز راضی نہیں ہو گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ میں مغلوب ہو کر جاؤں گا مگر ذلیل ہو کر نہیں۔ اس کے سوا کوئی چیز میں منظور نہیں کروں گا اور اگر اس میں ناکامی ہوئی تو میں قوم کو بہت دنوں آگ کے امتحان میں تپنے کی دعوت دوں گا اور آپ کو بھی لکھوں گا کہ دل سے میرا ساتھ دیجئے۔"

ایک اور جلسے میں انھوں نے کہا "ہماری بے تشدد تحریک کا مقصد ہندوستان کے لئے غیر مشروط کامل آزادی حاصل کرنا ہے کسی پُراسرار باطنی معنی میں نہیں بلکہ اسی معنی میں جس میں یہ لفظ انگریزی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ میرے نزدیک

اس کا حق ہر ملک کو ہے۔ قابلیت یا ناقابلیت کا یہاں کوئی سوال نہیں جس طرح ہر ملک کھانے پینے، سانس لینے کے قابل ہے اسی طرح ہر قوم اس قابل ہے کہ اپنے معاملات کا انتظام آپ کرے خواہ وہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو۔ جس طرح اس شخص کو جس کے پھیپھڑے خراب ہیں سانس لینے میں مشکل ہوتی ہے اسی طرح ممکن ہے کہ ہندوستان اپنے اندرونی امراض کے سبب سے ہزارہا غلطیاں کرے۔ حکومت کی قابلیت کا اصول محض دھوکا دینے کے لئے ہے۔ آزادی کے معنی بس یہ ہیں کہ اختیار غیر قوم کے ہاتھ سے لے لیا جائے۔"

"اختیار غیر قوم کے ہاتھ سے لے لینے" کا مطلب گاندھی جی نے اس تقریر میں وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا جو انھوں نے ہندوستانی تاجروں کے سامنے کی۔ "کانگریس نے غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہماری مالیات پر ہمارا پورا پورا قبضہ ہونا چاہیئے۔ بغیر اس کے کوئی دستور یا کسی قسم کی نام کی خود مختاری قوم کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ آپ جانتے ہیں مجھے کانگریس سے جو ہدایت ملی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ کامل آزادی اس وقت تک محض بے معنی ہے جب تک اس کے ساتھ مالیات، ملکی حفاظت اور امور خارجہ کے پورے پورے اختیارات نہ ہوں۔ میں تو کامل آزادی کیا معمولی ذمہ دار حکومت کا تصور بھی بغیر اس کے نہیں کر سکتا کہ ہمیں اپنی فوج اور مالیات پر پورا اختیار ہو۔"

کچھوے کی چال یہ سچ ہے کہ گاندھی جی کامل آزادی چاہتے ہیں اور اس سے کم پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے مگر اسی کے ساتھ انھیں اس کام کی دشواریوں کا بھی اچھی طرح احساس ہے۔ جوں جوں کانفرنس

اپنی کچھوے کی چال سے آگے بڑھ رہی ہے انھیں یہ یقین ہوتا جاتا ہے، کہ آزادی حاصل کرنا ہفتخوان[۵] سر کرنے سے کم نہیں۔ کانفرنس کے ارکان قوم کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ سر علی امام نے خوب کہا ہے کہ "وزیراعظم کی نظرِ انتخاب کے نمائندے" ہیں۔ وزیراعظم فرماتے ہیں "میں صدقے کا بکرا نہیں بننا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ سب خود ہی اپنے اپنے صدقے کے بکرے بنیں"۔ بے سمجھے اس طرح کی پھبتی کہنا ان کا خاص وصف ہے۔ یہاں کے اخبارات نے ان کا کارٹون مصر کے ابوالہول کی شکل میں بنایا ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جو مسلمان دوست یہاں ہیں وہ قومیت پسند مسلمانوں کے نام سے چڑتے ہیں اور وہ شخص جسے خود ان لوگوں نے دس سال پہلے سچا کھرا قابل قدر آدمی کہہ کر گاندھی جی سے ملایا تھا اور جو اس نازک وقت میں برابر قوم کا ساتھ دیتا رہا اب ان کے نزدیک ایسا ہو گیا کہ مسلمانوں کی ایک اہم جماعت کے خیالات ظاہر کرنے کے لئے اس کا آنا ضروری نہیں تھا۔ ہندو دوست اس بات پر چراغ پا ہیں کہ گاندھی جی مسلمانوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو تیار ہیں اور چھوٹی اقلیتوں کے نام کے نمائندوں کو یہ ڈر ہے کہ اس میں ان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ گاندھی جی کا کہنا کون سنتا ہے کہ جو شخص قومی مقصد کی خدمت کرنا چاہتا ہے وہ حقوق کا مطالبہ نہ کرے بلکہ حقوق مانگنے والوں کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ انھوں نے جوش میں آکر کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر اس کمبخت مسئلے کو حل کرنا میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے یوں ہی لٹکا

---

[۵] شاہنامے کی تلمیح۔ رستم کے سات بہادری کے کارنامے ہفتخوان کہلاتے ہیں۔

رہنے دیتا اور اپنی قوم کو ساری دُنیا کے سامنے ذلیل کرتا؟"

دوسری طرف حکومت بھی کوئی قطعی بات نہیں کہتی۔ غالباً اُسے چُپ چاپ تماشا دیکھنا زیادہ پسند ہے۔ گاندھی جی نے کل رات اس دعوت میں جو لندن کے ہندوستانیوں کی طرف سے ہوئی تھی صاف صاف کہا "حکومت نے اپنے ارادے کو ظاہر نہیں کیا ہے مگر وہ وقت جلد آرہا ہے کہ اُسے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ کانفرنس کے ارکان جو اپنے اپنے گھر سے چھ ہزار میل کا سفر کرکے آئے ہیں یہاں اپنا وقت فضول باتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے جس وقت یہ اندازہ ہوگیا کہ برطانوی وزرا یا برطانوی جمہور جن کی رائے پر اثر ڈالنے کی میں پوری کوشش کر رہا ہوں میرے سمجھائے نہیں سمجھتے۔ اسی دن آپ دیکھیں گے کہ میں انگلستان کو خیر باد کہہ کر چلا جاؤں گا۔"

اس موقع پر میں گاندھی جی کی اس پرزور تقریر کا بھی ذکر کردوں، جو انھوں نے چار پانچ سو دوستوں کے مجمع میں کی تھی۔ یہ لوگ ان کی سالگرہ کے دن ان کے اعزاز میں جمع ہوئے تھے اور مسٹر فینر براکوے نے ان کی طرف سے گاندھی جی کو یقین دلایا تھا کہ مستقبل قریب میں ہندوستان جو مہم شروع کرے گا اس میں سب کے سب دل سے ساتھ دیں گے۔ مسٹر براکوے نے واقعات کے رنگ کو سمجھ لیا تھا اور ان کی تقریر کے صریحی خلوص کا یہ اثر ہوا کہ جو باتیں اس وقت گاندھی جی کے پیش نظر نہ تھیں، بلکہ ان کے دل کی تہ میں چھپی ہوئی تھیں، وہ زبان پر آگئیں۔

آئندہ کام آنے والے دوست	مسٹر براکوے اور ان کے ساتھی وقت پر کام آنے والے دوست ثابت ہوئے

یوں بھی گاندھی جی اپنے دوستوں کا حلقہ تیزی سے بڑھا رہے ہیں جن سے وقت پر مدد ملے گی اور مسٹر براکوے کی منچلی جماعت کو تقویت پہنچے گی۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کی غلط تعلیم اور اخباروں کے مُضر پرچار کی بدولت لوگوں کی ناواقفیت بڑھی ہوئی ہے مگر اب یہ خواہش عام طور پر ظاہر کی جا رہی ہے کہ ہندوستان کے صحیح حالات معلوم ہوں اور نوجوانوں کی بہت سی ٹکڑیاں گاندھی جی سے گفتگو کرنے کے لئے آچکی ہیں۔ ان میں قابل ذکر آکسفورڈ والے ہیں۔ یہ آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت ہے جن میں سے بعض مشرقی لندن میں رہ پڑے ہیں اور بعض اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتے ہیں اور یہ سب وہاں کے غریب باشندوں کی خدمت کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے انھیں اختصار سے ہندوستان کے مطالبات سمجھائے اور انھوں نے خالص تحقیق کی نیت سے بہت سے سوال کئے ان میں چند سوال اور ان کے جواب ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کا قبضہ فوراً اُٹھ جائے؟"

تغیر کا درمیانی زمانہ	"بے شک۔ میرا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ عمل بتدریج واقع ہو۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ برطانیہ سے قطع

تعلق ہو جائے۔ اگر انگلستان شرکت پر راضی ہو تو میں بہت خوشی سے منظور کروں گا مگر یہ شرکت سچ مچ کی شرکت ہونا چاہیئے یہ نہیں کہ اس کے پردے میں حکومت اور نگرانی مدنظر ہو۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ میں سے بعض کو خلوص کے ساتھ یہ خوف ہے کہ جیسے ہی انگریز ہندوستان سے ہٹیں گے

بدنظمی اور خونریزی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ فرض کیجئے یہ صحیح ہے تو اگر انگریز
چاہیں تو ہمیں اس طوفانِ بے تمیزی سے نکال سکتے ہیں جو بڑی حد تک انھیں
کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مختلف فرقوں میں جھگڑا ڈالنے کی اور ساری قوم کو جسمانی
حیثیت سے کمزور کر دینے کی ذمّہ داری زیادہ تر انھیں پر ہے۔ میں مانتا ہوں
کہ اگر آپ لوگ فوراً ہندوستان سے چلے آئیں تو ہمیں عارضی دقت ضرور
ہوگی۔ لیکن آپ چاہیں تو اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں بشرطیکہ
آپ ہمارے ماتحت رہنا منظور کریں۔ لیکن آپ کے بے جا نسلی غرور کا کیا علاج
ہے؟ مجھے تو خوشی ہوگی کہ ہماری قومی حکومت کے ماتحت برطانوی سپاہی
اور برطانوی افسر کام کریں اور ہم ان کے مشورے پر عمل کیا کریں لیکن نظم و
نسق کے اعلیٰ اختیارات ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہئیں۔ اور اگر آپ کے
آنے کے بعد ہمیں تربیت یافتہ مددگار نہ بھی ملیں تب بھی ہمیں اپنے عدمِ تشدّد
پر پورا بھروسہ ہے۔ میرا یہ خیال نہیں کہ ہم برطانوی قوت اور برطانوی مدد
کے ہٹنے کے بعد، جو آج ہم پر زبردستی مسلّط ہے ہم پنپ نہ پائیں گے۔ اگر
یہ چیزیں بدستور مسلّط رہیں تو میرے دل میں آزادی کی گرمی کہاں خاک پیدا
ہوگی۔ اور میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں آزادی کے لئے لڑ کر جان دینے کا
موقع ملے تاکہ اور کچھ نہیں تو ہماری آنکھیں تو کھل جائیں ۔ آپ افغانوں
سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ تم آزادی کے قابل ہو یا نہیں؟ آخر ہماری
تہذیب ان کی تہذیب سے تو کم نہیں۔ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک
انسان کسی قدر وحشی نہ ہو وہ نہ آزاد ہو سکتا ہے اور نہ رہ سکتا ہے؟
خیر اگر ہماری قوم بزدل ہے تو آپ جس قدر جلد ہمیں برباد ہونے کے
لئے چھوڑ دیں اتنا ہی اچھا ہے تاکہ زمین کسی طرح بزدلوں کے بوجھ سے

ہلکی ہو۔ مگر بزدل ہمیشہ بزدل نہیں رہ سکتے۔ آپ نہیں جانتے کہ میں بچپن
میں کتنا بزدل تھا اور آپ یہ مانیں گے کہ آج میں کچھ ایسا بزدل نہیں ہوں
میری سی مثال اوروں کی بھی سمجھئے تو آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ ساری قوم ایک
دن بزدلی کے پنجے سے چھوٹ جائے گی۔"

"کیا ہندوستان کو عیسائیت سے فائدہ پہنچا ہے؟"

عیسائیوں کا اثر

"ہاں بالواسطہ فائدہ پہنچا ہے۔ میں اس کا ذکر بارہا کر چکا ہوں۔ بعض شریف النفس عیسائیوں کے
سابقہ سے ہمیں فائدہ پہونچنا لازمی تھا۔ ہم نے ان کی زندگی کا مطالعہ کیا
ان سے ملتے جلتے رہے اور قدرتی طور پر ان کے اثر سے ہماری سیرت میں
پاکیزہ صفات پیدا ہوئیں۔ مگر جہاں تک خاص مشن والوں کی جدّوجہد کا
تعلق ہے۔ مجھے اپنی رائے کے اظہار میں بہت احتیاط برتنا پڑتی ہے۔ کم
سے کم میں یہ کہوں گا مجھے اس میں شبہ ہے کہ ان سے ہندوستان کو فائدہ
پہونچا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے ہندوستان کو،
عیسائیت سے متنفر کر دیا ہے اور عیسائیوں اور ہندو مسلمانوں کی زندگی
کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ جب میں آپ کی مقدس کتابیں
پڑھتا ہوں تو مجھے یہ دیوار نظر نہیں آتی۔ لیکن جہاں میں نے کسی مشنری کو
دیکھا میرے آگے یہ دیوار اُٹھنا شروع ہو جاتی ہے۔ آپ میری اس شہادت
کو قبول کیجئے کیونکہ میں خود ایک زمانے میں ان اثرات سے متاثر تھا؟
مشنری کالجوں اور ہسپتالوں میں کام کرتے ہیں انھوں نے بھی ہماری
خدمت اس لاگ سے کی ہے کہ کالج اور ہسپتال کے ذریعے سے لوگ
عیسائی مذہب اختیار کریں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آپ عیسائیت

کی خوشبو ہمارے دماغ تک پہونچانا چاہتے ہیں تو آپ کو گلاب کا سا ہونا چاہیئے۔ گلاب بے اختیار لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کی خوشبو آپ ہی آپ ان میں بس جاتی ہے۔ عیسائیت کی خوشبو گلاب سے بھی لطیف تر ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ خاموشی کے ساتھ پھیلے۔

چچا گاندھی

مسٹر کارٹر ایک اہم شاہی کمیشن کے رکن ہیں جو شراب کی بھٹیوں کی تحقیقات کے لئے مقرر ہے اور شراب نوشی کی اصلاح کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ وہ تشریف لائے کہ یہ معلوم کریں کہ ہندوستان میں شراب کی تجارت کا کیا حال ہے، اور اس مسئلے کے متعلق ایک جلسہ کرنے کی بات چیت کریں۔ انھوں نے دیکھا کہ عام لوگ گاندھی جی سے ملنے کے لئے سیلاب کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ اور کہنے لگے "آپ ان کے سچے نمائندے ہیں اور ان کی یہ خوشی ہے کہ آپ یہیں بس جائیں۔ مسٹر لیسٹر نے کہا یہ آپ کا حلقۂ انتخاب ہے۔ گاندھی جی کے پاس ان نئے دوستوں کی طرف سے بے شمار سالگرہ کے تحفے آرہے ہیں۔ بہت سے بچوں نے پھول بھیجے ہیں جو انھیں بہت پیارے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ "چچا گاندھی" کو یہ دن بار بار نصیب ہو۔

بہت سے نہایت دلچسپ سوال ہندوستانی طالب علموں کے اس جلسے میں کئے گئے جہاں گاندھی جی رات گئے تک انھیں ہنسی مذاق اور شفقت آمیز طنز سے محظوظ کرتے رہے۔

<u>"کیا مسلمانوں سے آپ کا اتفاق رائے کا مطالبہ اتنا ہی مہمل نہیں ہے جتنا ہم سے حکومت کا یہ مطالبہ کہ آپس میں متفق ہو جاؤ؟ آپ یہ کیوں نہیں</u>

کرتے کہ سب کچھ چھوڑ دیں مگر اس عظیم الشان مسئلے کے حل ہونے میں رکاوٹ نہ ڈالیں ؟"

محبّت اور سنگینوں کا مقابلہ

آپ دوہری غلطی کر رہے ہیں ایک تو یہ کہ میں نے جو بات مسلمانوں سے کہی اسے آپ اس بات سے تشبیہ دیتے ہیں جو حکومت ہم سے کہہ رہی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں بہت مشابہت ہے۔ لیکن آپ غور کریں تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے۔ انگریز جو کچھ کہتے ہیں سنگین کے بل پر کہتے ہیں اور میں جو کہتا ہوں وہ دل سے ہے اور محبّت کے بل پر ہے۔ جرّاح اور ظالم قاتل دونوں ایک ہی بیے کو استعمال کرتے ہیں لیکن نتیجہ اس کے ہاتھ سے کچھ اور ہوتا ہے اس کے ہاتھ سے کچھ اور میں نے تو یہ کہا ہے کہ میں کسی مطالبے کو پورا نہیں کرا سکتا جب تک سب مسلمان اس کی تائید نہ کریں۔ میں محض اکثریت کی رائے پر کیسے چل سکتا ہوں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ دوستوں کی ایک جماعت ایک چیز چاہتی ہے مگر ایک دوسری جماعت ان رفیقوں کی ہے جن کے ساتھ میں اسی معاملہ میں مدّت سے کام کر رہا ہوں اور جنھیں کچھ دن ہوئے خود ان پہلی جماعت والوں نے مجھ سے یہ کہہ کر ملایا تھا کہ یہ ہمارے نہایت قابل قدر شریک کار ہیں؟ اب میں ان لوگوں سے کیونکر بے وفائی کروں ؟

اور پھر یہ دیکھئے کہ میرے اختیار میں کیا چیز ہے جو میں کسی کو دے سکوں ؟ میں نے تو ان سے بس اتنا کہا تھا کہ اگر ان کا مطالبہ اتفاق رائے کے ساتھ ہو تو میں اس کی حمایت کروں گا۔ اب رہی یہ بات کہ جو لوگ حقوق چاہتے ہیں میں ان کے آگے سر جھکا دیتا ہوں یہ تو میرا عمر بھر کا

اُصول ہے۔ اگر میں ہندوؤں کو اس پہ آمادہ کر سکتا کہ وہ میرا اصول اختیار کرلیں تو یہ مسئلہ فوراً طے ہوجاتا لیکن وہاں تو مجھے پربت پار کرنا ہے اس لئے میرے یہ الفاظ محض حماقت کے نہیں تھے جیسا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔ اگر صرف میرے ہاتھ میں کوئی بات ہوتی تو میں اس کمبخت مسئلے کو ہرگز لٹکا نہ رہنے دیتا اور اپنی قوم کو ساری دنیا کے سامنے ذلیل نہ کراتا۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس مسئلے میں مجھے کسی مذہب سے تعلق نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ لیکن میرے ہندو ہونے میں اس سے کچھ خلل نہیں پڑتا کہ میں اس معاملے میں ڈب جانے پر تیار ہوں۔ جب میں نے تنہا کانگریس کی نمایندگی کا بیڑا اٹھایا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں اس مسئلے پر ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کر سکتا، بلکہ اسے قومی نقطۂ نظر سے یعنی تمام ہندوستانیوں کے حقوق اور مقاصد کے لحاظ سے دیکھوں گا۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ کانگریس کو تمام طبقوں کی اغراض کا یہاں تک کہ انگریزوں کی اغراض کا بھی محافظ ہونے کا دعویٰ ہے بشرطیکہ وہ ہندوستان کو اپنا گھر سمجھیں اور ایسے مطالبات نہ کریں جو کروروں بے زبان غریبوں کے مفاد کے منافی ہوں۔

"آپ نے کانفرنس میں دیسی ریاستوں کی رعایا کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ کیوں؟ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ نے ان کے مفاد کو قربان کردیا۔"

بات یہ ہے کہ وہ لوگ مجھ سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں گول میز کانفرنس میں دھواں دھار تقریریں کروں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ میں رئیسوں کے سامنے چند مطالبات پیش کردوں اور وہ میں نے کردیا۔ مجھے اس کی اجازت ہونا چاہیئے کہ جو میرا طریقہ ہے اس کے مطابق کام کروں۔ میں

ریاستوں کی رعایا کے لیے جو حقوق چاہتا ہوں وہ گول میز کانفرنس سے نہیں ملیں گے۔ وہ مجھے خود ان رئیسوں سے لینا پڑیں گے۔ یہی صورت ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کی ہے۔ میں مسلمانوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر ان سے جو مانگنا ہے مانگوں گا لیکن یہ میں گول میز کے پاس بیٹھ کر نہیں کر سکتا۔ آپ یہ جان لیجئے کہ میں بڑا ہوشیار وکیل ہوں۔ اور فرض کیجئے کہ میں کامیاب نہ ہوں تو آپ مجھ سے اپنا مقدمہ واپس لے لیجئے گا۔"

"آپ نے بالواسطہ انتخاب کا طریقہ کیوں منظور کر لیا؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ نہرو رپورٹ میں اس کی مخالفت کی گئی ہے؟"

"آپ کا سوال تو بہت معقول ہے مگر اس میں وہ عیب ہے جسے منطق میں مبہم حد اوسط[1] کہتے ہیں۔ نہرو رپورٹ میں جس بالواسطہ طریق انتخاب کا ذکر ہے وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ اب رہا وہ طریقہ جس کی میں نے حمایت کی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ میں اس کا روز بروز قائل ہوتا جاتا ہوں۔ آپ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ اس کا اور بالغوں کی رائے دہندگی کے اصول کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ اصول بغیر اس طریقے کے چل نہیں سکتا اس طریقے سے سات لاکھ آدمیوں کو حق انتخاب حاصل ہوگا جو خود ہندوستان کے کل بالغ باشندوں کے منتخب کئے ہوئے ہونگے اگر مہیرے طریقے پر عمل نہ کیا جائے تو انتخاب کا کام سنبھالے نہ سنبھلے گا اور اس میں بہت مصارف ہوں گے۔ بقول مین کے ہر گاؤں کی جمہوری ریاست اپنا ایک وکیل منتخب کرے اور اسے یہ ہدایت دے گی کہ ملک کی سب سے بڑی مجلس مقننہ کیلئے ایک نمائندہ منتخب کرے۔

یہ ضروری نہیں کہ جو چیز انگلستان کے اور مغربی دنیا کے لئے موزوں ہو وہی ہمارے لئے بھی موزوں ہو۔ ہمارے ملک میں صورت حال بالکل مختلف ہے آخر ہم اپنا ایک خاص طریقہ انتخاب کیوں نہ رکھیں۔

---

[1] ambiguous middle term.

(۵)

فضا کی تاریکی "ہندوستان کے دوستوں"[1] کے خاص جلسے ہیں جہاں پہلی مرتبہ سب حاضرین زمین پر بیٹھے تھے اور بہاری پرارتھنا بالکل اسی طرح ہوئی تھی جیسے ہندوستان میں ہوا کرتی ہے۔ گاندھی جی نے ان سے درخواست کی کہ ہندوستان کے اور اس کے مقصد کے لئے دعا کریں۔

"جہاں تک انسانی سعی کا تعلق ہے مجھے ہر طرف سے ناکامی نظر آتی ہے۔ مجھ پر ایسے ایسے بوجھ ڈالے جا رہے ہیں جو میرے اٹھائے نہیں اٹھتے۔ یہ سورماؤں کا کام ہے اور اس کے بعد بھی ممکن ہے سب مرحلے طے ہو جائیں یا کچھ نتیجہ نہ نکلے۔ مگر خیر مجھے اس کا غم نہیں۔ کوئی کوشش جو خلوص اور دیانت سے کی گئی آج تک کبھی ناکامیاب نہیں ہوئی۔" اقلیتوں کی کمیٹی میں انھوں نے جو تقریر کی اس کا مفہوم یہی تھا مگر سیاست کی زبان میں ادا کیا گیا تھا۔

ناکامی اور مایوسی کا تلخ پیالہ بہت کچھ بھر چکا تھا۔ اس کے لبریز ہونے میں جو کچھ کمی تھی وہ بعض نمایندوں کی تقریروں نے پوری کر دی جن کی وزیراعظم نے ہر طرح تائید کی۔ یہ نامزد کئے ہوئے حضرات کچھ بھی کہیں۔ گاندھی جی نے صورت حال کی جو تفسیر کی ہے اس کی حقیقت میں اُن لوگوں کو کوئی شبہہ نہیں ہو گا جن کے یہ نمائندے بنتے ہیں۔" ناکامی کے اسباب تو ہندوستانی وفد کی ترتیب ہی میں مضمر تھے۔ ہم میں سے قریب قریب سب لوگ ان جماعتوں کے منتخب کئے ہوئے نہیں ہیں جن کے ہم نمائندے سمجھے جاتے ہیں بلکہ حکومت کے نامزد کئے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جن کا

---

[1] Friends of India

ہونا متفقہ فیصلے کے لئے ضروری تھا یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اجازت ہو تو عرض کروں کہ اقلیتوں کی کمیٹی کو منعقد کرنے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا یہ کمیٹی اصلیّت سے خالی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمیں ابھی یہ معلوم نہیں کہ ملنے والا کیا ہے۔ اگر صاف طور پر یہ معلوم ہوتا کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ مل جائیگا تو ہم آپس کے جھگڑوں میں یہ موقع اتنی آسانی سے نہ کھو دیتے۔"

یہ بے حمیّتی

نمایندوں نے ان الفاظ کے خلاف جو احتجاج کیا اسی سے ان کی اصلیّت کا ثبوت ملتا ہے سوائے حکومت کے نامزد کئے ہوئے لوگوں کے کون اس قسم کے بیان دے سکتا ہے جیسے سر محمد شفیع اور ڈاکٹر امبیڈکر نے دیئے۔ سر محمد شفیع نے کہا "ہم لوگ جو اس کے قائل ہیں کہ ہندوستان کا مستقبل برطانوی سلطنت متحدہ کے ساتھ وابستہ ہے کسی باہر کے آدمی کی ثالثی منظور نہیں کر سکتے۔ ملک معظم کی وزارت اس سلطنت کے سردار کی حیثیت سے، اس مسئلے کا فیصلہ سب سے بہتر کر سکتی ہے اور ہم اس کو حکم بنانے پر دل سے راضی ہیں"۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا "پست طبقے کے لوگ یہ نہیں چاہتے، انھوں نے اس کے لئے کوئی احتجاج نہیں کیا، کوئی تحریک نہیں اٹھائی کہ اسی وقت اختیارات برطانوی حکومت کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں"۔ اس کا صریحاً یہ خیال ہے کہ ان کے طبقے کے حقوق ہندوستان کی آزاد حکومت کے مقابلے میں انگریزوں کی حکومت کے اندر زیادہ محفوظ رہیں گے"۔

بندر اور بلّیاں

ان حضرات کے بیانوں کی بدولت وزیر اعظم کا کام بن گیا۔ ان کی تقریر سے جو بظاہر معقول معلوم ہوتی تھی بندر اور بلیوں کا مشہور قصّہ یاد آگیا۔ خود ان کے لہجے اور آواز کے

اُتار چڑھاؤ سے، اور بار بار یہ الفاظ دُہرانے سے" میں سچ کہتا ہوں"۔ "میری بات کو یقین کیجئے" ان کا بھرم کُھل گیا۔ انھوں نے کہا "فرض کیجئے کہ میں حکومت کی طرف سے آپ سے یہ کہوں اور پارلیمنٹ بھی اسے مان لے کہ آپ ہندوستان کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیجئے تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کو ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہو جائے گا"۔ کیا کبھی سچ مچ یہ بات کہی گئی ہے؟ بجائے اس کے وزیر اعظم نے اسی تقریر میں نخوت کے انداز میں فرمایا "جب حکومت اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش کرے تو اسے آخری فیصلہ سمجھنا چاہیئے جہاں تک کہ اس عالم کون و فساد میں کوئی فیصلہ آخری فیصلہ کہا جا سکتا ہے"!!

جب انسان اس پر کمر باندھ لے کہ جو کچھ بھی ہونا ہو ہو جائے تو پھر اسے کسی بات کی پرواہ نہیں رہتی۔ اسی لئے جب گاندھی جی کے پاس چند دوست آئے جن میں سے بعض بہت خفا اور رنجیدہ تھے تو انھوں نے کہا "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ وقت آرہا ہے کہ حکومت کی اور ہماری راہ الگ الگ ہو جائے اور معاملہ ہر قدم پر صاف ہو جائے۔ اب رہے ڈاکٹر امبیڈکر تو ان پر غصہ کرنا یا ان کی بات کا بُرا ماننا فضول ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آج انھوں نے جو کچھ کہا وہ ہمارے (یعنی ہندوؤں کے) گناہوں کی مجسّم تصویر ہے"؟

ہمارے خیال میں جب یہ تو تو مَیں مَیں ختم ہو جائے گی اور لوگوں میں اپنے اوسان آجائیں گے کہ وہ ٹھنڈے دل سے پچھلے واقعات پر غور کر سکیں تو یہ قطعی فیصلہ ہو جائے گا کہ اچھوتوں کا نمائندہ اس شخص سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا جس نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا تھا "ان لوگوں کو کونسلوں میں منتخب ہونے سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ مذہبی اور معاشرتی سختیوں سے محفوظ رہیں۔ رسم و رواج نے جس کا نتیجہ قانون سے زیادہ سخت ہوتا ہے

ان کو اس قدر ذلیل کردیا ہے کہ ہر سوچنے والے ہندو کو شرم سے زمین میں گڑھ جانا چاہیئے اور اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ میرا بس چلے تو سخت سے سخت قانون جاری کردوں جس کی رو سے وہ ظلم جو نام کے اعلے طبقوں کے ہاتھ سے میرے ان ہموطنوں پر ہوتا ہے سنگین جرم قرار دیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوؤں کا ضمیر بیدار ہوگیا ہے اور بہت جلد وہ دن آنے والا ہے کہ چھوت چھات ہمارے گذرے ہوئے دور گناہ کی ایک کہانی بن کر رہ جائے گی۔"

تاریکی میں روشنی کی کرن

گاندھی جی نے ہندوستان کے دوستوں کے جلسے میں کہا "گو میرے کام میں ایسی مشکلیں پیش آرہی ہیں جن سے دل پر افسردگی چھا جائے مگر کانفرنس اور کمیٹیوں کے باہر میرے لئے ہر وقت خوشی کا سامان ہے۔ لوگ خود بخود معاملے کو سمجھ جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں باہر کا آدمی ہوں وہ میرا اور میرے مقصد کا بھلا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میرا مقصد اور میں خود جدا جدا نہیں دونوں ایک ہیں اس لئے وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے سبھی شامل ہیں میں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دیتا ہوں کہ جب تک میرا مقصد سچا ہے اور اس کے حاصل کرنے کے ذریعے پاک اور تشدد سے بری ہیں تب تک کچھ نہیں بگڑا۔"

یہاں کے اہل علم میں سے چوٹی کے لوگوں نے گاندھی جی سے میل جول پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ مسٹر بریلسفورڈ اور مسٹر لاسکی ان سے طویل گفتگو کر چکے ہیں۔ مسٹر شاڈبھنڈ ملاقات کے لئے آئے اور ان سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ انھوں نے سیاسی مسائل سے پہلو بچایا اور کہا کہ مجھے ان سے نفرت ہے،

گفتگو اس پر ہوتی رہی کہ مغربی دنیا جس دلدل میں روز بروز دھنستی جاتی ہے اس سے نکلنے کی کیا صورت ہے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم پر بحث کی اور جب گاندھی جی نے اپنے عمر بھر کے وسیع تجربے کی بنا پر ضبط نفس کی قدر و قیمت سمجھائی اور یہ بتایا کہ اسے بچوں اور بڑوں کی زندگی میں کہاں تک دخل ہے تو وہ محویت کے عالم میں سنتے رہے۔ انھوں نے پوچھا "اس کا کیا سبب ہے کہ آج کل دنیا کا سارا کارخانہ درہم برہم ہے؟ گاندھی جی نے جواب دیا "اس کا سبب یہ ہے کہ مضبوط قومیں کمزور قوموں کو بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر قوم دوسری قوم کو لوٹتی ہے۔ اور مشینوں پر میرا اصل اعتراض اسی بنا پر ہے کہ وہی اس لوٹ کا ذریعہ ہیں۔ یوں تو وہ بے جان چیزیں ہیں ان سے اچھا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور برا کام بھی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان سے برا کام لینا آسان ہے۔" مسٹر ڈیمنڈ نے پوچھا کیا آپ کے خیال میں ہمارا سب لوگ ضرورت سے زیادہ نہیں کھاتے۔ انھیں کیونکر سکھایا جائے کہ کم کھایا کرو؟" گاندھی جی نے ہنس کر جواب دیا "زمانہ آپ سکھا دے گا۔ ایک دن ان کی سمجھ میں بات آجائے گی کہ اب انگلستان کو وہ اگلی سی خوش حالی نصیب نہیں ہو سکتی۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ بہت سی قومیں ان سے مال غنیمت میں حصہ بٹانے کو تیار ہو رہی ہیں اور پھر وہ خود ہی چاروں طرف دیکھ کر پیر پھیلائیں گے۔" مسٹر ڈیمنڈ نے بہت زور دے کر کہا "اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ نازک وقت جو ہم پر پڑا ہے بہت بڑی چیز ہے۔ بے شک یہی بات ہے۔"

چند روز ہوئے لندن یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر .... آئے کہ گاندھی جی کو سلام کر لیں۔ انھوں نے کہا "مجھے ہندوستان سے محبت ہے اور آپ کا بڑا مداح ہوں۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔" گاندھی جی نے

پوچھا "کیا آپ بڑے عالم ہیں؟" وہ مسکرانے لگے۔ گاندھی جی نے کہا "سچ سچ کہیئے۔ بیجا انکسار سے کام نہ لیجئے۔ کیا آپ اتنے بڑے عالم ہیں جتنا میکس میولر تھا؟" انھوں نے کہا "ہاں ہے تو یہی بات۔ مجھے اپنی قابلیت پر بھروسا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سنسکرت کی مسند درس پر بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا۔ مجھے گیتا قریب قریب زبانی یاد ہے اور اپانشد کا میں نے خاصی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ میرا عمل اس پر ہے :-

خدا نہ تو شاستروں کے پڑھنے سے ملتا ہے نہ عقل سے نہ علم سے، نہیں بلکہ وہ خود جسے چاہتا ہے اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ اس کی معرفت عاجز اور ناچیز بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ترک سے، ریاضت سے یا کسی ظاہری بھیس سے۔ ان طریقوں سے جو عالم کام لیتا ہے اسے جنّت ملتی ہے خدا نہیں ملتا۔

گاندھی جی ہنس کر بولے "تلفظ کے معاملے میں تو ہم آپ کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں"

بہر حال، ان کے آنے سے اس قسم کے اور بہت سے لوگ آنے لگے ہیں اور ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ گو میں گاندھی جی کی کتابیں پڑھ چکا تھا مگر مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہوں گے، بہ قول ان کے "گاندھی جی کے انگلستان آنے کا گول میز کانفرنس سے قطع نظر کرکے، بجائے خود اتنا کچھ نتیجہ نکلے گا جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا"

امریکہ سے

غیر ملک کے لوگوں میں سے ظاہر ہے سب سے زیادہ امریکہ والے آتے ہیں اور جب سے گاندھی جی نے وہ عام لاسلکی پیام امریکہ بھیجا ہر ہفتے وہاں سے سینکڑوں خط آتے ہیں۔ عدم تشدد کا پیام ان کی زبان سے سُن کر وہاں کے لوگ بے حد متاثر ہوئے ہیں اور کوئی خط ایسا نہیں

جس میں اس کا ذکر نہ ہو۔ ایک صاحب لکھتے ہیں "آپ کا لاسلکی پیام بہت ہی صاف تھا۔ میں نے بڑی اچھی طرح سنا۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کی گفتگو نہایت عمدہ اور روحانیت سے معمور تھی ہمیں اس کی بہت سخت ضرورت ہے کیونکہ ہم گیت امن کے گاتے ہیں مگر سامان جنگ کا کرتے ہیں میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ یہ زرّیں جملہ اپنے قلم سے لکھ کر اپنے دستخط کر دیں۔ "خونریزی سے دنیا کا ناک میں دم آگیا ہے" میں چاہتا ہوں کہ جملہ آپ کے خط میں اپنے سالنامے میں شائع کروں جو ۹ نومبر کو شائع ہوا کرتا ہے کیونکہ جنگ عظیم کے بعد جس دن صلح ہوئی اس سے قبل کا اتوار اسی تاریخ کو پڑا تھا۔

زمرد کے جزیرے سے

ایک آئرستانی دوست نے کہا "ہم آپ ایک حال میں ہیں۔ ہمارے خیال میں آپ نے ابھی دہلیز میں ہی قدم رکھا ہے اور آپ کو بڑی بڑی کڑیاں جھیلنا ہیں۔ اس لئے چل کر ایک اور قوم کو دیکھ آئیے جو اسی مصیبت میں گرفتار ہے جس میں ہندوستان ہے اور اسی طرح لوٹی کھسوٹی جا رہی ہے۔ آپ کو آئرستان کے افلاس کا اندازہ ڈبلن کے افلاس سے ہو جائے گا۔ خاص شہر میں ۲۸ ہزار گھر ایسے ہیں جنھیں غریبوں کی جھونپڑیاں کہنا پڑے گا۔ کاشتکاروں کے افلاس کا کچھ ٹھکانا نہیں حالانکہ ہمارے یہاں بڑی پیداوار ہے۔ مہربانی کر کے ضرور تشریف لائیے اور ہمارے مسئلے کا غور سے مطالعہ کیجئے۔"

جرمنی سے

ورنر سمرمان اگرچہ سوئستانی ہیں لیکن وہ جرمنی زبان میں ایک رسالہ "تاؤ[1]" (شبنم) کے نام سے نکالتے ہیں۔ جس میں وہ عدم تشدد کے فلسفیانہ اور سیاسی پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

---

[1] Tau

پاؤل گے حبیب اور ان کی بیوی ایڈتھ نے فرانکفورٹ کے قریب مختلف نسلوں اور ملکوں کے دو سو بچے جمع کئے ہیں۔ بہ قول ان کے "یہ سب ہفتے بنگ انڈیا پڑھتے ہیں اور آپ کے سارے کاموں میں آپ کے حامی ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو اس طرح تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ وہ ہماری عدم تشدد کی زندگی سے متاثر ہوں۔ آپ یہاں بہت سے کام کرنے والے اس مقصد کے بہرہ پائیں گے جس کے لئے خدا نے آپ کو خاص اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔ آپ یہاں تشریف لائیں تو آپ کے قیام کے زمانے میں اسکول کی عمارت آپ کے لئے حاضر ہے اور اگر آپ اپنے ساتھ اپنے ہندوستانی رفیقوں کو بھی لائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔ ہم لوگ رومین رولاں کو اور دوسرے حضرات کو جو یورپ کے مختلف حصوں میں خصوصاً جرمنی میں آپ کے مقاصد کی خاطر کام کر رہے ہیں دعوت دیں گے کہ وہ یہاں آکر آپ سے ملیں۔"

ہامبرگ سے بہت سے لوگوں نے بڑی گرم جوشی کے الفاظ میں تار بھیجا۔ "ہمارا حلقہ مشنریوں کا حلقہ ہے جنھوں نے ہندوستان کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے آپ کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے۔ اس لئے ہم پکے عیسائیوں کی حیثیت سے اس شخص سے ملنا چاہتے ہیں جو عیسائی نہیں مگر اس کی زندگی عیسائیت کا سچا نمونہ ہے۔ ہم دل سے آپ کی ملاقات کے آرزو مند ہیں اس کا ہماری زندگی پر بہت بڑا اثر پڑے گا۔ کیا آپ کی کتابوں کے پڑھنے سے زیادہ آپ کے قرب کی کوئی صورت ہمارے لئے ممکن ہے؟ کیا ہم کسی وقت کسی جگہ آپ کی زیارت کر سکتے ہیں؟"

مادام مانٹیسوری کی ملاقات یادگار رہے گی۔ گاندھی جی نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "ہمارا آپ کا کنبہ ایک ہے۔" مادام مانٹیسوری

بولیں" میں آپ کو بچوں کا سلام پہنچاتی ہوں" گاندھی جی نے فرمایا
"جس طرح آپ کے ساتھ بچے رہتے ہیں میرے ساتھ بھی رہتے ہیں۔
ہندوستان میں مجھے دوستوں نے یہ صلاح دی کہ میں آپ کی تقلید کروں۔
میں نے کہا نہیں مجھے آپ کی تقلید نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس حقیقت کو جس پہ
آپ کے طریقۂ تعلیم کی بنیاد ہے اپنا لینا چاہیئے۔" مادام مانٹیسوری نے اپنی
شیریں اطالوی زبان میں کہا جس کا ترجمہ مترجم نے کر کے سنایا "اور میں اپنے
بچوں سے کہتی ہوں کہ گاندھی کے دل کو اپنا لو" پھر شکر گزاری کے لہجے
میں کہنے لگیں "مجھے معلوم ہے کہ آپ کے خطے میں لوگوں کو مجھ سے جتنا دلی
تعلق ہے اتنا یہاں نہیں" گاندھی جی نے کہا "ہاں یورپ کے باہر تو آپ کے
جتنے پیرو ہندوستان میں ہیں اور کہیں نہ ہوں گے" مادام کو جاموہ والی
یاد آ گئے اور انھوں نے فرمایا کہ میں انھیں اپنا ہندوستانی بیٹا کہا کرتی ہوں
انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ ایک دن اپنے انگریز بچوں کو لے کر آؤں گی۔

فرقہ وارانہ مسئلہ | ناظرین کو یاد ہوگا کہ کانفرنس کی بحثوں میں پہلی اہم چیز وفاقی دستوری کمیٹی میں گاندھی جی کی اسپیچ تھی اور دوسری ان کی وہ تقریر جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ فرقہ دارانہ مسئلے کے متعلق گفت وشنید ناکام رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اس تقریر سے بڑے بڑے لوگوں کا پارہ چڑھ گیا مگر اسی کے ساتھ انھیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ گاندھی جی ایسے آدمی نہیں جو سچی بات کہنے میں کسر اٹھا رکھیں۔ مانچسٹر گارجین کے سے اخبار بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھے کہ اقلیتوں کی کمیٹی خواہ مخواہ وفاقی دستوری کمیٹی کے ساتھ نتھی کردی گئی ہے اور فرقہ وارانہ مسئلے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ایک ہفتہ کے قریب تو لوگوں کو یہ یقین دلانے میں صرف ہو گیا کہ گاندھی جی کو دل سے اس بات پر اصرار ہے کہ حکومت کو اپنے ارادوں کا اظہار کر دینا چاہیئے۔

ہم ذیل میں چند سوال اور ان کے جواب درج کرتے ہیں :۔

"اگر فرقہ وارانہ مسئلہ اور سب مسائل سے زیادہ اہم نہیں ہے تو خود آپ نے ایک موقع پر یہ کیوں کہا تھا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے گا آپ گول میز کانفرنس میں شرکت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں گے"

"آپ سچ کہتے ہیں مگر ہندوستان میں انگریز اور ہندوستانی دوستوں نے بے حد اصرار کیا کہ تمھارا جانا بہت ضروری ہے۔ یہاں تک کہ میں مجبور ہو گیا۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ اور کچھ نہیں تو اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے جو تم نے لارڈ ارون سے کیا ہے تمھیں جانا چاہیئے۔ اب صورت یہ ہے

کہ یہاں مجھے ان لوگوں سے سابقہ ہے جو قومیت پسند نہیں بلکہ فرقہ پسند ہیں۔ اسی لئے اگرچہ میں خود کہتا ہوں، ہم لوگوں کے لئے بڑی شرم کی بات ہے کہ ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ناکامی کا سب سے بڑا سبب خود کمیٹی کے ارکان کی نوعیت ہے۔ یہ حقیقت سے اس قدر دور ہے کہ کہا نہیں جاسکتا۔ یہاں بعض لوگ مختلف فرقوں کے نمائندے ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان میں جمہور کی رائے لی جاتی تو وہ فرقے کانوں پر ہاتھ رکھتے کہ یہ ہمارے نمائندے نہیں ہیں"

"اچھوتوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ ڈاکٹر امبیڈکر تو آپ سے بہت خفا ہیں۔ ان کا قول ہے کہ کانگریس کو اچھوتوں کی نمائندگی کا دعوی کرنے کا کوئی حق نہیں"

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے یہ سوال پوچھا۔ مجھے ڈاکٹر امبیڈکر کے کہنے کا کوئی خیال نہیں ان کو اور ہر اچھوت کو اس کا بھی حق ہے کہ میرے منہ پر تھوک دیں۔ مگر میں آپ سے یہ عرض کردوں کہ ڈاکٹر امبیڈکر ملک کے اس حصے کی وکالت کر رہے ہیں جہاں کے وہ باشندے ہیں۔ باقی ہندوستان کی وکالت کرنے کا انھیں کوئی حق نہیں۔ میرے پاس ہندوستان کے مختلف حصوں سے اچھوت کہلانے والوں کے بہت سے تار آئے ہیں۔ جن میں کانگریس پر پورا بھروسا ظاہر کیا گیا ہے اور ڈاکٹر امبیڈکر کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ ہرگز ہمارے نمائندے نہیں ہیں۔ ان کا کانگریس پر یہ بھروسا بے سبب نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کانگریس ان کی کیا خدمت کر رہی ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ان کی آواز نہ سنی گئی تو میں ان کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کروں گا۔ اور اگر

کٹر ہندو ان کی مخالفت پر تل گئے تو ان مخالفوں کی ایک نہ چلنے دوں گا۔ برخلاف اس کے اگر انھیں خاص نمائندگی کا حق دیا گیا جس پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اصرار ہے تو اس میں خود ان کا بہت نقصان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو پرے باندھ کر ان کے مقابلے پر آئیں گے اور خواہ مخواہ کی لڑائی ٹھن جائے گی۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کو اچھوتوں کی وکالت کا حق حاصل ہے مگر آپ نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ ساری دنیا میں علیحدہ فرقوں کو اس پر اصرار ہوتا ہے کہ اپنے نمائندے خود اپنے فرقے میں سے چنیں۔ شمال کے حریت پسند لوگ مزدوروں کی سچی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ مگر مزدور چاہتے ہیں کہ ان کے نمائندے انھیں میں سے ہوں۔ آپ کے خلاف یہ امر ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ اچھوت نہیں ہیں۔"

"یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن میں جو ان کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا ہوں اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ میں کونسلوں میں ان کا نمائندہ بن کر جانا چاہتا ہوں۔ میری بھی یہی رائے ہے کہ کونسل میں ان کے نمائندے انھیں میں سے ہونا چاہئیں اور اگر وہ منتخب نہ ہو سکیں تو دستور کی رو سے منتخب شدہ ممبران کا ایزادی انتخاب[1] کرلیں۔ میری مراد ان کی نمائندگی سے یہ ہے کہ گول میز کانفرنس میں ان کا نمائندہ میں ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں کسی کو اس دعوے پر کلام ہو تو میں خوشی سے تیار ہوں کہ جمہور کی رائے لے لی جائے اور اس میں مجھے

---

[1] co-option.

ضرور کامیابی ہو گی۔"

"اس نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے متعلق بھی آپ کی رائے دلچسپ ہو گی آپ یہ تو نہ کہیں گے کہ جو مسلمان یہاں ہیں وہ اپنے فرقے کے نمائندے نہیں ہیں۔"

"بہر حال ان کا باقاعدہ انتخاب تو نہیں ہوا۔ اور یہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ بہت سے سچے قومیت پسند مسلمانوں کو خود میں نے یہاں آنے سے روکا۔ جو ان لیڈروں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ مثال کے لئے میں صرف خواجہ صاحب اور شیروانی صاحب کا نام لیتا ہوں جن سے میری واقفیت انھیں دوستوں کے توسط سے ہوئی تھی جو آج کانگریس کے خلاف ہیں۔ یہ سب لیڈر اس مسئلے کو فرقہ وارانہ اصول پر حل کرنے کے مخالف ہیں۔ اپنی ذات سے تو میں مسلمانوں کو وہ سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو وہ چاہتے ہیں اور میں رات کو پچھلے پہر تک ہندوؤں اور سکھوں کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میرا ساتھ دیں مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ آپ کے خیال میں اگر یہ سکھ حکومت کے نامزد کئے ہوئے نہیں بلکہ سکھوں کے منتخب کئے ہوئے ہوتے تو بھی میں ناکام رہتا؟ اس صورت میں ماسٹر تارا سنگھ یہاں موجود ہوتے۔ میں ان کے خیالات سے واقف ہوں۔ وہ بھی مسٹر جناح کے چودہ مطالبات کے مقابلے میں اپنے سترہ مطالبات لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر میں ان پر زور ڈال سکتا تھا۔ کیونکہ سب کچھ سہی پھر بھی وہ ہمارے رفیق جنگ ہیں۔ مگر موجودہ فضا میں اگر ہم تصفیہ کرنے میں ناکام رہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ آپ نے پہلے ہی ہماری راہ میں بہت سی رکاوٹیں ڈال

رکھی ہیں اب ایک نئی رکاوٹ یہ نہ پیدا کیجئے کہ دستور کے مسئلے سے پہلے
فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو جانا چاہیئے۔ میں ان سے کہتا ہوں آپ یہ بتائیے
کہ ہمیں کیا ملنے والا ہے۔ تاکہ اس کی بنا پر میں اس رنگ برنگ کے مجمع
میں بھی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ کوئی ایسی چیز تو ہو جو دیکھنے
والے کو نظر آئے اس سے ایک نیا پہلو نکل آئے گا اور ہمیں تصفیے میں بڑی
مدد ملے گی۔ کیونکہ میں ان سے یہ کہہ سکوں گا کہ آپ بنا بنایا کھیل بگاڑ رہے
ہیں۔ مگر اس وقت کیا چیز ہے جو میں ان کے سامنے رکھوں۔ اور فرض
کیجئے کہ اس صورت میں بھی کوئی فیصلہ نہ ہو تو میں نے اور تجویزیں بھی
بتا دی ہیں — پنچائت۔ خاص عدالت وغیرہ۔ یہ ہے سارا ماجرا۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کی نظر میں فرقہ وارانہ مسئلہ کچھ ایسا زیادہ
اہم نہیں ہے؟"

"یہ تو میں نے کبھی نہیں کہا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ مسئلہ اتنا بڑھایا گیا کہ
اصل مدعا ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ حالانکہ اسی پر زیادہ زور دینے
کی ضرورت ہے۔"

سب سے زیادہ بے لاگ سوال اس نباتاتی دوپہر کی دعوت میں
کئے گئے۔ جو سوائے ہوٹل میں امریکہ کے اخبار نویسوں کی انجمن کے
طرف سے ہوئی تھی۔ یہ بالکل مناسب بات تھی کہ دعوت خالص نباتاتی
ہو (یعنی گوشت، مچھلی، انڈے کا نام بھی نہ ہو) اور گاندھی جی نے
شکریہ ادا کرتے وقت کہا کہ اس اخلاق میں ایک خاص نزاکت ہے۔
وہ انھیں کچھ دیر پُر لطف قصے سناتے رہے کہ اخبار نویسوں نے ان کے

قول کس کس طرح غلط نقل کئے اور ایک مرتبہ تو وہ بال بال بچے ورنہ اس غلط نگاری نے ان کی جان ہی لے ڈالی تھی۔ انھوں نے کہا آپ لوگ اپنا عمل اس پر رکھئے "سچی بات، پوری بات، نہ رتی بھر کم نہ رتی بھر زیادہ" بہت سے سوال کئے گئے جن کے گاندھی جی جواب دیتے رہے۔ توقع یہ تھی کہ یہ لوگ عام سوالات پوچھیں گے جو سب کے لئے دلچسپی رکھتے ہوں لیکن یہ لوگ، اپنے آس پاس کی فضا سے اس قدر متاثر تھے کہ انھیں اس سے باہر قدم رکھنا منظور نہ تھا۔

"کیا آپ کے نزدیک کانفرنس کامیابی کے ساتھ ختم ہوگی؟"

"میں امید پرور آدمی ٹھہرا۔ اس لئے کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ تصفیہ جتنا دور بمبئی میں نظر آتا تھا اتنا ہی دور یہاں بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہت سی مشکلیں آن پڑی ہیں مجھے معلوم ہے کہ یہاں کی فضا میں کانگریس کا مطالبہ بہت معلوم ہوتا ہے حالانکہ میرے خیال میں کچھ ایسا زیادہ نہیں ہے۔"

"ان مشکلوں کو حل کرنے کی کوئی تدبیر نہیں؟"

"تدبیریں تو بہت سی ہیں مگر یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جن فریقوں سے معاملے کا تعلق ہے وہ ان پر عمل کریں گے یا نہیں۔ ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ دستور کے مسئلے کا حل ہونا فرقہ وارانہ مسئلے کے حل پر موقوف ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے اور میرے خیال میں اس اُلٹی شکل میں پیش کرنے کی وجہ سے مسئلہ اور مشکل ہوگیا ہے اور اسے ایسی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، جو سراسر مصنوعی ہے اس کو معاملے کا مرکز بنا دینے کی وجہ سے وہ فرقے جن سے تعلق ہے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے مطالبات دل کھول کر بڑھا سکتے ہیں

اس طرح ہم ایک چکّر میں پڑ گئے ہیں جس سے نکلنا مشکل ہے اور صلح کا کام روز بروز دشوار ہوتا جاتا ہے۔ مگر مجھے تو ان دونوں مسئلوں میں کوئی تعلق نظر ہی نہیں آتا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو یا نہ ہو، ہندوستان تو آزاد ہو کر رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بڑا کٹھن وقت آئے گا مگر اس سے آزادی تو رک نہیں سکتی۔ کیونکہ جہاں ہم آزادی کے قابل ہوئے فوراً آزاد ہو جائیں گے۔ آزادی کے قابل ہونے سے مراد ہے اس کی خاطر کافی تکلیفیں سہنا، اس انمول دولت کی انمول قیمت بھرنا۔ اگر ہم نے تکلیفیں نہیں سہی ہیں، قیمت نہیں بھری ہے، تو اس مسئلے کے حل ہو جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر ہم کافی تکلیفیں برداشت کر گئے، کافی قربانی کر گزرے تو اس کے حل کرنے کے لئے نہ دلیلوں کی ضرورت ہوگی نہ گفت و شنید کی۔ مگر اس کا فیصلہ کرنے والا میں کون ہوتا ہوں کہ ہم نے کافی تکلیفیں سہہ لی ہیں یا نہیں؟ جب میں آیا تھا تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ ہم کافی تکلیفیں سہہ چکے اور مجھے اپنے آنے پر ذرا بھی ندامت نہیں ہے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں میرا اصلی کام کانفرنس کے باہر ہے۔ اسی وجہ سے بہت سی مصروفیتوں کے باوجود میں آپ لوگوں کے یہاں حاضر ہوا تھا کیونکہ اسے بھی میں اپنے کام کا ایک جزو سمجھتا ہوں۔"

"یہاں کے عام انتخابات سے آپ کے کام میں دشواری پیدا ہو گئی ہے؟"

"برطانیہ کے بھلے کے لئے یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے اگر برطانوی مدبّر یہ سمجھ لیں کہ انگلستان اور ہندوستان کی لڑائی سے خواہ وہ بے تشدد ہی کیوں نہ ہو، مالی حالت اور نازک

ہو جائے گی تو وہ عام انتخابات کی وجہ سے ہمارے مسئلے کے تصفیے میں رکاوٹ نہیں پڑنے دیں گے۔ انھیں جان لینا چاہیئے کہ اگر ہندوستان کے مطالبات پورے نہیں ہوئے تو بڑا سخت مقاطعہ ہوگا اور برطانیہ کو ساری توجہ اپنی ہندوستانی تجارت کی حفاظت میں صرف کرنا ہوگی جو تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ بہ خلاف اس کے اگر دونوں میں باعزت شرکت ہو تو برطانیہ کو اپنی اندرونی گتھیوں کے سلجھانے کی زیادہ مہلت ملے گی۔ لیکن ہماری راہ میں ایک اور بڑی مشکل ہے۔ جب تک ہندوستان پر سنگین سے حکومت ہو رہی ہے برطانوی وزیر ہندوستان کے فاقہ کش غریبوں پر لالچ کی نظریں ڈالتے رہیں گے اور ہندوستان سے رتی رتی سونا اور چاندی کھینچ کر لے جایا کریں گے۔ یہ لازمی نہیں کہ وہ بد نیتی سے جان بوجھ کر ایسا کریں۔ بلکہ ضرورت انھیں مجبور کر دے گی۔ اس لئے کہ جب بے روزگاری اور افلاس ملک پر مسلط ہو اور اسے دور کرنے کا کوئی ذریعہ نظر آئے خواہ اس میں کسی اور ملک کو لوٹنا ہی کیوں نہ پڑے، تو مدبروں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہر چیز کو سود سے کے کانٹے میں تولیں گے اور اخلاقی ضابطے کی پوری پوری پابندی کریں گے۔ پھر وہ ایسی حرکات مذبوحی پر مجبور ہو جائیں گے جیسے ہندوستان کے سکے میں اتار چڑھاؤ کرنا۔ ممکن ہے اس سے مصیبت کچھ دن کے لئے ٹل جائے۔ جو ہونے والا ہے وہ ایک روز ہو کر رہے گا۔"

نوجوانوں کے ساتھ

گاور اسٹریٹ کے ہندوستانی طالب علموں کے جلسے میں بالکل ہندوستانی سماں نظر آتا تھا۔ ہندوستانی قومی گیت اور قومی ترانہ یہاں ہم نے پہلی بار سنا۔ ہماری پرارتھنا بھی یہاں

ہوئی جس کے لئے یہ فضا بہت موزوں تھی۔ ساری کارروائی بڑی شان اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوئی۔ ایک اور جلسہ ہوا جس میں ایک حبشی طالب علم نے جو افریقہ کے ساحل زریں کا رہنے والا تھا، ایک روسی ایک کوریائی اور ایک انگریز طالب علم نے بہت سی باتیں پوچھیں اور اگر وقت ہوتا تو اور بہت سے لوگ سوالات کرتے۔ اس جلسے میں طلب حق کا رنگ چھایا ہوا تھا، جس سے گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ ان کو جوش آ گیا اور انھوں نے اس موضوع پر کہ موجودہ صنعتی دور میں حق اور محبت کی کیا اہمیت ہے وہ درس دیا جس نے دلوں کو ہلا ڈالا۔ دونوں جلسوں میں انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اپنے پیارے بچوں کے حلقے میں ہوں اور ان کا بے اختیار جی چاہا کہ انھیں ایک روحانی پیام دے جائیں جسے وہ یاد رکھیں اور اپنی زندگی میں برتیں۔ اس تقریر سے جو ہم آگے نقل کرتے ہیں زیادہ موثر اور دلنشیں کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے تمہید کے طور پر گاندھی جی نے بتایا کہ کانگریس نے آزادی حاصل کرنے کے پرانے طریقے کو چھوڑ کر جس میں دوسروں کو اذیت پہنچائی جاتی تھی، نیا طریقہ اختیار کیا ہے جس میں اہل الشان خود اذیت اٹھاتا ہے اور ملک نے بہت سی تکلیفیں سہنے کے بعد انھیں اپنا واحد نمائندہ بنا کر بھیجا ہے "اس امید پر کہ جو تکالیف ہندوستان نے جھیلی ہیں ان سے برطانوی وزیروں اور عام اہل برطانیہ کے دل پر کافی اثر ہو چکا ہے اور اب دلیل، حجت، بحث، گفت و شنید کی ضرورت نہیں رہی" اور وہ حتی المقدور پھر کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان میں وہ ہلاکت خیز ہنگامہ برپا نہ ہو جس کا خوف ہے۔

ایک اُمید انھوں نے اپنے اس کام کا ذکر کرتے ہوئے جو وہ کانفرنس کے باہر کر رہے ہیں کہا "ممکن ہے کہ جو بیج اب بویا جا رہا ہے وہ برطانیہ کے دل کو نرم کر دے اور اس کا یہ نتیجہ ہو کہ انسانوں کے حیوان بننے کا عمل رک جائے۔ میں نے بربریت کو اس کی خوفناک شکل میں پنجاب میں دیکھا ہے۔ مجھے دوسرے مقامات پر بھی اس سے سابقہ پڑا ہے۔ اس پندرہ سال کے تجربے نے اور تاریخ کے مشاہدے سے مجھے یہی منظر بار بار دکھایا ہے۔ میں اپنی ساری کوشش اس میں صرف کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا ہولناک سانحہ پھر کبھی نہ پیش آسکے۔ مجھے جتنی فکر اس کی ہے کہ انسان حیوان نہ بننے پائیں اتنی اس کی نہیں کہ میری قوم کو تکلیفیں نہ سہنا پڑیں۔ مجھے معلوم ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر تکلیف اٹھاتے ہیں وہ اپنی اور ساری نوع انسانی کی اخلاقی سطح کو بلند کر دیتے ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لوگ اپنے مخالفوں پر فتح پانے یا کمزور قوموں کو لوٹنے کی بے تحاشا کوشش میں حیوان بن جاتے ہیں وہ خود بھی پستی کے گڑھے میں گرتے ہیں اور دوسرے انسانوں کو بھی گراتے ہیں۔ بھلا مجھے یا کسی شخص کو بھی اس سے خوشی ہو سکتی ہے کہ انسانی فطرت کو کیچڑ میں لتھڑا ہوا دیکھے۔ اگر ہم اس خدا کی مجازی اولاد اور اسی بحرِ وحدت کے قطرے ہیں تو ہم ہر شخص کے گناہ میں شریک ہیں خواہ وہ ہماری قوم کا ہو یا غیر قوم کا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی شخص پر بہیمیت کا غلبہ دیکھ کر کتنی کراہت ہوتی ہے خصوصاً انگریزوں پر جن میں میرے بہت سے دوست ہیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ جو کوشش میں کر رہا ہوں اس میں میری مدد کیجیے"

طالب علموں کے کرنے کا کام

ہندوستانی طالب علموں سے میری التجا ہے کہ آپ لوگ اس مسئلے پر خوب اچھی طرح غور کیجئے اور اگر آپ واقعی عدم تشدد اور حق کی قوت کے قائل ہو جائیں تو خدا کے لئے ان دونوں چیزوں کو اپنی روزانہ زندگی میں برتئے۔ آپ اس معاملے میں جو کچھ بھی کریں گے اس سے مجھے اس لڑائی میں مدد ملے گی۔ ممکن ہے کہ جن انگریز مردوں اور عورتوں سے آپ کو سابقہ پڑے وہ دنیا کو یقین دلائیں کہ ہندوستانی طالب علموں سے زیادہ سچے اور نیک طالب علم انھوں نے کہیں نہیں دیکھے۔ کیا آپ کے خیال میں اس سے ہماری قوم کی عزت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر نہیں بیٹھ جائے گا؟

کانگریس کی سنہ ۱۹۲۰ء کی قرارداد میں "تزکیہ نفس" کا لفظ آیا تھا۔ اس لفظ سے کانگریس کی آنکھیں کھلیں کہ ہمیں اپنے نفس کو پاک کرنا ہے ہمیں قربانی کے ذریعے تزکیہ نفس کرنا ہے تاکہ ہم آزادی کے مستحق ہوں اور خدا ہمارا ساتھ دے۔ اگر یہ بات ہے تو ہر ہندوستانی جس کی زندگی قربانی کا نمونہ ہے خواہ اور کچھ نہ کرے وہ اسی ایک چیز سے اپنے ملک کی مدد کرتا ہے۔ یہی میرے خیال میں اس طریقے کی قوت کا راز ہے جو کانگریس نے اختیار کیا ہے۔ اس لئے آزادی کی جنگ میں یہاں کے ہر طالب علم کو اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ تزکیہ نفس سے کام لے اور اپنی سیرت کو ایسا بنا لے کہ اعتراض سے بالا اور شبہے سے برتر ہو۔"

ناظرین نے غور کیا ہوگا کہ گاندھی جی کی نظروں میں روز بروز مصیبت اور ابتلا کی "گنگا" کا سماں چھا رہا ہے اور کوئی جلسہ ایسا نہیں ہوتا جس میں

وہ حاضرین سے ان صداؤں کا ذکر نہ کرتے ہوں جو آنے والے طوفان کی
گہرائیوں سے ان کے کانوں میں آرہی ہیں۔
نیشنل لیبر کلب میں ان کے خیر مقدم کی صحبت میں یہ سوال کیا گیا:۔
"کیا آپ کے انداز سے جنگجو یا نہ قومیت پسندی کا اظہار نہیں ہو رہا ہے؟
کیا آپ کے خیال میں یہ نصب العین خوفناک نہیں کہ آزادی کی خاطر
لاکھوں کروڑوں جانیں تلف ہو جائیں؟"

آزادی کی قیمت

میرے نزدیک اپنی جان قربان کرنا کوئی خوفناک
نصب العین نہیں ہے ان قیمتی جانوں کی قربانی
وہ قوم کرے گی جس سے جبراً ہتھیار چھین لئے گئے ہیں۔ یہ آپ کو واضح
رہے کہ ہندوستان عدم تشدد کا پابند ہے اس لئے دوسروں کی جان لینے
کا کوئی سوال نہیں۔ ہم اپنی جانوں کو اتنا سستا تو نہیں سمجھتے کہ خواہ مخواہ
ضائع کر دیں مگر آزادی سے زیادہ ہماری جانوں کی قیمت نہیں۔ اس
لئے اگر ہمیں لاکھوں کروڑوں جانیں قربان کرنا پڑیں تو ہم کل اس کے لئے
تیار ہیں اور خدا جس کا سایہ ہمارے سر پر ہے یہی کہے گا "شاباش میرے
بچو شاباش" ہم تو صرف اپنی آزادی کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کی
قوم کو البتہ شہنشاہی کا شوق تھا اور ہے۔ آپ کو خوفناک حرکتیں کرنے
کی عادت ہے۔ جنرل ڈائر نے بخوشی ہنٹر کمیشن کے سامنے کہا تھا "ہاں
میں نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی" میں یہ کہتا ہوں کہ ایسا خوفناک کام
کرنے والے اکیلے جنرل ڈائر ہی نہیں تھے۔ ہم یہ نہیں تو اس کا الٹا کر سکتے
ہیں کہ آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو قربان کر دیں۔
یہ کام آپ لوگوں کا ہے جو برطانوی قوم کی عزت کے ضامن ہیں کہ آپ

ممکن ہو تو اس قیامت کے ہنگامے کو روک دیئے۔"

"اگر ہم آپ کو کامل آزادی دے دیں تو یہ غلطی نہ ہوگی؟"

" اگر آزادی "دینے" کا سوال ہے تو آپ جس کسی کو آزادی دیں بڑی غلطی ہے۔

دینے کی چیز یا فطری حق؟

کہیں مہربانی کرکے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ سے آزادی مانگنے آیا ہوں۔ میں تو یہاں اس لئے آیا ہوں کہ پچھلے سال ہم لوگ جو تکلیفیں جھیل چکے ہیں دیکھوں ان کا کافی اثر انگریزوں کے دل پر ہوا ہے اور ان سے کوئی باعزت تصفیہ کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میں کوئی باعزت تصفیہ کر کے لوٹا تو یہ ہرگز نہیں سمجھوں گا کہ میں نے اس قوم کی دی ہوئی چیز پائی ہے۔ آزادی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ایک قوم اٹھا کر دوسری قوم کو دے دے۔ یہ تو وہ چیز ہے جو انسان خود لیتا ہے، اپنے خون کے بدلے خریدتا ہے اور میرے خیال میں ہم لوگ اپنا خون اس تحریک میں جو ۱۹۱۹ء سے اب تک جاری ہے، کافی بہا چکے ہیں۔ مگر ممکن ہے خداوند تعالیٰ یہ سمجھتا ہو کہ ابھی ہم نے کافی تکلیف نہیں اٹھائی ہے ابھی ہمارا تزکیہ نفس نہیں ہوا ہے۔ اگر یہ ہو تو میں قوم کی طرف سے کہے دیتا ہوں کہ ہم اپنی قربانی اس وقت تک جاری رکھیں گے کہ برطانیہ کا ایک شخص بھی حاکم بن کر ہندوستان میں نہیں رہنا چاہے گا۔"

"لارڈ ارون نے پیلیڈیم ہال میں ایک تقریر کی تھی جس میں انھوں نے یہ کہا کہ مجھے معلوم ہے گاندھی جی کامل آزادی پر اصرار نہیں کریں گے۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

" اول تو مجھے اس کا علم نہیں کہ جو تقریر لارڈ ارون کی طرف منسوب کی

جاتی ہے وہ انھوں نے کی یا نہیں۔ دوسرے مجھے لارڈ اروِن کی طرف سے کچھ کہنے کا حق نہیں۔ یہ سوال آپ انھیں سے کریں تو اچھا ہے۔ میں نے لارڈ اروِن سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں کامل آزادی پر اصرار نہیں کروں گا۔ بہ خلاف اس کے جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ میں کامل آزادی پر زور دوں گا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میرے نزدیک کامل آزادی سے یہ مُراد نہیں کہ نائبوں کے ذریعے حکومت کی جائے یعنی بجائے انگریز گماشتوں کے ہندوستانی گماشتے ہوں بلکہ میں کامل آزادی کے معنی قومی حکومت سمجھتا ہوں۔"

"آپ کامل آزادی کے ساتھ انگریزی فوج رکھنے پر راضی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں کیونکر جمع ہو سکتی ہیں۔"

برطانوی فوج "برطانوی فوج ہندوستان میں رہے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ اصل میں اس پر موقوف ہے کہ دونوں شریکوں میں کیا معاہدہ ہوتا ہے۔ اگر یہ فوج ایک محدود زمانے تک رہے تو اس میں ہندوستان کا فائدہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان والے بہت کمزور ہو گئے ہیں اور قومی حکومت کے لئے برطانوی سپاہیوں کا یا کچھ برطانوی افسروں کا رکھنا ضروری ہے بہ شرطیکہ یہ نوکر بن کر رہیں۔ میں شرکت کا بھی حامی ہوں اور اس کے ساتھ فوج کے رکھنے کا بھی۔"

"آپ ہندوستان میں وائسرائے کے عہدہ کو باقی رکھنا چاہتے ہیں؟"

وائسرائے "وائسرائے کا رہنا یا نہ رہنا ایسا مسئلہ ہے جس کا فیصلہ دونوں فریقوں کو مل کے کرنا چاہئے۔ آپ میری ذاتی رائے پوچھتے ہیں تو وائسرائے کے رہنے کی متعلق کوئی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں یہ

بات اور ہے کہ ایک برطانوی ایجنٹ یہاں رہا کرے کیونکہ برطانیہ والوں نے یہاں اپنی بہت سی اغراض پیدا کرلی ہیں، جن کو میں ذاتی طور پر مٹانا مناسب نہیں سمجھتا، اور اگر ان اغراض کی وکالت کے لئے اور برطانوی سپاہیوں اور افسروں کے خیال سے ایک ایجنٹ کے رہنے کی ضرورت ہو تو میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ "نہیں برطانوی ایجنٹ ہرگز نہ رہے" اس کے علاوہ چونکہ معاملے کا تعلق ہندوستانی رئیسوں سے ہے اور میں ان کی طرف سے کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا اس لئے میرے خیال میں اس نظام کے تحت جو میرے ذہن میں ہے یہ مشکل ہے کہ کوئی برطانوی ایجنٹ خواہ وہ گورنر جنرل کہلائے یا وائسرائے، نہ رہے مگر میں اس نظام کی اس حیثیت سے حمایت کرتا ہوں کہ یہ برابر کی شرکت ہوگی جو فریقین میں کسی ایک کی خواہش پر ختم ہو سکتی ہے۔ اس وقت میں گویا ایسی تختی پر لکھ رہا ہوں، جس میں سے بہت کچھ مٹانا پڑے گا۔"

"وہ کون سے مشترک مقاصد ہیں جو اس شرکت سے پورے ہوں گے؟"

"اس شرکت سے یہ مشترک مقصد حاصل ہو گا کہ دنیا میں جو قومیں لوٹی جارہی ہیں ان کا لوٹنا موقوف ہو۔ اگر ہندوستان اس لوٹ سے جس میں وہ برسوں سے گرفتار ہے بچ جائے تو اس کا فرض ہوگا پھر کبھی ایسی لوٹ نہ ہونے دے حقیقی شرکت میں دونوں کا فائدہ ہو گا۔ یہ شرکت دو قوموں کے درمیان ہوگی جس میں سے ایک وہ ہے جس کی مردانگی، ہمت، بہادری اور تنظیم کی بے نظیر قوت مشہور ہے اور دوسری وہ پرانی قوم ہے جس کی تہذیب دنیا میں کسی سے کم نہیں اور جس کا ملک بجائے خود ایک اقلیم ہے۔ بھلا جب ایسی دو قوموں کے درمیان شرکت ہو تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس میں دونوں کا فائدہ اور سارے انسانوں کا بھلا نہ ہو۔"

گول میز کانفرنس کا چکّر گاندھی جی نے چرچ ہاؤس کے ایک جلسے میں جس کے صدر آرچ بشپ یارک تھے اور جس میں بہت سے بڑے بڑے بشپ اور عمائد کلیسا موجود تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا "انگریزوں سے کہیے کہ ہندوستان کے معاملے کا غور سے مطالعہ کریں اور اگر ان کے خیال میں میری بات ٹھیک ہو تو پھر پوری پوری مدد کریں، کہ گول میز کانفرنس بہ خیر و خوبی انجام کو پہونچے۔ مگر مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ لارڈ سینکی ٹالم ٹول میں وقت گزار رہے ہیں اور کامیابی ایک طرف یہاں ابھی اصل مسئلہ ہی نہیں چھڑا کہ ہندوستان کو کامل آزادی یعنی اپنی فوج، مالیات اور امور خارجہ پر پورا اختیار ملے گا یا نہیں ملے گا؟ ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آیا۔ ہمارا سارا وقت ایسے مسئلوں کی بحث میں صرف ہو رہا ہے جو دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلے سے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ترقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے، جو کام لیا جا رہا ہے وہ نہ لیا جاتا تو اچھا تھا۔

انھوں نے ایک دوست سے فرمایا "میرے آگے ایک دیوار ہے جس کے پیچھے نہ معلوم کیا ہے کیا نہیں"

کہنے والے نے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ گو آپ ایک قومی جماعت کے نمائندے ہیں مگر متحد ہندوستان کے لیڈر نہیں ہیں"

گاندھی جی بولے "بے شک نہیں ہوں۔ مگر اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں اتحاد ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ یہ حکومت کے آدردول

کی کانفرنس ہے؟ اگر ہم اپنے نمائندے خود منتخب کرنے پاتے تو میراں سنگا وکیل ہوتا سب کی طرف سے بولتا۔ ہاں اس میں رئیسوں کا شمار نہیں، کیونکہ وہ تو جو کچھ کہیں گے حکومت کے باجگذار کی حیثیت سے کہیں گے جن کی نظرِ عنایت پران کی زندگی موقوف ہے۔ مگر اب یہ صورت ہے کہ یہاں ایسے مسلمان موجود ہیں جو کل تک برطانوی تعلق کو کسی طرح گوارا نہیں کرتے تھے اور آج حکومت کے وفاداروں کے وفادار ہیں"

پوچھا گیا: "تو ڈیلی ہیرالڈ نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا "نہیں۔ میرے خیال میں وزیر اعظم کا یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ حکومت خاص کرکے کانفرنس کو توڑنا نہیں چاہتی۔ مگر معلوم ہوتا ہے انھیں بجز اس کے کوئی چارہ نہ ہوگا کہ اسے ختم کردیں۔ کیونکہ اس چیز کو جو سوہان روح ہوگئی ہے، جاری رکھنا تو انسانیت کے خلاف ہے۔ اور واقعی یہ سوہان روح سے کم نہیں۔ ہم ان امور کے متعلق بے سروپا گفتگو کئے چلے جاتے ہیں جنھیں بنیادی مسائل سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ بھلا بتائیے کہ مالیات کی تقسیم وفاقی حکومت اور صوبے کی حکومت کے درمیان کرنے سے کیا فائدہ جب ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہماری مالیات کی صورت کیا ہوگی، ہمیں اس پر کہاں تک اختیار ہوگا، اور وہ کون سی فوج ہوگی جس کی تنخواہ ہم ادا کریں گے۔"

میرے نزدیک یہ موجودہ صورت حال کا صحیح نقشہ ہے اور گاندھی جی نے اس چیز کو گول میز کانفرنس میں بھی بہت اچھی طرح واضح کردیا تھا جب وفاقی دستوری کمیٹی میں عدالت علیا کے مسئلے پہ بحث ہو رہی تھی تو انھوں نے، جو کچھ کہنا تھا صاف کہہ دیا تھا۔ انھوں نے ان سب حضرات

کوشش کر دیا تھا کہ پرانے ڈھرے کو چھوڑیئے اب اس طرح کام نہیں چلے گا کہ آپ کے ذہن میں وہی قیصرِ ہند کا تصور ہو اور اسی ہندوستان کا جو غریبوں کو فاقے سے رکھے اور ملازموں کو بھاری بھاری تنخواہیں دیا کرے۔ کانگریس کسی ایسے انتظام سے خواہ وہ نام سے اچھا بھلا معلوم ہوتا ہو واسطہ نہیں رکھنا چاہتی جس میں برطانوی قبضہ اور برطانوی فرمانروائی تسلیم کی جاتی ہو۔ اگر آپ سچ مچ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اب آزاد ہندوستان کی سوچیئے جس کی اپنی علیحدہ عدالت ہو، ایسے ججوں کی جنہیں وہ اپنی مالی حالت کے اعتبار سے تنخواہ دے سکے اور ایسی کہ جو واقعی جمہور کی آزادی کی پشت پناہ ہو۔" یہ بڑے معرکے کی اور بڑی بے دھڑک تقریر تھی جیسا کہ لارڈ سینکی نے از راہ کرم فرمایا۔ اس سے یقیناً مطلع صاف ہو جائے گا۔ اور لوگوں کو غور کرنے کی تحریک ہوگی خصوصاً لارڈ سینکی جیسے لوگوں کو جنہیں اس شخص کی صاف گوئی پسند ہے "جو سمجھ بوجھ کر بات کہتا ہے"۔
اُدھر کانگریس اور اس کے نمائندے کو بدنام کرنے کے لئے شرارت آمیز خبریں مشہور کی جا رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک طویل تار بھیجا جس میں صوبہ متحدہ کی صورت حال سمجھائی۔ گاندھی جی نے بس اتنا جواب دیا کہ آپ کے خیال میں موقع کے لحاظ سے جو کچھ کرنا مناسب ہو بے تکلف کیجئے۔ مخالف اخبار اس خبر کو لے اُڑے اور اسے توڑ مروڑ کر یہ بہتان باندھا کہ گاندھی نے جواہر لال کو سول نافرمانی شروع کرنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہوئی جیسے پائنیر کا چلتا ہوا فقرہ کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کو رشوت دے رہے ہیں تاکہ وہ عدم تعاون کی تحریک میں ان کا ساتھ دیں۔

امتناع شراب نوشی

مخالفین شراب نوشی کے ایک جلسے میں جس کی صدارت لارڈ روچسٹر نے کی تھی۔ تین چار سو اصحاب کے مجمع میں ہر شخص کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان میں لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف شراب پینے پر مجبور کر کے انگلستان کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔

گاندھی جی نے فرمایا "دنیا میں اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو باوجود حکومت کی مخالفت کے اپنی کوشش سے امتناع شراب نوشی کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہو جہاں بہت کثرت سے لوگ امتناع چاہتے ہوں اور حکومت انکار کرتی ہو۔ جہاں طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کے ذریعے سے شراب نوشی کو ترقی دی جا رہی ہو"۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد لوگوں نے تعریف کے جو کلمے کہے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ لوگ خود بخود بات کو سمجھ گئے۔ گاندھی جی کے ان الفاظ کے بعد "اگر یہ کم بخت آمدنی کا قصہ نہ ہوتا تو امتناع کا مسئلہ بالکل سہل تھا" لوگوں کو معلوم ہوا کہ اگر ہندوستان امتناع جاری کرنا چاہے اور اس کے ساتھ اپنے میزانئے میں خسارہ بھی نہ ہونے دے تو اس کی ضرورت ہے کہ اسے اپنی مالیات پر پورا اختیار رہو۔

عام انتخابات کے اثرات ہمارے ملک کو تو انگلستان میں حکومت بدلنے سے نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ نقصان۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ایسے ایسے شدید مظالم جیسے عورتوں پر لاٹھی کے سلّے جن کی اس سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، مزدور پارٹی ہی کی حکومت میں ہوئے ہیں۔ اب اس سے زیادہ قدامت پسندوں کی حکومت میں اور کیا ہوگا ؟ یہی نہ کہ بارود کا استعمال دل کھول کر کیا جائے گا ؟ تو یہ اس بزدلانہ لاٹھی کے حملے سے تو کہیں زیادہ کھرا اور بے لاگ کام ہوگا۔

یہ بھگدڑ کے انتخابات یا بہ قول ایک خاتون کے "حفظ جان" کے انتخابات انگلستان اور یورپ کی بہ نازک مالی حالت، ان چیزوں کے گہرے معنی ہیں جنھیں سر ولیم لسٹین نے بڑی خوبی سے دو لفظوں میں ادا کیا ہے :-

"اب کوئی قرضدار ملک قرضے کی ادائگی کا مسئلہ صرف اپنے عمل سے طے نہیں کرسکتا۔ قرضخواہ ملکوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ادائگی مال کی شکل میں قبول کریں گے یا اسے ترجیح دیں گے کہ قرضہ کم کردیں۔ اگر ہر ملک اپنے طور پر درآمد پر قیود عائد کرنے لگا تو برآمد کی بھی سب راہیں رک جائیں گی اور آخر میں بین الاقوامی تجارت بالکل بند ہوجائے گی۔"

ایک اور انشاپردا ز انتخابات کے نتائج کی تحلیل اس طرح کرتا ہے جسے ہندوستان والے خوب سمجھیں گے "جان بل کو یہ یقین پیدا ہوجائے کہ اس کے ملک کو کوئی شدید خطرہ درپیش ہے، اس کے ایک بار سمجھ میں آجائے کہ کوئی خوفناک قوت اس کی جمع جتھا غائب کرنے کی درپے ہے اور بینک آف انگلینڈ

کی (جو اس کی نظر میں مسیح کی طرح اٹل پہاڑ ہے) جڑیں کھود رہی ہے یعنی اس نظام کو برباد کر رہی ہے جو اس کے مال و دولت کی حفاظت اور ترقی کا کفیل ہے پھر تو جان بل اپنی طاقت کے خمار میں انگڑائی لیتا ہوا اٹھتا ہے اور وہ کر گزرتا ہے کہ دنیا دیکھتی رہ جائے۔"

ہندوستان کے لئے یہ کھلا ہوا سبق ہے جس کے سیکھنے میں وہ غفلت نہیں کرے گا۔ جب ہندوستان میں اگلا موقع آئے جس کا ہر وقت اندیشہ ہے اور ہم جی میں ٹھان لیں تو جان بل کو یہ دکھا دینا کچھ مشکل نہیں کہ اس کے لئے شدید خطرہ درپیش ہے اور پھر وہ اپنے وزیروں سے کہے گا کہ ہندوستان سے صلح کر لو اور دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔

بیوقوف ہندو آکسفورڈ میں بعض طالب علموں نے پوچھا "ہندو مخلوط انتخابات کیوں چاہتے ہیں؟" اس کے جواب پر بڑے قہقہے لگائے گئے "اس لئے کہ وہ بیوقوف ہیں۔ وہ چاہیں تو مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیدیں کہ انھیں مخالفت کی گنجائش ہی نہ رہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ جداگانہ انتخاب تو کچھ خوفناک سی چیز ہے۔"

ایک انگریز طالب علم نے پوچھا "جو لوگ شراب پیتے ہیں آپ ان کے ساتھ اتنی بے مروتی کیوں برتتے ہیں؟"

گاندھی جی نے کہا "ان لوگوں کی مروت کی وجہ سے جنھیں اس لعنت کے مضر اثرات سے نقصان پہنچتا ہے۔"

بہت سے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ صبح سے آدھی رات تک بیشمار کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود گاندھی جی اپنے مزاج پر پورا قابو رکھتے ہیں۔ مسز پوسٹیس ملس نے پوچھا "آپ کبھی تھک کر جھنجھلاتے نہیں؟"

گاندھی جی نے فوراً جواب دیا "آپ مسز گاندھی سے پوچھئے تو وہ کہیں گی کہ میں ساری دنیا کے ساتھ خوش مزاجی کا برتاؤ کرتا ہوں مگر ان کے ساتھ نہیں۔"
یہ ظرافت انھیں اور بھی پسند آئی اور انھوں نے کہا "جناب! میرے شوہر تو میرے ساتھ ہمیشہ خوش مزاجی سے پیش آتے ہیں" گاندھی جی بولے "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آپ کو بہت بھاری رشوت دی ہے۔"

کسی نے پوچھا "کیا آپ کا چرخا قرون وسطےٰ[1] کی دقیانوسی چیز نہیں ہے؟"
گاندھی جی نے فرمایا "قرون وسطےٰ میں لوگ بہت سے دانشمندی کے کام کرتے تھے۔ اگر اوروں نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور میں نے نہیں چھوڑا تو میری اس دانشمندی میں الزام کی کیا بات ہے؟ چرخا لاکھ دقیانوسی سہی مجھے تو اس میں شرم نہیں آتی کہ اس کے ذریعے غریب کسانوں کی آمدنی میں پچاس فی صدی اضافہ کروں۔ لڑائی کے زمانہ میں آپ لوگ آلو کی کاشت کرتے تھے اور لیسیم کلب کی امیر خاتونیں مردوں کو بلایا کرتی تھیں کہ معمولی سوئی دھاگے سے سپاہیوں کے لئے سویٹر کے کپڑے سئیں کیا یہ دقیانوسی چیز نہیں تھی؟ تو جناب میں نے تو یہ دقیانوسیت لیسیم کلب کی خواتین سے سیکھی ہے۔"

لیکن جب موقع آتا ہے تو ان کے دل میں جوش اٹھتا ہے اور دنیا میں آگ لگا دیتے ہیں جیسے پچھلی ستیہ گرہ جس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا، آناً فاناً پھیل گئی۔

سوال کیا گیا "سوراج میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟"

---

[1] Middle Ages. یورپ کی تاریخ میں سنہ ۶۰۰ عیسوی سے سنہ ۱۵۰۰ء تک کا زمانہ۔

سوراج میں سب سے بڑی رُکاوٹ

انھوں نے جواب دیا" یہ ہے کہ برطانوی عمال اپنی قوّت کو چھوڑنا نہیں چاہتے اور ہم اس قابل نہیں کہ اُن کے ہاتھ سے یہ قوت چھین لیں۔ آپ کو ناگوار ہوا ہوگا کہ میں نے وہ جواب نہیں دیا جس کی آپ کو توقع تھی۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد ہم باوجود آپس کی نااتفاقی کے ان کے ہاتھ سے یہ قوت چھین لیں گے اور اگر وہ لوگ جن کے ہاتھ میں قوّت ہے چاہیں تو ہماری نااتفاقی بہت جلد دور ہو سکتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ انگریز کسی کے طرفدار نہیں وہ تو الگ رہ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ مگر میری گستاخی دیکھئے، میں نے ہندوستان کی حکومت پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ ایک پنجّر کی طرح ہمیں، الگ الگ رکھتی ہے اور برطانوی حکومت پر یہ کہ اس نے اپنے آوردوں کی کانفرنس کی ہے۔ ہم نے اپنے طور پر فرقہ وارانہ مسئلے کا فیصلہ کیا ہے جس میں کانگریس اور روشن خیال مسلمان شریک ہیں۔ لیکن اگر بعض مسلمان جو اکثریّت کے نمائندے ہونے کے مدّعی ہیں اس سے مطمئن نہیں ہیں اور اس بناء پر حکومت یہ کہتی ہے کہ وہ ان زنجیروں کو جن میں اس نے ہمیں جکڑ رکھا ہے بدستور اپنے ہاتھ میں رکھے گی تو میں یہ کہتا ہوں کہ ہم ایک ہی ضرب میں ان زنجیروں کا اور اس نااتفاقی کا خاتمہ کر دیں گے۔"

اس کے بعد انھوں نے کامن ویلتھ آف انڈیا کی استقبالی صحبت میں کہا:۔ "بہترین طریقہ یہ ہے کہ انگریز ہندوستان سے چلے آئیں اور اسے اپنے ہاتھ سے برا یا بھلا انتظام کرنے دیں جیسے انگلستان کر رہا ہے۔ لیکن ہندوستان میں انگریز جیل خانے کے داروغہ کی طرح ہیں اور ہمیں نیک چلنی کے قاعدے جبراً سکھایا کرتے ہیں اور سارا ہندوستان ایک بہت بڑا جیل خانہ ہے۔

ایک دن ہم کو بھی اپنے کام کا حساب دینا پڑے گا اور آپ کو بھی۔ آپ کے لئے سب سے اچھا تو یہ ہے کہ آپ اس غیر فطری رشتے کو ختم کر دیں۔ خدا نے چاہا تو ہم آپ کی مرضی کے خلاف بھی آپ سے آزادی لے لیں گے۔ میں سمجھتا تھا، کہ ہم کافی تکلیفیں اٹھا چکے ہیں مگر اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تکلیفیں کافی وزن نہیں رکھتیں اور مجھے ہندوستان جا کر اپنے ہموطنوں سے کہنا پڑے گا کہ ہمیں پچھلے سال سے زیادہ شدید آگ میں تپنا چاہیئے۔ چانکام اور ہجلی کے واقعات میرے لئے خطرے کے الاؤ کا کام دیتے ہیں اور آگاہ کرتے ہیں کہ ہندوستان واپس آؤ۔ مگر مجھے چاہیئے کہ صبر سے کام لوں اور اپنے غصّے کو ضبط کروں۔ مجھے کبھی کبھی اپنے اوپر بہت غصّہ آتا ہے مگر میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس غصّے کے شیطان سے بچائے اور وہ مجھے یہ قوت عطا کرتا ہے کہ میں اس پر غالب آؤں۔ مگر غصّہ آئے چاہے نہ آئے میں انگلستان سے دفعتاً رخصت نہیں ہوں گا۔ میں صبر سے کام لوں گا، زمانے کی رفتار دیکھوں گا اور دعا مانگتا رہوں گا۔ لیکن اگر آخر میں گول میز کانفرنس کی گاڑی نہ چلی تو میں جانتا ہوں کہ ہم کیا کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم وقت پر بیٹھے نہ رہیں گے اور تب آپ کی باری آئے گی کہ ہماری مدد کیجئے۔

---

(۹)

جارج برنارڈشا

مسٹر برنارڈشا عرصے سے گاندھی جی سے ملنے کا قصد کر رہے تھے اور بہت کچھ تامل کے بعد ایک دن آ ہی گئے۔ وہ ایک گھنٹے تک گاندھی جی کے ساتھ رہے اور ان سے مذہبی، لسانی، عمرانی، سیاسی، معاشی، خدا جانے کتنے قسم کے مسائل پر سوال کر ڈالے۔ ان کی باتوں میں تیز ظرافت اور تند مذاق کی چاشنی لطف دے رہی تھی۔ انھوں نے کہا:۔

"مجھے آپ کے متعلق کچھ تھوڑا سا علم تھا اور آپ میں ایک روحانی رشتے کی جھلک نظر آتی تھی، ہم دونوں اس حلقے میں ہیں جس کے اندر دنیا میں بہت کم لوگ شامل ہیں۔" ان کے اور سوال تو عالمگیر اہمیت نہ رکھتے تھے مگر گول میز کانفرنس کے متعلق بھی ایک سوال کیے بغیر ان سے نہ رہا گیا "کیا گول میز کانفرنس سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟" گاندھی جی نے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کیا "اس کے لیے صبر ایوب کی ضرورت ہے۔ سارا تماشا محض دکھاوے کا ہے اور وہ تقریریں جن سے ہماری تواضع کی جاتی ہے محض وقت ٹالنے کے لیے ہیں۔ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں آخر آپ اپنی پالیسی کا صاف صاف اعلان کیوں نہیں کر دیتے کہ ہم بھی ادھر یا ادھر فیصلہ کر لیں مگر یہ بات انگریزوں کی سیاسی فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے وہ تو چکر کا راستہ لیتے ہیں اور پیچ کی باتیں کرنے پر مجبور ہیں۔

ملک معظم

بعض لوگ کہتے ہوں گے کہ قیصر ہند کی دعوت بڑا اہم واقعہ تھا مگر ملک معظم اور ملکہ معظمہ کی خدمت میں بے ادبی نہ ہو تو میں کہوں کہ میرا یہ خیال نہیں۔ کیا بادشاہ اور ملکہ لوگوں سے اس طرح ملتے ہیں جیسے ملنا کہتے ہیں؟ کیا وہ کوئی کام کرتے ہیں یا انھیں کرنے کا موقع ملتا ہے؟ کیا اس طرح کی تقریب محض تماشا نہیں؟ ممکن ہے کوئی اعتراض کرے کہ پھر گاندھی جی گئے کیوں؟ اگر یہ ایسی ہی بے معنی چیز ہے

تو انھوں نے انکار کیوں نہیں کر دیا؟ - میں چاہتا ہوں کہ ناظرین کو ان کے خیالات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو جائے۔ انھوں نے "فرینڈس" کے جلسے میں فرمایا "میں یہاں عجیب مشکل میں ہوں۔ میں آپ کی قوم کا مہمان بن کر آیا ہوں، اپنی قوم کے منتخب کئے ہوئے نمائندے کی حیثیت سے نہیں آیا۔ اس لئے مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے اور میں آپ سے کہہ نہیں سکتا کہ میں کتنی احتیاط کرتا ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں مجھے وزیر اعظم کی وہ ناصحانہ تقریر ناگوار نہیں ہوئی جو انھوں نے اقلیتوں کی کمیٹی میں کی تھی؟ میرا جی چاہتا تھا کہ وہیں اس کی تردید کر دوں۔ مگر میں ہونٹ سیئے ہوئے بیٹھا رہا۔ گھر آکر میں نے نرم الفاظ میں ایک شکایت کا خط لکھا۔ اب اس ہفتے میں مجھے ایک اور اخلاقی مسئلہ درپیش ہے۔ میں ملک معظم کی دعوت میں بلایا گیا ہوں۔ مجھے ہندوستان کے واقعات کا اس قدر صدمہ ہے کہ ایسی تقریبوں میں میرا دل نہیں لگتا۔ مگر مہمان ہونے کی وجہ سے میں پس و پیش میں ہوں۔ مجھے فیصلے میں جلدی نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے اس مسئلے کے قانونی پہلو سے بحث نہیں مگر اس کے اخلاقی پہلو کی بڑی فکر ہے۔" اسی اخلاقی پہلو کی بنا پر انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ جانا چاہیئے اور لارڈ چیمبرلین کو ایک خط لکھا جس میں دعوت کا شکریہ ادا کیا اور یہ لکھا کہ میں اور میرے ساتھی (وہ بھی مدعو تھے) اپنے معمولی کپڑے پہن کر دعوت میں شریک ہوں گے۔ وہ عموماً ہر قسم کی دعوتوں وغیرہ میں شرکت سے عذر کر دیتے ہیں لیکن یہاں چند اور موقعوں پر انھیں اپنے معمول کے خلاف کرنا پڑا کیونکہ وہ ایسی بات نہیں کرنا چاہتے جس میں بداخلاقی کا شائبہ ہو۔ اس کی انھیں پروا نہیں کہ میرے کسی قول کو لوگ میری منافقت میں استعمال کریں گے۔

اب کیا ہوگا؟

اُس وقت تو معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس چلنے والی نہیں اور
اس گہری تاریکی میں جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے روشنی کی
کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ مگر آپ کے سب سے بڑے لوگوں میں سے بعض پوری
پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس مہلک انجام کو روکیں۔ اگر یہ لوگ ناکامیاب
ہوئے اور کانفرنس ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گئی جیسا کہ مجھے اندیشہ ہے، تو
ہزاروں لاکھوں آدمی تکلیفوں کی آگ میں تپنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اور
سخت سے سخت جبر سے بھی نہیں ڈریں گے۔"

"ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس بار جو جبر و تشدد ہونے والا ہے وہ پچھلے
سال کے مقابلے میں دس گنا سخت ہوگا۔ مگر میں دعا کرتا ہوں کہ انسانوں
کو وحشیانہ قوت کا یہ مظاہرہ نہ دیکھنا پڑے۔"

میں یہ الفاظ گاندھی جی کی اس تقریر کے آخری حصے سے نقل کر رہا
ہوں جو انھوں نے ویسٹ منسٹر اسکول کے جلسے میں کی تھی۔ یہ اس
سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے جب انھوں نے گول میز کانفرنس میں تیسری
یادگار تقریر کی۔ اس کی ضرورت فرقہ وارانہ مسئلے کے اس پیچیدہ حل کی
بدولت پیش آئی جس کے متعلق قریب قریب یہ دعوے تھا کہ یہ ایک معاہدہ
ہے مسلمانوں، نیچے طبقوں، ہندوستانی عیسائیوں، اینگلو انڈین فرقوں اور
یورپ کی جماعت کے درمیان، جن کی تعداد ہندوستان کی آبادی کی ۴۶
فی صدی ہے۔ یہ چیز جو مختلف فرقوں کے سرکار کے نامزد کئے ہوئے نمائندوں
نے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ تصنیف کی دیکھنے ہی میں یہ معلوم ہوتی ہے

اس کے خلاف بہت لوگوں نے نہایت سختی سے احتجاج کیا جس میں سب سے سخت سردار اجل سنگھ کی تقریر تھی کیونکہ انھوں نے صاف صاف کہا، کہ یہ کوشش ایسی ہے جیسے پرائے مال کے حصّے بخرے کرنے کی خفیہ سازش۔ جب گاندھی جی غصّے میں بھرے ہوئے اُٹھے اور انھوں نے اس تجویز کو قومی ذلّت کا باعث قرار دے کر اس کا پردہ فاش کیا تو یہ وہیں ختم ہو گئی مگر انھوں نے اس کے ختم کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ ان کے بانیوں کے ان مفسدانہ اور مہمل دعووں کی بھی قلعی کھول دی کہ وہ اپنے اپنے فرقے کے نمائندے ہیں۔

اس تقریر سے وزیر اعظم کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ نیو اسٹیٹسمین نے آج کے پرچے میں ایک جگہ قریب قریب گاندھی جی کے الفاظ کو دہرا دیا ہے: "کوئی شخص بھی جو کسی فرقے کا نمائندہ ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا سکھ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل پر دستخط کرنے کو تیار نہیں جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ آئندہ دستور کے اصل مسئلے میں کچھ ہونے والا ہے یا نہیں"۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

"اصل میں کوئی وجہ نہیں کہ کانفرنس ناکامیاب ہو۔ اگر ٹالنے کی پالیسی اختیار کی گئی تو قصداً کی جائے گی اس لئے کہ قومی حکومت کی مجلس وزرا اسی کو مناسب سمجھتی ہے"۔ یہ بھی کچھ کم نہیں کہ گاندھی جی کی ان تھک کوششوں نے جو انھوں نے برطانوی قوم کو حقیقی حالات سے واقف کرنے کے لئے انجام دیں، کم سے کم کچھ سمجھ دار لوگوں کے دل سے وہ خیالات دور کر دئے ہیں جو سرکاری طور پر گھڑ کر پھیلائے گئے تھے۔ اور جب چند روز کے بعد کانفرنس کا خاتمہ ناکامی پر ہو گا تو کسی شخص کو سنجیدگی

سے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو گی کہ اس میں ہندوستان کے نمائندوں نے رُکاوٹ ڈالی۔

وزیراعظم نے ایک عذر لنگ یہ پیش کیا کہ تحفظات پر بحث نہ ہونے کا سبب خود وفاقی دستوری کمیٹی کی یہ تجویز تھی کہ یہ مسئلہ ملتوی کر دیا جائے۔ اس بیان کے خلاف ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی اور انھیں فوراً یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ تجویز صرف کمیٹی کے ایک حصّے کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس طرح آج انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ موجودہ مسئلے کو طے کرنے کے لئے سب نمائندے بالاتفاق ان سے درخواست کریں اسی طرح انھیں اس پر اصرار کرنا چاہیئے تھا کہ دستور کے مسئلے کے التوا کے لئے بھی متفقہ طور پر درخواست کی جائے۔ بہت سی چیزوں کی بدولت، جن میں وزیراعظم کا یہ اعتراف بھی شامل ہے حکومت کے طرزِ عمل کا خلوص سے خالی ہونا جیسا آج ثابت ہوا کبھی نہیں ہوا تھا۔

خیر اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بڑا خوفناک حادثہ پیش آنے والا ہے جس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھوں نے اپنی خوشی سے اپنے اوپر تکلیفیں اٹھا کر آزادی حاصل کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ گاندھی جی نے آج رات گئے ایک نامہ نگار سے کہا "اگر دستور کے مسئلے کی وجہ سے کانفرنس ناکامیاب ہوئی تو سول نافرمانی کا دوبارہ شروع ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے سوا اور کوئی صورت ہی نہیں ہے، کیونکہ اگر ہمیں دستور اس وقت نہ ملا تو پھر ایک غیر معیّن مدّت کے لئے بات ٹل جائے گی۔ کچھ زیادہ اُمّید نظر نہیں آتی۔ مگر میں ابھی بالکل مایوس نہیں ہوں۔ شاید آخری وقت کوئی حل نکل آئے ــ میں اپنی طرف سے اس وقت تک دم نہیں لوں گا، جب تک

ہر ممکن صورت پر غور نہ کر لیا جائے۔"

کانگریس غریبوں کی نمائندہ ہے

جو شخص گاندھی جی کی تقریر پر غور کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہماری راہ میں کیا کیا دقتیں ہیں۔ ہم میں آپس میں جو اختلافات ہیں وہ ظاہر ہیں اور جیسا گاندھی جی نے کئی بار فرمایا ہم سب سے حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارے اختلافات کا بیج حکومت نے بویا اور ایک قوی جماعت جو اپنی قوت کو چھوڑنا نہیں چاہتی ان اختلافات کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے جو کچھ کر سکتی ہے وہ اس نے کیا۔ کانگریس ہی اصل میں قوم ہے اور حکومت کو یہ چاہیئے تھا کہ اور پارٹیوں سے گفتگو کرنے کے بعد کانگریس سے معاملہ کرتی۔ مگر صریحًا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس حکومت کو اپنی اہمیت کا یقین نہیں دلا سکی اور یہ دعوے کہ وہ سارے ملک کی نمائندہ ہے نہیں منوا سکی۔ گاندھی جی کہتے ہیں "ایسی صورت میں میں واپس جاؤں گا اور مزید تکلیفیں سہہ کر یہ ثابت کردوں گا کہ کانگریس ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کی نمائندہ ہے۔"

لیکن جیسا گاندھی جی نے لندن کے دارالعلوم معاشیات[1] کے طلباء سے فرمایا اصلی رکاوٹ یہ ہے کہ "انگلستان کے بہترین اشخاص بھی ہندوستان کے حالات سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ہماری نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم ناشکر گذار لوگ ہیں اور ان اچھائیوں کو بھول گئے ہیں جو برطانوی قوم نے ہندوستان کے ساتھ کی ہیں۔ یہ خیال صرف سرکاری حلقوں ہی کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی ہے جو رائے عامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔" اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ بہت دن ہوئے سرندر ناتھ جی آنجہانی نے برطانوی

[1] School of Economics

قوم کی ایک اور خصوصیت بیان کی تھی "مجھ سے انگریز ہمیشہ یہ پوچھا کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں اس قدر افلاس ہے تو شورشیں کیوں نہیں برپا ہوتیں، کھڑکیاں کیوں نہیں توڑی جاتیں، بلوے کیوں نہیں ہوتے" اور آج بھی انگریز قریب قریب یہی خیالات رکھتے ہیں۔ عدم تشدد کا طریقہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً انھیں اُس سے کہیں زیادہ زوردار مظاہرے کی ضرورت ہے جو ہمارے یہاں پچھلے سال ہوا ہے۔ بیرونی حملے اور اندرونی نفاق کا خطرہ اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے کہ ایک معمولی انگریز کو سچے دل سے یقین ہے کہ بغیر برطانوی سنگین کی حفاظت کے ہندوستان کی زندگی محال ہے۔ ایک حد تک اس میں حاکم قوم کا غرور بھی شامل ہے جو اپنے لئے بعض حقوق، مخصوص کر لیتا ہے اور محکوم قوم کو ادنیٰ حقوق سے بھی محروم رکھنا چاہتا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف دیواروں پر، دوکانوں کی کھڑکیوں پر، ریل گاڑیوں اور موٹر بسوں پر، برطانوی قوم کے نام یہ اپیل نظر آتا ہے کہ باہر کی چیزیں نہ خریدو بلکہ صرف برطانوی مال خریدو لیکن "صرف ہندوستانی چیزیں خریدو" یہ صدا ہندوستان میں باغیانہ اور خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ ایک جلسے میں جہاں غیر معمولی طور پر باخبر حضرات جمع تھے ایک خاتون نے سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ جو قوم آپس میں لڑتی ہو اسے آزادی کا خواب دیکھنے کا کیا حق ہے۔ لوگ بڑے مقطع بن کر کہتے ہیں۔ "پہلے آزادی کا استحقاق پیدا کرو۔"

خلقی حق میں اس کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا کہ یہاں لوگوں کی واقعات سے ناواقفیت اور تاریخ کا غلط علم کس کس طرح کا ہے اور حاکم قوم کے تعصبات کیا کیا ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو فاتح سمجھتے ہیں ان میں ان چیزوں کا ہونا لازمی ہے۔ مصیبت زدوں کی حالت کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے

خود بھی مصیبت اٹھائی ہو۔ آئرستانی محبّ وطن جے ڈیلون نے ایک جلسے میں جہاں گاندھی جی غیر رسمی طور پر تقریر کر رہے تھے، حامیان آزادی کی تائید میں خوب کہا" آپ ہم سے کہتے ہیں کہ پہلے ہندوستان کے حالات کا مُطالعہ کر لو۔ جناب اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تو حالات کا مُطالعہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہر قوم کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ یہ تو اس کا خلقی حق ہوتا ہے" اور گاندھی جی نے یہ کہہ کر دلیل کو اور قوی کر دیا ہے۔ آزادی صِرف ہمار اخلقی حق نہیں ہے بلکہ ہم نے تکلیفیں سہہ کر اس کا مزید استحقاق حاصل کیا ہے۔

مگر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ابھی اور تکلیفیں اٹھانا ہیں تاکہ برطانوی قوم کو صحیح حالات کا علم ہو۔ اب تک گاندھی جی کئی ہزار برطانویوں سے مل چکے ہیں اور ان سے پکار پکار کر کہتے رہے ہیں کہ گو ہندوستان میں برطانوی حکومت کتنی ہی نیک نیتی پر مبنی ہو مگر وہ ہندوستان کے لئے ایک عذاب ثابت ہوئی ہے اور ہمیں اس سے پیچھا چھڑانا چاہیئے۔ ان کی یہ تعلیم بیکار نہیں گئی مگر یہ طریقہ بڑا دیر طلب ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ ہندوستان میں لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ذلّت کی مَوت مر رہے ہیں جیسا بنگال، صوبہ متحدہ اور بردولی کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے گاندھی جی ہر تقریر میں برابر کہتے رہتے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں جانوں کا قربان ہو جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ لوگ اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں۔ میرے دل سے کسی دم ان کی نجات کا خیال دور نہیں ہوتا۔ مگر شرط یہی ہے کہ ہم اپنے ہاتھ اپنے دشمنوں کے خون میں آلودہ نہ کریں اور حق سے کبھی تجاوز نہ ہونے پائیں۔ ہم نے اپنے لئے راہ فرار مسدود کر دی ہے۔ ہم جان سے ہاتھ دھو کر لڑ رہے ہیں اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک ہندوستان کے کاشت کاروں کو حقیقی آزادی نہ مل جائے"

بے مقصد کانفرنس

گول میز کانفرنس کو بہت سی چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے کسی نے کہا کہ یہ ایک مُردے کی طرح ہے جسے آکسیجن سے زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ کسی نے کہا یہ اس شخص کے مانند ہے جو دریا میں ڈوب کر نکالا گیا ہو اور جسے مصنوعی تنفّس کے ذریعے ہوش میں لارہے ہوں۔ بعض کا خیال تو یہاں تک ہے کہ کانفرنس تو مرچکی اور اب وزیراعظم اور لارڈ چانسلر اس فکر میں ہیں کہ اس کا کفن دفن اچھی طرح ہو جائے۔ میرے خیال میں یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہے کہ کانفرنس کے کارکن پہلے تو ضروری چیزوں سے خاص کر کے غفلت کرتے رہے اب آخر میں انھیں ان کا ہوش آیا ہے۔ خدا جانے کیوں انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ ایک دائرے میں چکر لگایا کریں اور مرکز تک پہنچنے کی کوشش کریں جیسا کہ مسٹر ویجووڈ بین نے کہا "وفاقی دستوری کمیٹی کے آخری جلسے تک ہم اصل مسئلے سے بہت دور تھے" مسٹر بریلسفورڈ نے بات کو اور صاف کر کے کہا "چھوٹی چیزوں پر طول طویل بحثیں ہوتی رہیں۔ اس بات پر سب متفق ہو گئے کہ ہندوستان کی مجلس وضع قوانین کے ایوان بالا میں ۱۰۰ ممبر اور ایوان ماتحت میں ۲۰۰ ممبر ہوں گے یہ بات ابھی تک معرض شبہہ میں ہے کہ ان تین سو ممبروں سے پارلیمنٹ بنے گی یا مباحثے کی انجمن، کیونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان لوگوں کو مالیات، فوج اور امور خارجہ میں دخل دینے کا حق ملے گا یا نہیں اور اگر ملے گا تو کب اور کس صورت میں"

گاندھی جی نے وفاقی دستوری کمیٹی کی سب سے پہلی تقریر میں لوگوں کو متنبّہ کر دیا تھا اور اس کے بعد بھی مختلف موقعوں پر انھوں نے کانفرنس کو اہم

مسائل کی طرف توجہ دلائی اور جزویات پر بحث کرنے سے انکار کر دیا۔"
وہ نامبارک اتحاد جو مسلمان ڈیلیگیٹوں اور اقلیتوں کی نمائندگی کا دعوی کرنے والوں میں ہوا اور وزیر اعظم کی تقریر جو انھوں نے اقلیتوں کی کمیٹی کو برخاست کرتے وقت کی ان دونوں چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لیپ پوت کی کوشش انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ گاندھی جی اس پر مجبور تھے کہ اپنی باطل سوز تقریر سے سب کی خبر لے ڈالیں اور سب کے دل میں فرض کا احساس پیدا کر دیں۔ جن لوگوں نے کانفرنس منعقد کی تھی انھوں نے دیکھا کہ اگر ہم نے ڈیلیگیٹوں کی رائے بنیادی مسائل میں معلوم کئے بغیر انھیں واپس کر دیا تو الزام ہمارے سر رہے گا۔ میں مسٹر بین کی تقریر کا ایک فقرہ نقل کر چکا ہوں۔ مسٹر لیز اسمتھ نے ان کی تائید کی اور غالباً برطانیہ والوں میں سب سے پہلے انھی نے کانفرنس کو یہ جتایا کہ جن وجوہ سے تحفظات پر بحث کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک لارڈ ارون اور گاندھی جی کا معاہدہ بھی ہے۔ مسٹر بین نے بڑے مزے کی بات کہی "کیا یہ معاملہ ایسا ہے کہ ایک ہاتھ میں ریل کا ٹائم ٹیبل اور دوسرے ہاتھ میں روک گھڑی[1] لے کر ختم کیا جائے۔" وزیر اعظم، لارڈ سینکی اور مسلمان ڈیلیگیٹ سب کو چار و ناچار ماننا پڑا اور اب وہ بحثیں چھڑ گئی ہیں جنھیں ہندوستان کے کروڑوں غریبوں سے تعلق ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا خدا کر کے اب کانفرنس کو اہم معاملات غور کرنے کا ہوش آیا ہے اور خواہ ان تقریروں کا جو روز ہو رہی ہیں وزیر اعظم کے موعودہ بیان پر کچھ اثر پڑے یا نہ پڑے، یہی کیا کم ہے کہ برطانوی حکومت کے سامنے جمہور کے مطالبات جہاں تک ممکن ہے صلح و آشتی سے پیش کر دیئے جائیں گے۔

---

[1] stop-watch

بنیادی مسئلہ گاندھی جی نے وفاقی دستوری کمیٹی میں اپنے خاص انداز میں دو تقریریں کرکے اس بات کو واضح کر دیا کہ سب کچھ اس پہ موقوف ہے کہ آپ اس بنیادی مسئلے میں کون سا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ آیا آپ کے نزدیک برطانیہ کا ہندوستان پر قابض ہونا اور آئندہ قابض رہنا جائز ہے یا نہیں۔ انھوں نے کانگریس کی طرف سے یہ مقدمہ پیش کیا کہ برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ ہونا اور رہنا ناجائز ہے۔ اس کی بنا پر انھوں نے بے تکلف "پورے زور کے ساتھ" یہ کہہ دیا کہ "اگر فوج ہمارے اختیار میں نہ دی جائے تو ساری فوج کو رخصت کر دینا چاہیئے"۔ اصل بات یہ ہے کہ برطانیہ دل سے یہ نہیں چاہتا کہ اختیارات ہندوستان کے حوالے کرے اور ہم میں سے بھی بعض لوگ اس پر تلے ہوئے نہیں ہیں کہ قوت اپنے ہاتھ میں لیں، اور اسے سراسر ہندوستان کے کروروں بے زبان مظلوم غریبوں کے فائدے کے لئے کام میں لائیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھیئے تو دونوں طرف کی بعض تقریریں، لارڈ سینکی کا یہ سوال کہ ہندوستان برطانوی فوج چاہتا ہے یا نہیں، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر شاستری کی رکتی رکتی سہمی سہمی باتیں، اور وہ احتجاج بلکہ وہ طوفان جو گاندھی جی کی تجارتی تفریق والی تقریر نے خود ہم لوگوں میں برپا کر دیا ہے یہ سب چیزیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے تقریر صرف تجارتی تفریق ہی پر نہیں کی بلکہ اس ہندوستان کا نقشہ دکھایا، جس میں جمہور کی حکومت جمہور ہی کے مفاد کے لئے ہو گی، جو نہ صرف غیر ملکوں کی، بلکہ اپنے ملک کے سرمایہ داروں، زمینداروں اور ذہنی اور معاشرتی حیثیت سے اونچے طبقوں کی لوٹ سے بچا ہوا ہو گا، جنھوں نے اب تک غیر ملکوں کے ساتھ مل کر غریب کی گاڑھی کمائی پر زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے لوگوں نے

اس کا نام بالشویک اسپیچ رکھ دیا مگر ظاہر ہے کہ کانگریس کی راہ عدم تشدد کی پالیسی کی بدولت اور سب سے جدا ہے۔ پھر بھی گاندھی جی کو کانفرنس سے یہ بات صاف صاف کہنا پڑی۔ کہ ہر شخص کی دولت جو جائز طریقے سے نہ حاصل کی گئی ہو یا قوم کے حقیقی مفاد کے منافی ہو عدالت کی تحقیقات اور تصرف کی زد میں آجائے گی۔ اسی وجہ سے ڈیلی میل نے یہ اشتہار نکالا۔

"مسٹر گاندھی کو گھر بھیج دو۔"

خدا جانے ہندوستان کی قسمت میں کیا ہے؟ آج ایک بڑے ممتاز سیاسی لیڈر کے صاحبزادے نے گاندھی جی سے سوال کیا "کیا کانفرنس کا ناکامیاب ہونا بالکل یقینی ہے؟ گاندھی جی نے کہا" ایسا کہنا بڑی ناشکری ہے۔ مگر مجھے تو کامیابی کی اُمید بہت کم نظر آتی ہے۔" انھوں نے پوچھا "آپ کا یہ خیال نہیں کہ جب حکومت نے ان مسائل پر بحث کی اجازت دیدی ہے تو وہ خود بھی کچھ کرے گی؟ کیا حکومت کے بدلنے کا اس معاملے پر کچھ اثر پڑے گا؟" گاندھی جی نے بے تکلف دونوں سوالوں کا ساتھ ساتھ جواب دیا "مجھے حکومت سے اس سے زیادہ توقع تھی۔ مجھے اس میں شبہہ ہے، کہ وہ اختیارات ہمارے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اب رہا دونوں پارٹیوں کا معاملہ تو ہندوستان والوں کی طرف سے تو دونوں ایک ہیں وہی مثل ہے کہ "چاہے آدھے درجن کہہ لو چاہے چھ کہہ لو" بلکہ سچ پوچھئے تو مجھے خوشی ہے کہ میرا معاملہ قدامت پسند جماعت سے ہے جس کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ میں یہاں سے چرا چھپا کر کوئی چیز نہیں لے جانا چاہتا۔ میں تو بہت بڑی اور بہت اچھی چیز چاہتا ہوں جسے غریب لوگ دیکھ سکیں اور سمجھ سکیں۔ اس لئے یہ اور اچھا ہے کہ میں ایک مضبوط پارٹی سے مقابلہ کروں اور جو

کچھ لوں وہ اسی سے لوں ۔ جو میں چاہتا ہوں وہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہے ۔
میں دونوں ملکوں کے رشتے کو توڑنا نہیں چاہتا بدلنا چاہتا ہوں ۔
ہندوستان اور انگلستان کا یہ تعلق یعنی برابر کی شرکت تبھی قائم رہ سکتی ہے
کہ دونوں جو کام شریک ہو کر کریں وہ کمزوری کے احساس کے ساتھ نہیں ،
بلکہ قوت کے احساس کے ساتھ ہو ۔ اس لئے مجھے بڑی خوشی ہوا اگر قدامت
پسندوں کی حکومت میں ہم ان پر یہ ثابت کر سکیں کہ ہم حریف بھی ایسے ہیں
اور شریک بھی ایسے کہ ہم سے معاملہ کرنے میں ان کی کسر شان نہیں ہوتی "۔
مگر جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں اصل سوال یہ ہے کہ بنیادی مسئلے میں
کون سا پہلو اختیار کیا جاتا ہے ۔ برطانوی قوم کی طرف سے ڈیلی میل نے
اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے " بغیر ہندوستان کے برطانوی شرکت اقوام کا
رشتہ بکھر کر رہ جائے گا ۔ تجارتی حیثیت سے ، معاشی حیثیت سے ، سیاسی
حیثیت سے ، جغرافی حیثیت سے ، یہ ہماری سلطنت کا سب سے قیمتی حصہ ہے
اس پر ہمارا جو قبضہ ہے اسے ڈھیلا کرنا ایک برطانوی کے لئے بدترین
غداری ہے "۔

لائڈ جارج مسٹر لائڈ جارج نے ازراہ عنایت گاندھی جی کو چرٹ آنے
کی دعوت دی ۔ انھوں نے لندن سے آنے جانے کے
لئے اپنی کار بھیجی ۔ گاندھی جی کے ساتھ تین گھنٹے کی گفتگو میں انھوں نے
بڑی خوش خلقی کا برتاؤ کیا اور خوب کھل کر باتیں ہوئیں ۔

ہندوستان کی عورتیں عورتوں کی مختلف انجمنوں نے گاندھی جی سے
تقریر کرنے کی درخواست کی تھی مس اگاتھا ہیرین
نے ان سب کو ملا کر ایک جماعت بنائی اور عورتوں کی " انجمن ہند " کی طرف سے

گاندھی جی کو دعوت دی کہ ہمارے کالج کے ہال میں تقریر کریں۔ اس جلسے میں ہر خیال کی خواتین موجود تھیں اور گاندھی جی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بہت سے عجیب غریب خیالات کی جو ہندوستان کی عورتوں کے متعلق رائج ہیں تردید کی اور ان کے پچھلی تحریک کے شاندار کارناموں کی تصویر کھینچ کر دکھا دی۔ انھوں نے کہا "غالباً بعض باتوں کے لحاظ سے یہ عورتیں آپ سے اچھی حالت میں ہیں۔ آپ کو رائے دہندگی کا حق حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ ہندوستان کی عورتوں کو مانگتے ہی مل گیا۔ وہ سیاسی زندگی میں حصہ لینا چاہیں تو کوئی روک ٹوک نہیں۔ عورتیں کانگریس کی صدر رہ چکی ہیں اور اب بھی اس کی مجلس عاملہ میں مسز نائڈو موجود ہیں۔ گذشتہ چند سال میں جب ہماری انجمنیں خلاف قانون قرار دی گئی تھیں اور ان کے کارکن قید ہو گئے تھے۔ ہماری عورتیں آگے بڑھیں انھوں نے ڈکٹیٹروں کی جگہ لے لی اور جیل خانوں کو بھر دیا۔ مگر میرا یہ مطلب نہیں کہ ہماری عورتوں کو مردوں کے ہاتھ سے تکلیفیں نہیں پہنچیں۔ انھیں بھی بڑے بڑے تلخ گھونٹ پینا پڑے ہیں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کہ آپ نے ہندوستان کے متعلق جو کچھ مس میو کی کتاب میں پڑھا ہے وہ ۹۹ فی صدی غلط ہے۔ میں نے یہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھی ہے اور جب میں نے اسے ختم کیا تو میرے مُنہ سے نکلا کہ یہ تو موریوں کے انسپکٹر کی رپورٹ ہے۔ اس میں بعض باتیں صحیح بھی ہیں لیکن جو کلیات انھوں نے قائم کئے ہیں سراسر غلط ہیں اور بعض واقعات تو صاف من گھڑت معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ پچھلے سال عورتوں کے پردے کے پیسے گھروں سے نکل آئے اور ان میں وہ بیداری ظاہر ہوئی جو معجزے

سے کم نہیں۔ انھوں نے جلوسوں میں شرکت کی قانون توڑا لاٹھیاں کھائیں، اور اُف بھی نہیں کی انھوں نے شرابیوں کو سمجھا بجھا کر ان کی شراب چھڑائی اور بدیسی کپڑا بیچنے والوں اور خریدنے والوں کو اس قبیح حرکت سے باز رکھا۔ یہ مسز نائیڈو کی طرح کسی عالم فاضل خاتون کا نہیں بلکہ ایک ان پڑھ عورت کا کارنامہ ہے کہ اس نے سر پہ لاٹھیاں کھائیں، خون کے شراٹے بہنے لگے مگر نہ وہ خود ایک قدم پیچھے ہٹی نہ اپنے ساتھیوں کو ہٹنے دیا اور بورساد کے چھوٹے سے گاؤں کو ٹھوس کارگزاری کا نمونہ بنا دیا۔ پچھلے سال کی فتح اصل میں انھیں عورتوں کی بدولت ہوئی۔

تقریر کے بعد سوالات کا وقت بہت کم تھا۔ پھر بھی جو دو ایک سوال ہوئے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوگ گول میز کانفرنس کے مشوروں کے نتیجے کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں۔ گاندھی جی نے ان سے کہا "ابھی وقت ہے کہ یہ دونوں قومیں دنیا کے بھلے کے لئے برابری کی شرکت کر لیں۔ میرا قلب اس سے مطمئن نہیں ہوگا کہ ہندوستان کو آزاد کرا لوں اور دنیا میں امن قائم کرنے میں مدد نہ کروں۔ میرے دل کو یقین ہے کہ جب انگلستان ہندوستان کو نوچ کر کھانے سے باز آجائے گا تو دوسری قوموں کو کھسوٹنا بھی چھوڑ دیگا یا کم از کم ہندوستان کی شرکت اس ظلم میں نہ رہے گی۔

سوال جواب پچھلے چند دن میں گاندھی جی نے لندن اور دوسرے مقامات پر مختلف جلسوں میں تمام اہم مسائل کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ میں ان کے اقوال کو لفظ بہ لفظ سوالوں کے جواب کی صورت میں لکھے دیتا ہوں :-

"کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ نمک پر محصول لگا کر میزانئے کی کمی پوری کی جائے؟ نہیں سمجھتے؟ کیا آپ کے نزدیک وفاقی حکومت کو ہر قسم کی چیزوں پر جن میں نمک بھی شامل ہے محصول لگانے کی غیر محدود آزادی نہیں ہونا چاہیئے؟"

"وفاقی حکومت کو نمک پر محصول لگانے کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ نمک پر محصول لگا کر میزانئے کی کمی پوری کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ناداروں پر محصول لگایا جائے اور یہ میرے نزدیک گناہ ہے۔ اگر میزانئے کو برابر کرنا ہے تو فوجی اخراجات کیوں نہ کم کر دیئے جائیں؟ غریب ہندوستانی محصول دہندوں پر اور محصول لگانا نوع انسانی پر ظلم ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ آپ ہوا اور پانی پر محصول لگا دیں اور یہ امید رکھیں کہ ہندوستان والے زندہ رہیں گے۔"

گاندھی جی کو جتنا غصّہ اُس چیز پر آتا ہے جسے وہ بارہا "انگریزوں کی بے پایاں جہالت ہندوستان کے معاملے میں" کہہ چکے ہیں اتنا کسی چیز پر نہیں آتا۔ انھوں نے عورتوں اور مردوں کے ایک جلسے میں جہاں انگلستان کے

کل حصّوں کے بااثر لوگ مختلف اداروں اور جماعتوں کے نمائندے جمع تھے فرمایا "اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہے کہ آپ نے ہندوستان پر احسانات کئے یا نہیں؟ آپ یا ہم؟ جو گیہوں چکی میں پسا ہو وہی جانتا ہے کہ چھاتی کا بوجھ کیسا ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا، رانا ڈے، گوکھلے جیسے لوگ جو آپ کا کلمہ پڑھتے تھے جو برطانوی تعلق پر اور تمدن کی برکات پر فخر کرتے تھے، وہ سب اس پر متفق تھے کہ آپ نے مجموعی حیثیت سے، ہندوستان کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ جب آپ جائیں گے تو ہمیں مفلس اور کمزور چھوڑ کر جائیں گے اور آپ کے ان چاہنے والوں کی روحیں پوچھیں گی کہ آپ نے اپنی تولیت کے زمانہ میں ہندوستان کے لئے کیا کیا؟ آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ ہم اتنی بڑی بڑی تنخواہوں پر دربان نہیں رکھ سکتے۔ آپ ہمارے لئے دربان سے بڑھ کر نہیں اور ایک قوم جس کی اوسط آمدنی دو پنس[1] روز ہے دربانوں کے لئے اتنی تنخواہ کہاں لائے گی۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں اور بار بار کہوں گا کہ آپ کے وزیر اعظم کی تنخواہ تو آپ کی اوسط آمدنی کی پچاس گنی ہے لیکن ہندوستان کا وائسرائے ایک ہندوستانی کی اوسط آمدنی کا پانچ ہزار گنا مشاہرہ پاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کمزور ہے۔ خیر یوں ہی سہی، مگر ہمارے دل قوی ہیں۔ نازک بدن ہندوستانی عورتیں۔ وہ نہیں جو مسز نائڈو کی نقل یا ان کی نقل کی نقل ہیں، بلکہ وہ جو تعلیم اور تربیت دونوں سے محروم ہیں آگے بڑھ کر لاٹھی کھاتی ہیں۔ ہم انتظامی قابلیت نہیں رکھتے۔ بہت اچھا مگر آپ ہی کے سر ہنری کیمبل بینرمین کا قول ہے کہ اچھی حکومت اپنی حکومت

---

[1] دو آنے

کا بدل نہیں ہو سکتی۔ آپ جو غلطیاں کرنے میں اُستاد ہیں، جو بقول لارڈ سالسبری کے بھٹکتے بھٹکتے اتفاقاً منزل مقصود تک پہونچ گئے کیا آپ ہمیں غلطیاں کرنے کا حق نہ دیں گے؟ ہم غیروں کی حکومت سے کامل آزادی چاہتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں عورتیں اور مرد اپنی بیڑیاں توڑ کر پھینکنا چاہتے ہیں انھیں دم بھر بھی غیروں کی حکومت میں رہنا گوارا نہیں تو ہم آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں آپ چاہیں تو آپ کی مدد سے، ضرورت ہو بغیر آپ کی مدد کے۔

خدمت کا معیار

اور یہ اقلیتوں کے مسئلے کا ہوّا کیا چیز ہے؟ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ کانگریس اور جماعتوں میں سے ایک جماعت ہے یا سب سے بڑی جماعت ہے۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کانگریس نہ صرف سب سے بڑی جماعت ہے بلکہ سب سے ممتاز جماعت ہے کیونکہ صرف اسی نے آزادی کے لئے جنگ کی ہے۔ کانگریس ہی کے جھنڈے کے نیچے سینکڑوں گاؤں قریب قریب مٹا دیئے گئے۔ ہزاروں روپے کی فصلیں، جلا دی گئیں یا کوڑیوں کے مول بک گئیں اور لاکھوں کی زمینیں ضبط ہو کر نیلام ہو گئیں۔ کیا آپ کے نزدیک ہم نے یہ مصیبتیں بیکار سہی ہیں؟ داستان کہنے والا کہتا ہے کہ کانگریس محض ہندوؤں کی انجمن ہے، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پچھلے سال جو لوگ لڑے یا قید ہوئے یا مارے گئے وہ سب ہندو تھے؟ نہیں۔ ان میں کئی ہزار مسلمان تھے اور ان کے علاوہ سکھ، عیسائی اور پارسی بھی تھے۔ آپ بڑے فرقے اور چھوٹے فرقے کی بحث بیکار چھیڑتے ہیں۔ سب سے بڑا فرقہ کانگریس کا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہم اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ کانگریس

ہندوستان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دے جن میں انگلو انڈین ہوں، ہندوستانی عیسائی ہوں اور ان میں کیتھولک الگ اور پروٹسٹنٹ الگ۔ پھر یورپی ہوں اور ان میں بھی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جدا جدا ہوں، پھر ہندوؤں کے بے شمار فرقے ہوں۔ جین، بودھ، سناتن دھرمی، سماجی وغیرہ وغیرہ؟ میں تو اپنی ذات سے اس چیر پھاڑ کو گوارا نہیں کر سکتا۔ کیا آپ یوں ہی آپس میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی پالیسی سے سب کو ایک قوم بنانا چاہتے ہیں؟ چھوٹی اقلیتوں کو پورا پورا حق ہے کہ کامل مدنی حقوق مانگیں۔ مگر انھیں اس کی ترغیب نہ دیجئے کہ جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کریں۔ وہ مجلس وضع قوانین میں انتخاب کے کھلے دروازے سے داخل ہو سکتے ہیں۔ آخر اینگلو انڈین لوگوں کو یہ اندیشہ کیوں ہے کہ ان کی حق تلفی ہو گی؟ محض انگلو انڈین ہونے کی وجہ سے؟ نہیں وہ اس وجہ سے ڈرتے ہیں، کہ انھوں نے ہندوستان کی خدمت نہیں کی۔ انھیں چاہیئے کہ پارسیوں کی تقلید کریں جنھوں نے ہندوستان کی خدمت کی ہے پھر بھی جداگانہ انتخاب کا مطالبہ نہیں کرتے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ محض حق خدمت کی بدولت وہ کونسل میں پہنچ جائیں گے۔ دادا بھائی نوروجی کی پوری زندگی ہندوستان کی خدمت میں صرف ہوئی اور ان کی چار پوتیاں جو انگلستان کی لڑکیوں کی طرح تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں ہندوستان کے کسانوں کی خاطر مشقت کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک صوبے کی ڈکٹیٹر تھیں۔ اس کے بعد صوبے کی کونسل میں ممبری کی امیدوار ہوئیں تو انھیں سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ آج کل وہ صوبہ سرحد کے پٹھانوں میں، چرخے کو رواج دے رہی ہیں اور ان کے دلوں پر حکومت کر رہی ہیں۔

اینگلو انڈین لوگوں کو بھی یہ چاہیئے کہ خدمت کے کھلے دروازے سے کونسلوں میں داخل ہوں اور یہی انگریزوں کے لئے مناسب ہے۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں، کہ انگریز اس ملک میں، جسے انھوں نے محتاج کر دیا ہے اب تک خاص رعایتیں، مانگتے ہیں اور غریبوں کی مجلس وضع قوانین میں جداگانہ انتخاب کے طالب ہیں؟ نہیں مجھ سے کبھی یہ جرم سرزد نہیں ہو گا کہ اپنے ملک کو ان جماعتوں میں تقسیم کر دوں۔ یہ اس سے کم نہیں کہ پوری قوم کے جسم کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا جائے۔"

چند روز ہوئے، مسز نائڈو جنھیں قدیم روما کی خواتین کی طرح پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا شوق ہے اور انھیں کی طرح اپنے بچوں پر ناز ہے، کچھ نوجوانوں کو لے کر آئیں جو کم و بیش اپنے ملک سے جلا وطن ہو چکے ہیں اور جن کے دل میں اس قدر جوش ہے کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ انھوں نے پہلے گاندھی جی سے بڑے بے ڈھب سوال کئے تھے۔ آج ان کا جواب مانگا۔ ہم ان میں سے کچھ سوال اور گاندھی جی کے جواب درج کرتے ہیں۔

"آپ کے خیال میں یہ ہندوستانی رئیس، زمیندار، کارخانوں کے مالک اور دوسرے منافع خوار اپنی دولت کیونکر حاصل کرتے ہیں؟"

"آج کل تو غریبوں کی محنت سے فائدہ اٹھا کر"

"کیا یہ لوگ ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کو لوٹے بغیر بھی دولتمند ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ ایک حد تک۔"

"کیا معاشرتی حیثیت سے ان لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ معمولی مزدور اور کسان سے زیادہ آرام سے رہیں۔ وہ بیچارے کام کریں، اور یہ اس سے نفع اٹھائیں؟"

معاشرہ

"کوئی حق نہیں۔ میرے ذہن میں معاشرے کا تصور یہ ہے کہ ہم سب میں پیدائشی مساوات ہے۔ یعنی سب کو مساوی موقع ملنا چاہیئے لیکن قابلیت سب میں یکساں نہیں ہوتی۔ یہ انسان کی فطرت کے لحاظ سے ناممکن ہے۔ جس طرح قد یا رنگ یا ذہانت کے اعتبار سے سب ایک سے نہیں ہوتے اسی طرح کمانے کی قابلیت بعض کم رکھتے ہیں، بعض زیادہ رکھتے ہیں۔ قابل لوگوں میں کمانے کی قابلیت بھی زیادہ ہوتی ہے اور وہ اس سے کام لے کر دولت حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے خداداد جوہر سے اچھا کام لیں تو گویا وہ اپنی ریاست کی خدمت کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ محض قوم کے امین ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک قابل آدمی کو اس کی اجازت دینا چاہیئے کہ وہ زیادہ کمائے۔ تاکہ اس کی طبیعت کند نہ ہونے پائے۔ مگر وہ جو کچھ زیادہ کماتا ہے اس کا بڑا حصہ ریاست کے بھلے کے لئے استعمال ہونا چاہیئے جیسے ایک باپ کے سب کماؤ بیٹوں کی آمدنی مشترکہ خاندانی کھاتے میں جمع ہوتی ہے۔ ان دولتمندوں کو محض اپنی دولت کا امانت دار ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے میری یہ کوشش بالکل ناکام ثابت ہو مگر میرا مقصد یہی ہے اور بنیادی حقوق کے اعلان سے بھی یہی مطلب نکلتا ہے۔"

"کیا آپ کے نزدیک کسان اور مزدور اس معاملے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ انھوں نے اپنی معاشی اور معاشرتی آزادی کے لئے دولتمند طبقے سے جنگ چھیڑی ہے تاکہ معاشرہ ہمیشہ کے لئے ان طفیلیوں کے بوجھ سے نجات پائے؟"

"نہیں۔ میں خود ان کی خاطر انقلاب کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر

یہ بے تشدد انقلاب ہے۔"

"آپ نے جو تحریک صوبہ متحدہ میں لگان کم کرنے کے لئے شروع کی ہے اس سے ممکن ہے کسانوں کی حالت بہتر ہو جائے، لیکن اس نظام کی جڑ تو ہلنے کی نہیں"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر انسان ایک ہی وقت میں سب کچھ تو نہیں کر سکتا"

"آپ اپنا امانت داری کا طریقہ کیونکر رائج کریں گے؟ محض سمجھانے بجھانے سے؟"

"نہیں۔ محض زبان سے سمجھا کر نہیں۔ میرے پاس جو ذریعہ ہے اسی پہ سارا زور صرف کر دوں گا۔ بعض لوگ مجھے اپنے زمانے کا سب سے بڑا انقلاب پسند کہتے ہیں۔ میں بھی اپنے آپ کو انقلاب پسند سمجھتا ہوں مگر بے تشدد انقلاب پسند۔ میرا ذریعہ عدم تعاون ہے۔ کوئی شخص دولت اس وقت تک جمع نہیں کر سکتا جب تک وہ لوگ جنہیں اس سے سابقہ ہے خوشی سے یا جبراً اس کے ساتھ تعاون نہ کریں"

"ان سرمایہ داروں کو امین کس نے بنایا؟ انھیں اس میں کمیشن لینے کا کیا حق ہے اور آپ کمیشن کا تعین کس طرح کریں گے؟"

انھیں کمیشن کا حق اس طرح ہے کہ روپیہ ان کے پاس ہے۔ انھیں امین کسی نے نہیں بنایا۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو امین سمجھیں۔ میں ان لوگوں سے جو اپنے آپ کو دولت کا مالک سمجھتے ہیں یہ کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس کا امانت دار سمجھئے یعنی اسے اپنی ذاتی ملک نہ سمجھئے بلکہ ان لوگوں کی دی ہوئی چیز جن کی محنت سے فائدہ

اٹھا کر آپ نے یہ حاصل کی ہے۔ میں جبراً کسی کمیشن کا تعین نہیں کروں گا مگر ان سے یہ کہوں گا کہ جو واجبی ہو وہ لے لیں۔ مثلاً جس شخص کے پاس سو روپے ہیں اس سے میں یہ کہوں گا کہ پچاس تم خود لو اور پچاس مزدوروں کو دیدو۔ لیکن جس کے پاس ایک کروڑ روپے ہیں اس سے شاید یہ کہوں کہ تم صرف ایک فی صدی اپنے لئے رکھو۔ غرض میں کمیشن کی شرح معیّن نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ بڑی سخت ناانصافی ہو گی۔

آسودہ حال طبقے

آج غریب لوگ زمینداروں اور دوسرے منافع خواروں کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ مگر ان میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ ان کے ساتھ ظلم کیا گیا۔ میں غریبوں کو یہ نہیں سکھاتا کہ سرمایہ داروں کو اپنا دشمن سمجھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تم آپ اپنے دشمن ہو۔ عدم تعاون کے پیرؤوں نے لوگوں سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اہل برطانیہ یا جنرل ڈائر برے ہیں بلکہ انھیں یہ بتایا کہ یہ لوگ خود ایک نظام کے پنجے میں گرفتار ہیں اور مٹانا اس نظام کو ہے نہ کہ کسی شخص کو۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی افسران لوگوں کے درمیان، جن کے دلوں میں آزادی کا جوش بھرا ہوا ہے رہتے ہیں اور ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔"

"اگر آپ کو حملہ کسی نظام پر کرنا ہے تو ہندوستانی سرمایہ دار، اور انگریز سرمایہ دار میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ آپ زمینداروں کا لگان کیوں نہیں روکتے؟"

"زمیندار تو محض اس نظام کا آلۂ کار ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کے خلاف اور برطانوی نظام کے خلاف تحریکیں ساتھ ساتھ شروع کی جائیں دونوں میں تفریق کرنا بے وجہ نہیں۔ مگر ہمیں کہیں کہیں لوگوں سے یہ

بھی کہنا پڑا کہ زمینداروں کو لگان نہ دو کیونکہ اس میں سے وہ حکومت کی مالگذاری ادا کرتے ہیں۔ یوں ہمیں زمینداروں سے کوئی پرخاش نہیں بشرطیکہ وہ کاشتکاروں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔"

"آپ کی عملی تجاویز اس بارے میں کیا ہیں کہ کسان اور مزدور کو پورا اختیار دیا جائے کہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کر سکے؟"

"میری تجویز وہی ہے جو میں کانگریس کے ذریعے سے عمل میں لا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی بدولت ان کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے جیسی ہم میں سے کسی کی یاد میں آج تک نہیں تھی۔ میں یہاں ان کی مالی حالت کا ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کا کہ ان میں عام بیداری پیدا ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے انھیں ظلم اور زیادتی کی مزاحمت کی قوت حاصل ہو گئی ہے۔"

"کسانوں پر جو پانچ ارب روپیہ قرض ہے اس سے آپ انھیں کس طرح نجات دلائیں گے؟"

"قرض کی صحیح مقدار کسی کو معلوم نہیں۔ بہرحال وہ جتنا بھی ہو جب کانگریس کے ہاتھ میں قوت آئے گی تو وہ کسانوں کے قرضے کی بھی اسی طرح جانچ کرے گی جس طرح وہ اس قرضے کی جانچ پر مُصر ہے جو آنے والی ہندوستانی حکومت کے ذمے جانے والی حکومت چھوڑ جائے گی۔"

اِس کے بعد جو سوال کیا گیا اس کا جواب بھی گاندھی جی نے اپنے خاص انداز میں دیا۔ ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے اس پر اصرار کیوں نہیں کیا کہ گول میز کانفرنس میں ریاستوں کی رعایا کا کوئی نمائندہ شامل کیا جائے، اور اگر ہندوستان میں وفاقی حکومت ہو اور ہندوستانی ریاستوں کی رعایا اپنے

حقوق حاصل کرنے کے لئے سول نافرمانی شروع کرے تو کیا وفاقی حکومت کی فوجیں ریاستوں کو شورش کے دبانے میں مدد دیں گی۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں ان فوجوں کو کسی جگہ بھی سول نافرمانی کے دبانے کے لئے استعمال نہیں ہونے دوں گا کیونکہ میرے نزدیک ستیا گرہ انسان کی زندگی کا دائمی قانون ہے۔ اب رہا پہلا سوال تو مجھے اس کا اختیار نہ تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ کانگریس کے شایان شان نہ تھا کہ اس کانفرنس میں کسی شخص کی شرکت پر اصرار کرے جس کے منعقد کرنے سے اسے کچھ تعلق نہیں۔ ان کے الفاظ یہ تھے "میں کانگریس کی طرف سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا اور کانگریس کے لئے جو اب تک حکومت سے باغی تھی یہ درخواست کرنا نامناسب تھا کہ فلاں شخص کانفرنس میں شریک کیا جائے۔"

برطانیہ کے ڈاک خانوں کی انجمن ہمارے آنے کے چند ہی روز کے بعد ایک ڈاکئے نے میرابین سے ایک کتاب پر گاندھی جی کے دستخط لینے کی درخواست کی۔ یہ عجیب و غریب کتاب تھی۔ اس کے کئی حصے تھے۔ سپاہیوں، مدبروں، عالموں، خلق اللہ کے خادموں، سب کے دستخط کے لئے صفحے مخصوص تھے اور ہر دستخط اور عکسی تصویر کو اس حصے میں جگہ دی جاتی تھی جس سے وہ متعلق ہو۔ یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ اس کتاب کا مالک ایک من چلا ڈاکیا تھا، وہ شخص نہیں جو دستخط لینے آیا تھا بلکہ ایک اور شخص جس نے ہندوستان میں کوڑھیوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی مخصوص کردی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہمیں بہت دلچسپی پیدا ہوگئی اور ہم نے مسٹر گرڈ سے مسٹر کارڈنل کے حالات سنے جو فوج میں نوکر ہوکر ہندوستان گئے تھے اور وہاں ان کے دل میں خدا نے یہ ڈال دیا کہ ہندوستان کے کوڑھیوں

کی خدمت کریں۔ مسٹر گرڈ دستخط لے کر چلے گئے مگر ہم سے ان سے ملاقات ہو گئی تھی اور وہ کبھی کبھی ہماری طرف آنکلتے تھے اور برطانیہ کے ڈاک خانوں کی انجمن کے حالات سنایا کرتے تھے۔ وہ ہمیں انجمن کے بین الاقوامی رسالے "پوسٹ" کے پرچے بھی بھیجا کرتے تھے۔ انھیں کے توسط سے انجمن کے صدر دفتر میں یہ جلسہ منعقد ہوا۔

ان لوگوں کا دفتر، جلسے کا ہال، ان کی تقریریں اور ساری کارروائی دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ڈاکئے ہیں۔ مگر یہ لوگ سچ مچ سیدھے سچے ڈاکئے تھے جو اپنے کام سے تھوڑا سا وقت نکال کر جمع ہو جاتے ہیں اور نہ صرف اپنی قوم کے امور میں بلکہ ہماری جیسی غریب قوم کے معاملات میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ جیسا گاندھی جی نے کہا ان میں اور ہمارے "بہت کم تنخواہ پانے والے، بیل کی طرح جتے رہنے والے، غریب، جاہل" ڈاکیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ لوگ آزاد قوم کے ہیں یہ بیچارے محکوم قوم کے۔ دونوں کے فرق کو اور بھی نمایاں کرنے کے لئے گاندھی جی نے ان لوگوں کو بتایا کہ ہندوستان کے ڈاکئے اور پوسٹ ماسٹر جنرل کی تنخواہ میں وہی نسبت ہے جو ایک ہندوستانی کی اوسط آمدنی اور وائسرائے کے مشاہرے میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ ہندوستان کے ڈاکئے "پوسٹ" کا سا معقول اخبار نکالیں یا ان کی انجمن کا ایسا شاندار دفتر ہو یا وہ آپس میں چندہ کر کے ہندوستان میں کوڑھیوں کا اسپتال چلا سکیں۔ گاندھی جی نے کہا "ہمارے یہاں بھی ڈاکیوں کی انجمن ہے جس کے صدر وہی ہیں جو کانگریس کے صدر ہیں۔ مگر حالات ہی ایسے ہیں

کہ اس کا مقصد سوائے اپنی شکایتیں بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لینے کے اور کچھ نہیں۔"

سپاہی جو خادم خلق بن گیا

اس طرح کا نمایاں فرق دیکھ کر انسان کے دل میں آزادی کا شوق اور بھڑک اٹھتا ہے اور اس کا ارادہ اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ بے آزادی حاصل کئے چین نہ لے۔ مگر اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ برطانیہ کے ڈاکیوں کے شاندار کام کی داد نہ دیں یا ان کے اس اخلاق کا اعتراف نہ کریں کہ انھوں نے گاندھی جی کو دعوت دی تاکہ وہ انھیں ہندوستان کے ڈاکیوں اور کوڑھیوں کے اسپتالوں کا حال سنائیں اور یہ بتائیں کہ انگلستان کس غرض سے آئے ہیں۔ مسٹر کارڈنل کو ہندوستانی تہذیب، ہندوستان کے قدیم افسانوں ہندوستان کے سورما مرد اور عورتوں یہاں تک کہ ہندوستان کے پہاڑوں اور دریاؤں سے دل سے محبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ گو میں سپاہی تھا مگر ہندوستان میں اندھوں کی طرح نہیں بلکہ آنکھ کھول کر رہتا تھا۔ الہ آباد میں ایک کوڑھی کو دیکھ کر مجھے اتنا ترس آیا کہ میں نے اپنی زندگی ہندوستان کے کوڑھیوں کی خدمت میں صرف کرنے کا عہد کر لیا۔ انگلستان واپس آ کر میں ڈاک خانے میں نوکر ہو گیا اور میں نے جو کچھ دیکھا تھا اپنے دوستوں سے بیان کیا۔ تمام برطانیہ کے ڈاکیوں سے چندہ جمع کر کے میں نے مدراس میں کوڑھیوں کا اسپتال کھولا۔ تب سے اب تک مجھے محکمے نے دو بار تین تین مہینے کی چھٹی دی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسپتال بڑھ کر ایک اچھی خاصی بستی بن گیا۔ اب میں نے نوکری سے پنشن لے لی ہے لیکن ہندوستان کے کوڑھیوں کی خدمت ترک نہیں

کی ہے بلکہ انگلستان کے ڈاکیوں کے چندے سے یہ کام چلا رہا ہوں۔
اس انجمن کو ہندوستان کے ڈاکیوں سے بھی کچھ کم ہمدردی نہیں۔
اس کے صدر نے کہا کہ ہمارا نقطۂ نظر بین الاقوامی ہے۔ گو ہمیں کسی بین الاقوامی
انجمن سے ملحق ہونے کی ممانعت کردی گئی ہے مگر امید ہے کہ ایک دن ایک
ایسی انجمن میں شریک ہوں گے جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہو۔ آج کل
ہمارے ممبر دس لاکھ ہیں اور ہمارے رسالے (مقامی اور بین الاقوامی)
کل ممبروں کو تقسیم کئے جاتے ہیں۔
ان لوگوں کی انتظامی قابلیت اور خدمت خلق کی قدردانی کے
طور پر گاندھی جی ایک شام ان کے ساتھ گذارنے پر راضی ہو گئے تھے۔
اور انھیں ہندوستان کا ہمدرد بنانے کے لئے انھوں نے جنگ آزادی
کی رومانی داستان ایسے الفاظ میں سنائی کہ گویا تصویر کھینچ کر دکھادی۔

آس پاس کے سفر

(۱)

چیچسٹر جانا بہت مفید ہوا۔ کیونکہ انگلستان کے تین ممتاز اور با اثر اشخاص سے ملاقات ہو گئی۔ چیچسٹر کے بشپ بیل سے، کیپٹن کیمبل سے اور مانچسٹر گارجین کے سابق ایڈیٹر مسٹر سی، پی، اسکاٹ سے۔

گاندھی جی نے ان تینوں سے کھل کر باتیں کیں اور انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ گاندھی جی کی زبان سے انھیں ہندستان کے صحیح حالات معلوم ہوئے۔

بشپ آف چیچسٹر یہ بشپ صاحب اور پادریوں سے، جن سے ہم اب تک ملے، بالکل مختلف طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کی وضع قطع سے مذہبی "رنگ" خاص طور پر نمایاں نہیں۔ وہ ہر موضوع پر جو چھیڑ دیا جائے اس طرح بے لاگ گفتگو کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مسئلے کے متعلق رائے قائم کر چکے ہیں۔ لیکن گفتگو میں انھیں دوسرے سے اتفاق نہ بھی ہو تب بھی اسے اس کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ اچھے خاصے دبنگ آدمی ہیں اور ان میں یہ قابلیت موجود ہے کہ ملکی معاملات کو بڑی خوبی سے نبٹا ئیں پہلے پہل انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیشے کے انتخاب میں غلطی کی مگر فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ ان کی ہر بات میں ہر کام میں روحانیت کی جھلک نظر آتی ہے اور اُن کی زندگی اس قدر سادہ

ہے کہ یہ قول کپتین کیمبیل کے "ہمارے بشپ ایک جھونپڑے میں اتنے ہی خوش رہ سکتے ہیں جتنے اپنے محل میں۔" وہ بہت دن تک آکسفورڈ میں ٹیوٹر رہ چکے ہیں اور اسی کالج کے پڑھے ہوئے ہیں جس کے لارڈ اروِن ہیں۔ ان سے اور اور بہت سے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں اور میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ گاندھی جی نے جو گھنٹے ان کے ساتھ گذارے ہیں ان میں سے ایک منٹ بھی بیکار نہیں گیا۔ وہ مجھ سے بڑے وثوق سے کہنے لگے "میں یہ نہیں مان سکتا کہ کانفرنس میں اقلیتوں کے مسئلے کی بدولت کھنڈت پڑ سکتی ہے۔ کل بہت سے پادریوں نے مسٹر گاندھی سے بہت سے سوالات کئے اور ان میں سے ایک نے یہ امید ظاہر کی کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں طے ہو جائے گا تو مسٹر گاندھی نے کہا کہ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اسے یہیں طے کروں گا۔ میرے خیال میں وہ ضرور کر لیں گے ان کی امید پروری[1] ایسی نہیں جو خالی خولی ہو" اس کے بعد انھوں نے فرمایا: "مجھ سے مسٹر گاندھی سے بہت مفید گفتگو ہوئی اور جتنا ایک ناواقف آدمی سمجھ سکتا ہے میں نے ان سے سمجھ لیا۔ لیکن میرے خیال میں وہ بعض لوگوں سے اتنے بدظن ہیں جتنا انھیں ہرگز نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ خوف کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے آئے تو وہاں ابتری اور خانہ جنگی ہو جائے گی۔ بالکل بے بنیاد اور محض ناواقفیت پر مبنی ہے لیکن آپ یقین کیجئے کہ یہ خوف واقعی لوگوں کے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آئندہ دستور میں ایسی دفعات رکھی جائیں کہ ان کا یہ خوف دور ہو جائے۔"

---

[1] optimism.

ان سے اور گاندھی جی سے بہت مفصّل گفتگو ہو چکی ہے اور اگر کانفرنس کے باہر کوئی شخص ہے جو ارباب کار کی رائے پر اثر ڈال سکتا ہے تو وہ یہی بزرگ ہیں۔ میں نے ان سے کہا "فرض کیجیے کہ کوئی نتیجہ نہ نکلے تب بھی گاندھی جی کے یہاں آنے سے یہ فائدہ ہو گا کہ انگلستان اور ہندوستان میں باہم زیادہ گہری مفاہمت ہو جائے گی اور امن کے حامیوں کو اپنے مقصد میں بہت مدد ملے گی۔"

انھیں میرے قول کے پہلے حصّے سے اتفاق تھا مگر دوسرے حصّے سے نہیں تھا۔ انھوں نے کہا "کوئی وجہ نہیں کہ ان کے آنے کا اور کوئی نتیجہ نہ نکلے لیکن اگر واقعی کچھ نہ ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ انجام کیا ہو گا۔ ہم جانتے ہیں کہ منچوریا میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے مگر بتائیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اگر ہندوستان کے معاملہ کا تصفیّہ نہ ہو سکا اور وہاں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہمیں یقیناً یہاں ہاتھ پیر مارنا چاہیئے مگر مجھے اس میں شبہہ ہے کہ ہم سے کوئی بات بن پڑے گی۔ خدا جانے امن کے حامیوں کو کوئی تدبیر سوجھے یا نہ سوجھے۔" انھیں اس مصیبت کا مداوا کرنے سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

میں نے ان سے پوچھا "آج کل امن کے حامیوں میں ممتاز لوگ کون کون سے ہیں؟" انھوں نے فوراً البرٹ شوائٹزر اور رومیں رولاں کا نام لیا۔ وہ ڈاکٹر شوائٹزر کی نئی کتاب کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ انھوں نے کہا "ان کی ذات بڑی اخلاقی قوت کا مرکز ہے۔ جب میں ان سے پہلی بار فرانس میں ملا تو مجھے ان کے کارڈ پر "ڈاکٹر آف میڈیسن[1]، ڈاکٹر آف تھیالوجی[2]،

[1] فاضل طب [2] فاضل دینیات

ڈاکٹر آف میوزک[1] دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ یہ سب فضیلت کی سند یں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے دل میں یہ ٹھان لی کہ مجھے افریقہ کے جنگلوں میں جا کر خطرے اور موت کے منہ میں رہ کر کام کرنا ہے۔"

ڈاکٹر شوائٹزر کی شجاعت اور بے نفسی کو اور نمایاں کرنے کے لئے انھوں نے کہا "یہ خطرہ اور یہ موت بھی اس قسم کی تھی جس سے بدتر ہو ہی نہیں سکتی"۔ انگلستان کے حامیان امن میں سے انھوں نے ڈاکٹر ماڈ را ئیڈن اور آرتھر پونسو بنبی اور "صلح کی برادری"[2] کے چند ممبروں کا ذکر کیا۔ آخر میں انھوں نے صاف صاف کہہ دیا "مسٹر ایچ جی ویلس اور برٹرینڈ رسل بھی اس کے حامی ہیں مگر ان کی ذات میں وہ اخلاقی قوت نہیں جو ہمارے پیش نظر ہے۔"

کیپٹن کیمبیل

کیپٹن کیمبیل اور قسم کے آدمی ہیں۔ ان کی طبیعت کا اندازہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور ان کے علم وفضل کا دریا ہمیشہ بہتا رہتا ہے ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے جو ان کے سے مشہور واعظ کے شایان شان ہے اور انھیں مشرقی فلسفے میں ایسی بہت سی چیزیں ملی ہیں جو ان کے خیالات سے مطابقت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر ٹیگور کی تصانیف کا ان پر بہت گہرا اثر ہوا ہے اور ان کے دل میں خاموشی اور غور وفکر کی آرزو ہے اگرچہ چند سال ہوئے انھوں نے ایسا شدید مناظرہ چھیڑ رکھا تھا کہ دینیات کے عالموں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ انھیں سوراج کے لغوی معنی معلوم کرنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور جب گاندھی جی نے اس کا مادّہ بتایا اور اس کے معنی تزکیۂ نفس اور ایثار بیان

---

[1] فاضل موسیقی

[2] Fellowship of Reconciliation

کئے تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "یہی چیز سارے بڑے مذہبوں کی جان ہے۔" وہ "جدید سائنس کے آتش بار حملے سے" نالاں ہیں اور ان کے نزدیک ہمارے زمانے کا اصل مرض یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں دنیاوی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ انھیں ہندوستانیوں کے مقصد سے دلی ہمدردی ہے۔ اور انھیں بڑی خوشی تھی کہ ان کی اور گاندھی جی کی ملاقات ایک روحانی معانقے کی شان رکھتی ہے۔

ایک پرانے اخبار نویس

انگلستان کے پرانے اخبار نویس مسٹر سی پی اسکاٹ کی ملاقات بہ قول گاندھی جی کے بزرگوں کی زیارت سے کم نہ تھی۔ وہ پچاس برس تک مانچسٹر گارجین کے ایڈیٹر رہے اور ۱۹۲۹ء میں ۸۳ برس کے سن میں اس سے علیحدہ ہوئے۔ اب ان کی عمر ۸۵ برس کی ہے مگر ان میں بیس برس کے جوانوں کا سا دم خم ہے۔ ہم کو اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ وہ اوور کوٹ کے لئے زینے پر چڑھے اترے تو دوڑتے ہوئے اور مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے۔ وہ انگلستان کے جنوبی ساحل پہ بوگنور میں اپنی بہن کے گھر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس کے وہ پوری طرح مستحق ہیں۔ بوگنور کو اس وجہ سے بہت شہرت حاصل ہو گئی ہے کہ بادشاہ پچھلی بار بیمار ہوئے تھے تو صحت کے بعد قوت آنے تک انھوں نے یہیں قیام کیا تھا۔ یہاں مسٹر اسکاٹ کی بہن سے بھی ملاقات ہوئی جن کی عمر ۹۷ برس کی ہے۔ اب تک ان کے قویٰ سلامت ہیں اور چہرے پر جھریاں تک نہیں، البتہ کسی قدر اونچا سننے لگی ہیں۔ انھیں ہر چیز سے دلچسپی معلوم ہوتی تھی اور گاندھی جی کی تشریف آوری کو وہ اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھتی تھیں۔ جب ہم رخصت ہو رہے تھے۔ تو

گاندھی جی نے کہا "مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے مقصد کی کامیابی کی دعا کریں گی۔" انھوں نے بڑی گرم جوشی سے کہا "بے شک۔ ضرور کروں گی۔"

مسٹر اسکاٹ سے گاندھی جی نے بہت تفصیل سے گفتگو کی۔ وہ کوئی بحث چھیڑ کر انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب بڑے میاں ان کے استقبال کے لئے بڑھے تو انھوں نے کہا:۔

" میں محض آپ کی زیارت کی غرض سے آیا ہوں۔ سالہا سال تک آپ کا اخبار غلط فہمی اور غلط بیانی کے صحرا میں ایک نخلستان کا کام دیتا رہا اور میں چاہتا تھا کہ آپ سے مل کر اور کچھ نہیں تو اپنی شکر گزاری کا اظہار کر دوں۔" وہ گاندھی جی کو مکان کے پچھلے حصّے میں ایک شیشے کے کمرے میں لے گئے جو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر طرف سے دھوپ آتی ہے۔ یہاں یہ دونوں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے اور میں اور چارلی اینڈریوز برابر کے کمرے میں بیٹھ کر انھیں دیکھا کئے۔ اور ان کی گفتگو سُنا کئے۔ مسٹر اسکاٹ واقعات حاضرہ سے اچھی طرح باخبر معلوم ہوتے تھے اور انھیں یہ اطلاع تھی کہ گاندھی جی نے ایک جلسے میں یہ بیان کیا کہ انگریزوں کی حکومت سے بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کو فائدہ نہیں پہنچا۔ مسٹر اسکاٹ نے کہا "کیا آپ کے خیال میں یہ برطانوی حکومت کی برکت نہیں کہ آج ہندوستان میں اتحاد موجود ہے۔" گاندھی جی نے کہا "جی ہاں، ظاہری اتحاد ہے جو برطانوی حکومت نے باہر سے پیدا کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نازک موقعوں پر انتشار پیدا کرنے والی قوتیں اُبھر آتی ہیں جیسا کہ ہم آج کل دیکھتے ہیں۔ مسٹر میکڈانلڈ کو میرا کہنا ناگوار ہوا، مگر مجھے یقین ہے کہ اگر کانفرنس میں ایسے لوگ ہوتے جو واقعی ہندستان کے

نمائندے کہے جاسکتے تو فرقہ وارانہ مسئلے کا حل کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر یہاں تو بقول سرعلی امام کے جتنے لوگ ہیں سب وزیر اعظم کی مرضی سے آئے ہیں۔ فرض کیجئے یہی لوگ آتے لیکن اگر یہ قوم کے منتخب کئے ہوئے ہوتے، تو ان کے دل میں ذمہ داری کا جتنا احساس اب ہے اُس سے زیادہ ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کے لوگ نامزد کئے گئے ہیں جو خدا جانے کتنے فرقوں کے نمائندے کہلاتے ہیں اور ہماری راہ میں طرح طرح سے روڑے اٹکاتے ہیں۔"

میں پوری بحث تو نقل نہیں کرنا چاہتا بلکہ سچ پوچھئے تو جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں بڑے میاں سے جو گفتگو ہوئی وہ بحث کی شکل میں تھی ہی نہیں۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کا، جو اہم واقعات سے معمور تھی، ذکر کرتے رہے اور ایسے ایسے جیّد بزرگوں کو یاد کرتے رہے جیسے گلیڈ اسٹن "جن کی خوب صورت سیاہ آنکھیں محبّت اور جوش سے معمور تھیں" اور کیمبل بینرمین جو اپنی مُدبّری کے نقوش صفحہ تاریخ پر چھوڑ گئے ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ اس مُدبّر کا جنوبی افریقہ کا دستور مرتب کرنے میں کیا حصّہ تھا اور ان کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایسے ایسے سورماؤں کا دل ہی دل میں ماتم کر رہے ہیں۔

بانیان سلطنت کا گھوارہ آیٹن کم و بیش قدامت پسندوں یا شہنشاہی کے حامیوں کا مرکز ہے۔ اور وہاں اونچے متوسط طبقے کے لوگ بہ قول پادری ہیپلپلس کے یہ سبق سیکھتے ہیں کہ "روئے زمین کو فتح کرنے، وحشی قوموں پر حکومت کرنے، اور سلطنت کے تعمیر کرنے میں مردانگی کے جوہر دکھائیں" ایٹن کو اس پہ ناز ہے کہ اس نے انگلستان کو ایسے ایسے وزیر اعظم دیئے ہیں جیسے گلیڈ اسٹن، سالسبری روزبری، بالفور اور ہندوستان کو ایسے ایسے وائسرائے جیسے ویلز لی مٹکاف، آکلینڈ، النبرو، کیننگ، ایلجن، ڈفرن، لینسڈاؤن، کرزن ارون اور ان کے علاوہ بہت سے گورنر۔ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ایٹن کی تربیت سے "انھیں اس میں مدد ملی کہ ان عظیم الشان مقبوضات کا انتظام کریں، جہاں انھیں کبھی کبھی اپنی جان خطرے میں ڈالنا پڑی بلکہ قربان کرنا پڑی" ویلنگٹن، رابرٹس اور بُلر جیسے جنرل سب ایٹن کے تھے اور ایٹن کے لڑکوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ جہاں کہیں انگلستان کا جھنڈا میدان جنگ میں لہرایا ہے بہت سے ایٹن والوں نے اپنی جان اپنے ملک پر قربان کی ہے"

اس مدرسے کے ایک پُرجوش معرف کہتے ہیں "ایٹن میں روز بڑے آدمی تیار ہوتے ہیں اور ملک کی آئندہ تاریخ کا مسالہ ہاتھ آتا ہے" جہاں انگلستان کے امیر خاندان کے لڑکوں کی پرورش اس ماحول میں ہوتی ہو وہاں کے منتظموں کے لئے یہ کوئی آسان چیز نہ تھی کہ بڑے

لڑکوں کی درخواست پر گاندھی جی جیسے سلطنت کے باغی کو بلانے کی اجازت دے دیں اور ہیڈ ماسٹر کے لئے یہ سہل نہ تھا کہ انھیں اس پانسو سال پرانی عمارت میں ٹھرائیں۔ ہم اس دعوت کے اور ہیڈ ماسٹر کی مہمان نوازی کے دل سے شکر گزار ہیں مگر سچ پوچھئے تو یہ دعوت بھی اسی لئے تھی کہ لڑکوں کو شہنشاہی کی حمایت کا ایک اور سبق ملے۔ ایٹن کے لڑکوں کے لئے ایک کتب خانہ ہے جس میں پچیس ہزار کتابیں ہیں۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ میں وہ جو کچھ پڑھتے ہیں وہی پرانی روایتیں ہیں جو چلی آرہی ہیں اور غالباً گاندھی جی کو بلانے کا مقصد لڑکوں کو عملی طور پر یہ دکھانا تھا کہ ہندوستانی اپنے ملک پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں اس لئے ہندوستان کو بدستور انگلستان کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ ہم پچاس لڑکوں کے مجمع میں تھے جو وہاں کے کلب کے ممبر ہیں اور ان کے سامنے تقریر کرنے کی جگہ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے سوال کرتے جاؤ اور ہم سب مل کر بے تکلفی سے باتیں کریں۔ مگر بھلا وہ یہ کہاں کرنے والے تھے۔ انھیں صرف ایک یا دو رٹے کہ دو سوال پوچھنا تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس حصار کے باہر نکلنے کی انھیں ممانعت کردی گئی ہے۔ ان کے صدر نے کہا "مسٹر شوکت علی مسلمانوں کا معاملہ ہمیں سمجھا چکے ہیں۔ آپ براہ مہربانی ہندوؤں کا معاملہ سمجھا دیجئے۔" اور جب گاندھی جی نے لڑکوں سے کہا کہ سوالات پوچھو تو ایک لڑکے نے یہی سوال دُہرایا۔ زمین و آسمان کا فرق ہے ان میں اور غریب مشرقی لندن کے لڑکوں میں جنھوں نے گاندھی جی پر اُن کے گھر، ان کے لباس، ان کے چپل اور ان کی زبان کے متعلق سوالوں

کی بوچھار کردی تھی! مگر وہ کچھ بیچارے بڑے ہو کر سلطنت کے بانی تھوڑا ہی بنیں گے۔

بہر حال گاندھی جی نے ان کی فرمایش قبول کرلی اور ان کو وہ جواب دیا جس کی انھیں توقع نہ تھی۔ میں یہاں صرف اس کا خلاصہ دیئے دیتا ہوں۔

غیر ملکی کا تجزیہ

آپ کا مدرسہ انگلستان میں بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔ آپ میں سے کچھ لوگ آگے چل کر وزیر اعظم اور سپہ سالار بنیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت جب آپ کی سیرت بن رہی ہے آپ کے دل میں راہ پیدا کرلوں کیونکہ یہی وقت ہے جب آسانی سے راہ نکل سکتی ہے۔ میں آپ کے سامنے چند سچے واقعات پیش کرتا ہوں۔ اس چھوٹی تاریخ کی جگہ جو آپ پڑھتے چلے آئے ہیں۔ آپ کے اراکین سلطنت کو میں نے ان امور میں بالکل ناواقف پایا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ معلومات نہیں رکھتے بلکہ یہ کہ ان کی معلومات غلط واقعات پر مبنی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو صحیح واقعات بتاؤں کیونکہ میں آپ کو سلطنت کے بانی نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایسی قوم کے افراد جو اب دوسری قوموں کو لوٹنا چھوڑ دے گی اور دنیا کے امن کی محافظ بن جائے گی وہ بھی تلوار کے بل پر نہیں بلکہ اپنی اخلاقی قوت کی بدولت۔ خیر تو میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ ہندوؤں کا کوئی الگ معاملہ کم سے کم میرے نزدیک نہیں ہے کیونکہ ملک کی آزادی کے مسئلے میں میں ہندو ہونے سے اسی طرح بری ہوں جس طرح آپ۔ ہندوؤں کا معاملہ ہندو مہاسبھا کے نمائندوں کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے جنہیں ہندوؤں کے خیالات کی ترجمانی کا دعویٰ ہے مگر میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ سیاسی مسائل کا فیصلہ قومیت

کے رنگ میں ہو اس لئے نہیں کہ وہ قومیت پسند ہیں بلکہ اس لئے کہ اس میں ان کا مطلب نکلتا ہے۔ میرے نزدیک اس حکمت عملی سے کام بگڑتا ہے اور میں انھیں سمجھا رہا ہوں کہ آپ لوگ بڑی اکثریت کے نمائندے ہیں آپ کو چاہیئے کہ چھوٹے فرقوں کو وہ کل حقوق دیدیں جو وہ مانگتے ہیں پھر دیکھئے آناً فاناً ساری فضا بدل جائے گی جیسے جادو کا کھیل ہو!!

"عام ہندو کیا سمجھتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں یہ کسی کو معلوم نہیں مگر میں سالہا سال سے ان کے درمیان رہتا سہتا چلتا پھرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی پروا نہیں کرتے انھیں حکومت کے خوان کرم کے ٹکڑوں کی یعنی کونسلوں کی نشستوں اور انتظامی عہدوں کی فکر نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کا ہوّا زیادہ تر شہروں تک محدود ہے جو اصل ہندوستان نہیں بلکہ لندن یا دوسرے مغربی شہروں کی بگڑی ہوئی نقل ہیں، جو جان بوجھ کر یا بے جانے گانووں کا خون چوستے ہیں۔ یعنی انگلستان کے دلال بن کر، آپ لوگوں کے ساتھ مل کر انھیں لوٹتے ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہندوستان کی آزادی کے عظیم الشان مسئلے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا جس سے برطانوی وزرا خاص کر کے پہلو بچاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر ہندوستان میں یہی شورش اور بغاوت رہی تو کب تک کام چلے گا۔ یہ سچ ہے کہ ہماری بغاوت بے تشدد ہے مگر آخر ہے تو بغاوت۔ ہندوستان کی آزادی اس بیماری سے رکنے والی نہیں جو آج ہم میں سے بعض کے دل میں آگ کی طرح سلگ رہی ہے اور اگر دستور کے مسئلے کا قابل اطمینان فیصلہ ہو جائے تو یہ فرقہ پرستی کا مرض فوراً زائل ہو جائے گا۔ جیسے ہی غیر ملکی پچر ہٹے گی وہ فرقے جو

الگ ہوگئے ہیں خود بخود مل جائیں گے۔ اس لئے ہندوؤں کا کوئی الگ
معاملہ نہیں ہے اور اگر ہے تو انھیں اس سے ہاتھ دھونا چاہیئے۔ اگر آپ
اس مسئلے کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو کچھ حاصل نہ ہوگا اور اس کی تکلیف دہ
جزویات سے واقف ہونے کے بعد غالباً آپ ہم لوگوں کے متعلق یہ کہیں گے
کہ یہ ٹیمس میں ڈوب مریں تو اچھا ہے۔"

روحانیت اور بہیمیت

"میں آپ سے سچ سچ کہتا ہوں فرقہ وارانہ مسئلہ ایسی
چیز نہیں کہ آپ اس کی فکر میں پریشان ہوں۔
لیکن اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس زبردست مسئلے پر غور
کیجئے کہ کروروں آدمی عدم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے پر کیونکر آمادہ ہوگئے
اور اس پر کس طرح قائم رہے۔ انسان کو دیکھنا ہے تو بہیمیت کی حالت
میں نہ دیکھئے جب وہ جنگل کے قانون کا پابند ہوتا ہے بلکہ اس کی روحانی
شان دیکھئے۔ جو لوگ فرقہ وارانہ جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں وہ انسانیت
کے ان نمونوں کی طرح ہیں جو پاگل خانے میں نظر آتے ہیں۔ آپ ان
لوگوں کو دیکھئے جو اپنے ملک کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں دے دیتے
ہیں مگر دوسروں کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچاتے۔ انسان کو اپنی برتر
فطرت کے قانون یعنی محبت، کے قانون پر چلتے دیکھئے تاکہ جب آپ بڑے
ہوں تو انسانی تمدن کی امانت میں آپ اور اضافہ کرسکیں۔ جو شخص ایک
غلام کے پیروں میں زنجیر ڈالتا ہے وہ گویا اپنے پیروں میں زنجیر ڈالتا ہے
اور جو قوم کسی دوسری قوم کو محکوم بناتی ہے وہ خود محکوم بن جاتی ہے۔
آج کل انگلستان اور ہندوستان میں جو تعلق ہے وہ بہت نامعقول
اور ناپاک تعلق ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ہمارے مقصد کے

لئے دعا کریں کیونکہ ہمیں آزادی کا خلقی اور فطری حق ہے اور پھر یہ حق ان تکلیفوں کی بدولت جو ہم نے سہی ہیں اور اس تفاسیر کی بدولت جو ہم نے دیا ہے، اور بھی بڑھ گیا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جب آپ ٹیڑھے ہوں تو اپنی قوم کو لوٹ کے گناہ سے باز رکھ کر اس کی عظمت کو چار چاند لگائیں اور نوع انسانی کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں "

دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے آئیں تو وہاں کے غارت گر رئیسوں کے ہاتھ سے ملک پر کیا گزرے گی۔ گاندھی جی نے انہیں یقین دلایا کہ رئیسوں سے کوئی خطرہ نہیں اور اگر ہو بھی تو ان سے نپٹنا انگریزوں سے نپٹنے سے زیادہ سہل ہے اور کچھ نہیں تو ان لوگوں کی کمزوری ہی انہیں اس سے روکنے کے لئے کافی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ انگریزوں کو نکال باہر کرے بلکہ اس میں ہے کہ انہیں لوٹنے والوں سے دوست بنا کر یہاں رکھے کہ جب ضرورت ہو تو ہندوستان کے کام آئیں۔

معلوم نہیں گاندھی جی کے آنے کا طالب علموں پر کیا اثر ہوا، مگر یہ مجھے یقین ہے کہ ذہنی حیثیت سے انہیں جو دھچکا لگا وہ بہت دن یاد رہے گا۔ ملنے جلنے کا اثر سنی سنائی باتوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے غلط فہمی کا کہرا اکثر محبت کی ملاقات کی گرمی سے چھینٹ جاتا ہے۔ خیالات میں جو فوری تغیر ہوتا ہے اس کی میں ایک مثال دیتا ہوں۔ میرا بین کے ہندوستانی کپڑے اور ان کا گاندھی جی کے پیروؤں کے حلقے میں ہونا وہاں بعض عورتوں کو بہت گراں گزرا وہ یہ مانتی ہی نہیں کہ یہ انگریز قوم سے ہیں۔ جب میرا بین نے کہا کہ میں امیر البحر سلیڈ کی

بیٹی ہوں اور میرے رشتے کے دادا ڈاکٹر ایڈمنڈ ڈرا ایٹن کے ممتاز طالب علم تھے اور کچھ دن ہیڈ ماسٹر بھی رہے تھے تو یہ خواتین بڑی سختی سے اعتراض کرنے لگیں۔ مگر میرا ایٹن کے ابرو پر بل نہ آیا۔ انھوں نے مسکرا کر تمام سوالوں کا جواب دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو گھنٹے کھل کر گفتگو کرنے کے بعد ان سے اور ان خاتون سے جو سوال کر رہی تھیں دوستی ہو گئی۔

برطانوی قوم ہندوستان میں علم و فن کی قدردان نہیں ہے

جب لندن کے ایک اہم جلسے میں گاندھی جی نے کہا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ماتحت پڑھے لکھوں کی تعداد اس سے کم ہے جتنی اس سے پہلے کے زمانے میں تھی تو لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور ان کی بات کو بہت سخت مبالغہ سمجھے۔ لیکن جب انسان اس پر غور کرتا ہے کہ ایٹن کا مدرسہ پانچ سو سال پرانا ہے، آکسفورڈ کے کم سے کم تین کالج بیلیل، مرٹن اور یونی ورسٹی کالج ۱۲۶۱ء میں یا اس سے پہلے قائم ہوئے تھے اور ان تینوں میں قدامت کے مسئلے پر نزاع رہتی ہے۔ اور پھر ہندوستان پر نظر کرتا ہے جس کی تہذیب بہت سی قوموں کی تہذیب سے پرانی ہے اور وہاں ایٹن یا بیلیل کی قدامت کے مدرسوں کا نشان بھی نہیں ملتا تو وہ گاندھی جی کی بات کی تہ کو پہونچ جاتا ہے۔ برطانوی حکومت سے پہلے ہندوستان کے تمام قدیم شہروں میں دار العلوم تھے، ہر گاؤں میں مکتب ہوتا تھا۔ ہر مسجد، ہر خانقاہ مدرسہ تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مدرسے کیا ہوئے۔ اگر وہ باقی رہنے دئے جاتے اور ان کی پرداخت ہوتی تو ممکن ہے آج ہمارے یہاں بھی ایٹن اور بیلیل اور مرٹن نظر آتے۔

یہ خیال بے ساختہ ایک ہندوستانی کے دل میں پیدا ہوتا ہے جب وہ ان مدرسوں کو دیکھنے کے لئے جاتا ہے جن کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اس ملک کی۔

آکسفورڈ کے علماء

گاندھی جی کا آکسفورڈ کا سفر بھی قابل ذکر ہے۔ وہاں کے لوگ بڑی محبت سے پیش آئے اوران کی دل سے یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسئلے کو سمجھیں اوراس کی تہ تک پہونچ جائیں۔ بیلیل کالج کے صدر، ڈاکٹر لنڈسے نے جو اپنے ہندوستان آنے کے زمانے میں گاندھی جی کو دعوت دے چکے تھے، کہ چندروز ان کے گھر رہ کر اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کریں، اس دعوت کی تجدید کی۔ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ گاندھی جی ہفتے کے آخری دن چین سے گزاریں لیکن اس سے زیادہ یہ تھا کہ انھیں آکسفورڈ کے باا ثر علمائے ملادیں۔ وہ خود اس غرور سے بالکل پاک ہیں جو حاکم قوم کے افراد میں ہوتا ہے (وہ ہیں بھی اسکاٹستان کے باشندے) اوراس کے قائل ہیں کہ آزادی ہندوستان کا فطری حق ہے۔ انھوں نے آسانی سے کچھ دوستوں کو اکٹھا کرلیا جو ہندوستان کے مسئلے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ متعدد صحبتیں اور جلسے ہوئے۔ ایک صحبت جس میں کوئی چالیس منتخب حضرات تشریف رکھتے تھے صدر بیلیل کے گھر پر منعقد ہوئی اور باقی دوسرے مقامات پر۔

مسٹر ٹامسن نے (جو تصویر کا دوسرا رخ[1] کے مصنف ہیں اور جنھوں نے اپنی دوسری کتاب کفارہ[2] میں ایک خیالی تصویر دکھائی ہے کہ انگلستان ان گناہوں

---

[1] The Other Side of the Medal.

[2] Atonement

کی جو ہندوستان میں کئے ہیں، تلافی کر رہا ہے) چند بزرگوں کو جن میں، ڈاکٹر گلبرٹ مرے، ڈاکٹر گلبرٹ سلیٹر، پروفیسر ایس کوپ لینڈ اور ڈاکٹر دت تھے، دعوت دی کہ گاندھی جی سے اطمینان سے دل کھول کر باتیں کریں ایک اسی قسم کی صحبت آکسفورڈ کے ممتاز پروفیسروں کے ساتھ اور اس کے بعد ریلے کلب کے ممبروں کے ساتھ رہی جن میں زیادہ تر برطانوی مقبوضات کے طلبار اور متعدد سیسل رھوڈس اسکالر ہیں اور یہ سب کے سب سلطنت کے مسائل کا بہت غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ہندوستانی طلبار کی مجلس کا جلسہ جس میں کچھ انگریز طلبار بھی بلائے گئے تھے سب کے آخر میں ہوا مگر سب سے مؤخر نہ تھا۔

مسٹر ٹامسن کے گھر پر ہر قسم کے موضوعوں پر گفتگو ہوتی رہی اور بعض بنیادی مسائل بھی چھیڑے گئے۔ بعض حضرات کو یاد ہوگا کہ سر گلبرٹ مرے نے تیرہ سال ہوئے ہبرٹ جرنل میں بہیمی قوت کی جگہ روحانی قوت کے استعمال کی حمایت میں مضمون لکھا تھا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بے تشدد انقلاب اور قومیت کی تحریک نے بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ انھوں نے کہا "آج میں مسٹر چرچل سے بھی بڑھ کر آپ سے اختلاف رکھتا ہوں"۔ گاندھی جی نے جواب دیا "آپ قوموں میں تعاون چاہتے ہیں تاکہ تہذیب و تمدن تباہی سے بچ جائے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر تعاون کے لئے آزاد قوموں کا ہونا شرط ہے جو تعاون کرنے کے قابل ہوں۔ آپ مجھ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں امن و آشتی قائم کرنے میں مدد دوں اور جو چیزیں اس میں خلل انداز ہیں انھیں دور کروں۔ مگر مجھ میں اتنا مقدور بھی تو ہو۔ اس کی صورت بس یہی ہے کہ میرا

ملک اپنا کھویا ہوا حق واپس پائے۔ اس وقت تو خود اس آزادی کی تحریک کو، جو ہندوستان میں چل رہی ہے، امن کے دربار میں ہندوستان کی نذر سمجھ لیجیئے۔ کیونکہ جب تک ہندوستان ایک محکوم ملک ہے، صرف اسی کا وجود امن کے لیئے خطرناک نہیں بلکہ انگلستان کا وجود بھی جو ہندوستان کو لوٹ رہا ہے۔ اور قومیں چاہے انگلستان کی شہنشاہی کی پالیسی اور اس کا دوسری قوموں کو لوٹنا چپ چاپ دیکھتی ہوں مگر اسے پسند ہرگز نہیں کرتیں اور وہ اس میں دل سے مدد کریں گی کہ انگلستان کی بڑھتی ہوئی قوت کو، جو روز بروز خطرناک ہوتی جاتی ہے، روکیں۔ ظاہر ہے آپ یہ کہیں گے کہ کہیں ہندوستان آزاد ہو کر خود اپنے لیئے خطرناک نہ ہو جائے۔ لیکن ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ ہندوستان اپنے عدم تشدد کے اصول پر عمل کرے گا، کیونکہ ایک تو وہ آزاد اسی کے ذریعے سے ہوگا اور دوسرے اسے خود لوٹے جانے کے تلخ تجربے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

ہندوستان کے لیئے بے مثل موقع

"یہ اعتراض کہ میں ہمیشہ انقلاب کا نام لیا کرتا ہوں، ان الفاظ سے رفع ہو جاتا ہے جو میں قومی تحریک کے متعلق کہہ چکا ہوں۔ اس تحریک کے ساتھ ایک بڑی کڑی اور بے ڈھب شرط ہے۔ شاید آپ یہ کہیں کہ بے تشدد بغاوت نہ کبھی آج تک ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے خیر جو کچھ بھی ہو میرا تو یہی حوصلہ ہے کہ اس کی مثال پیش کر دوں۔ میں تو یہی خواب دیکھتا ہوں کہ میرا ملک عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرے۔ میں ساری دنیا کے سامنے بار بار یہ کہتا ہوں کہ اگر میرے ملک کی آزادی کی قیمت عدم تشدد کا ترک ہے تو میں یہ سودا کبھی نہیں کروں گا۔ میں نے عدم تشدد کا دامن اس مضبوطی سے

پکڑا ہے کہ مجھے جان دینا قبول ہے مگر اسے چھوڑنا قبول نہیں۔ میں نے یہاں حق کا نام اس لئے نہیں لیا کہ حق کے اظہار کا سوائے عدم تشدد کے اور کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ اس لئے اگر آپ قومیت کے اس تصور کو پسند کرتے ہیں تو میں بالکل حق بجانب ہوں۔"

بحث کے دوران میں معلوم ہوا کہ سر گلبرٹ کو جو اعتراض تھا وہ خود عدم تشدد کے اصول پر نہیں تھا بلکہ سنے سنائے واقعات کی بنا پر اس کے استعمال کے طریقوں پر تھا۔

جب وہ بائیکاٹ کا ذکر کر رہے تھے تو ان کے پیش نظر آئرستان کے کرنل بائیکاٹ کا واقعہ تھا جنہیں لوگوں نے اس قدر ستایا کہ ان کے مجبوراً خودکشی کر لی۔ یہاں سے کچھ ایسی باریک علمی بحث چھڑ گئی جس سے سننے والے کی طبیعت اکتا جائے۔ گاندھی جی نے آخر میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے "شاید آپ کا یہ کہنا صحیح ہو کہ مجھے اور زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیئے لیکن اگر آپ کو میرے بنیادی اصول پر اعتراض ہے تو پہلے مجھے قائل کر دیجئے۔ میں تو یہ عرض کرتا ہوں، کہ بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ مقاطعے[1] کو قومی تحریک سے کوئی تعلق ہی نہ ہو بلکہ یہ محض ایک اصلاحی عمل ہو۔ مثلاً ہم بغیر شدید قوم پرستی کے بھی یہ کر سکتے ہیں کہ باہر کا کپڑا نہ خریدیں بلکہ خود تیار کریں۔ ایک مصلح کے لئے ہمیشہ یہ ممکن نہیں کہ بہتر زمانے کا انتظار کرتا رہے۔ اگر وہ اپنے عقیدے کو عمل میں نہ لائے تو اسے مصلح کہنا ہی نہ چاہیئے۔ یا تو وہ عجلت کرے یا خوف اور کاہلی سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے۔ اب

---

[1] boycott.

وہ ایسا مقیاس کہاں سے لائے جس سے بالکل ٹھیک حد معلوم ہو جائے۔
انسان تو اتنا ہی کر سکتا ہے کہ ضبط النفس کی تربیت پائے ہوئے ضمیر کو
اپنا رہنما بنائے اور حق اور عدم تشدد کا زرہ بکتر لگا کر ہر طرح کی جوکھم اپنے
سر لے۔ ایک مصلح کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں۔"

اس کے بعد فوج کے متعلق اور اس قسم کے مسائل کے متعلق گفتگو ہوتی
رہی کہ ہندوستان اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کی قابلیت رکھتا ہے
یا نہیں۔ ان لوگوں نے متعدد سوالات کئے "کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ
ہندوستان خود مختار حکومت کا بھاری بوجھ اٹھانے سے ابھی کچھ دن
انتظار کرے؟ اگر ہم اپنے سپاہی ہندوستان بھیجتے ہیں تو ہم ان کی
جانوں کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں اس لئے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ
جلد سے جلد ہندوستانی فوج فراہم کر لیں؟" "پارسال مسلمانوں نے
یک زبان ہو کر یہ کہا تھا کہ ہم مرکزی ذمہ دار حکومت نہیں چاہتے۔ ایسی
صورت میں ہم آخر کیونکر فیصلہ کریں؟"

غلطی کرنے کی آزادی

ان سوالوں کا جواب گاندھی جی نے کم و
بیش ان الفاظ میں دیا۔ "مختصر یہ ہے کہ
آپ ہم پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے۔ خیر آپ ہمیں غلطیاں کرنے کی آزادی
تو دیجئے۔ اگر ہم آج اپنے ملکی معاملات کا انتظام نہیں کر سکتے تو اس کا
فیصلہ کرنے والا کون ہے کہ ہم کب اس قابل ہوں گے؟ مجھے یہ منظور نہیں
کہ آپ اس کی رفتار کا تعین کریں۔ جان بوجھ کر یا بے جانے آپ خدائی
کا منصب اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ
دم بھر کے لئے عرش سے نیچے اتر آئیے۔ ہم کو ہمارے ہی بھروسے پر

چھوڑ دیجئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو حالت آج ہے اس سے بدتر اور کیا ہو گی کہ خلقت کی خلقت ایک چھوٹی سی قوم کے آگے سجدے میں پڑی ہے۔

"اور یہ آپ کیا کہتے ہیں کہ آپ اپنے سپاہیوں کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں۔ فرض کیجئے میں تمام غیر ملکیوں میں یہ اعلان کر دوں کہ ہندوستان کی فوج میں بھرتی ہوں اور برطانوی قوم کے کچھ لوگ بھرتی ہونا چاہیں تو کیا آپ انہیں روک لیں گے؟ اگر وہ ہمارے یہاں آئیں گے تو ہم ان کی سلامتی کے اسی طرح سے ذمہ دار ہوں گے جس طرح اور کوئی قوم جس کے وہ نوکر ہوتے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ خود مختاری کی کنجی فوجی اختیار ہے۔

ہمارا میدان جنگ

"اب رہا متفقہ مطالبہ تو اس کے متعلق میں وہی کہوں گا جو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ جس کانفرنس میں حکومت کے آورد ے بھرے ہوں اس سے متفقہ مطالبے کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ میرا یہ دعوٰے ہے کہ کانگریس ہندوستانیوں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ برطانوی وزراء اسے جانتے ہیں۔ اور اگر وہ نہیں جانتے تو مجھے میرے ملک میں واپس جانے دیں تاکہ میں عام رائے کی بڑی سے بڑی قوت فراہم کر لوں۔

ہمیں اس کشمکش کا سامنا تھا جس پر ہماری موت اور زندگی منحصر تھی۔ ایک نہایت شریف انگریز نے ہمیں آزمایا اور کھوٹا نہیں پایا۔ اس لئے اس نے جیل خانوں کے دروازے کھول دیئے اور کانگریس والوں سے کہا کہ گول میز کانفرنس میں جاؤ۔"

ہمارے آپس میں بڑی طویل گفت و شنید ہوتی رہی جس کے دوران میں ہم نے بہت صبر سے کام لیا اور آخر ایک تصفیہ ہو گیا جس کی بنا پر کانگریس گول میز کانفرنس میں اپنا نمائندہ بھیجنے پر راضی ہو گئی۔
حکومت نے اس معاہدے کی پابندی کی جگہ اس کی شکست کا ثبوت دیا اور میں بہت کچھ تامل کے بعد یہاں آنے پر راضی ہوا کہ میں نے اس انگریز کو جو قول دیا ہے اسے پورا کروں۔ یہاں آ کر میں دیکھتا ہوں کہ جو قوتیں کانگریس کے اور ہندوستان کے خلاف صف آرا ہیں ان کا اندازہ میں نے غلط کیا تھا۔ مگر اس سے مجھے ذرا بھی ہراس نہیں۔ مجھے چاہیئے کہ واپس جاؤں اپنے ملک کی نمائندگی کی سند حاصل کروں اور قوم کے ساتھ تکلیفیں سہہ کر یہ ثابت کر دوں کہ ہمارا ملک جو مانگتا ہے وہ اس کی دلی خواہش ہے۔ ہٹلر نے کہا ہے کہ میدان جنگ میں کامیاب ہونا قوت حاصل کرنے کے لئے سب سے قریب کا راستہ ہے۔ ہو گا! میں نے اور ہی میدان میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جس میں لوگوں کو مغلوب کرنے کی جگہ دلوں پر اثر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اس بار کامیاب نہیں ہوا تو نہ سہی اب کی بار ضرور کامیاب ہوں گا۔"
اس بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گاندھی جی رخصت ہوئے تو ان میں اور ان حضرات میں پہلے سے زیادہ اتفاق رائے تھا اور اس میں تو ذرا بھی شبہہ نہیں کہ ایک دوسرے کے خیالات کو پہلے سے کہیں زیادہ سمجھنے لگے۔ گاندھی جی کا یہ رویہ کہ وہ اچھوتوں کے جداگانہ انتخاب کی نہایت سختی سے مخالفت کر رہے ہیں، لوگوں کے لئے ایک معمّا ہے اور ہر جلسے میں اس کا ذکر چھڑتا ہے۔ گاندھی جی

نے ہندوستانی طلبا کی مجلس میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ میں ذیل میں درج کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ میں نے وہ فقرے بھی شامل کر دیئے ہیں جو انھوں نے اس مسئلے کے متعلق دوسرے جلسوں میں کہے تھے۔

کیا اچھوت ہمیشہ اچھوت رہیں گے؟

"مسلمان اور سکھ اچھی طرح منظم ہیں۔ اچھوت منظم نہیں ہیں۔ ان میں بہت کم سیاسی بیداری ہے اور ان کے ساتھ اس قدر افسوسناک برتاؤ ہوتا ہے کہ خواہ وہ نہ بھی چاہیں مگر میں انھیں اس سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ اگر انھیں جداگانہ انتخاب کا حق مل گیا تو ان کی حالت گانوؤں میں جو کٹر ہندوؤں کے مرکز ہیں بہت زار ہو جائے گی۔ اعلیٰ یعنی اونچی ذات کے ہندوؤں کو اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے کہ انھوں نے صدیوں سے اچھوتوں کے ساتھ بے رخی برتی ہے۔"

"یہ کفارہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ عملی معاشرتی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اچھوتوں کی خدمت کر کے ان کی حالت سنواری جائے۔ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ان کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق طلب کیا جائے۔ انھیں یہ حق دینا گویا ان میں اور کٹر ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنا ہے۔ میں آپ سے عرض کر دوں کہ میں مسلمانوں اور سکھوں کے جداگانہ انتخاب کا محض اس حیثیت سے روادار ہو سکتا ہوں کہ یہ بری چیز ہے مگر ناگزیر ہے۔ اچھوتوں کے لئے تو یہ سراسر مہلک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھوتوں کے جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ہماری شیطانی حکومت کی عین ایجاد ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انھیں رائے دینے کا حق حاصل ہو اور دستور میں ان کے بنیادی حقوق محفوظ کر دیئے جائیں۔

اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو ان کے ساتھ بے انصافی ہو اور ان کے نمائندے کو لوگ خاص کرکے منتخب نہ ہونے دیں ان کے لئے خاص عدالت انتخابات مقرر ہونا چاہیئے جو ان کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرے اس عدالت کو یہ اختیار ہو کہ منتخب شدہ امیدوار کا انتخاب مسترد کردے اور اس شخص کو منتخب کرے جو بے انصافی سے اپنے حق سے محروم کیا گیا۔"

"اگر اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تو وہ قیامت تک غلامی میں رہیں گے۔ مسلمان تو جداگانہ انتخاب اس لئے چاہتے ہیں، کہ وہ ہمیشہ مسلمان رہیں گے۔ کیا آپ کو یہ منظور ہے کہ اچھوت بھی ہمیشہ اچھوت رہیں؟ کیونکہ جداگانہ انتخاب سے تو یہ کلنگ کا ٹیکہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس چھوت چھات کا خاتمہ کردیا جائے۔ یہ ہوگیا تو وہ ذلت اور رسوائی کا دھبّا جو خود دماغ اونچے طبقے کے ماتھے پہ لگا رکھا ہے مٹ جائے گا اور جب یہ دھبّا مٹ گیا تو پھر آپ جداگانہ انتخاب کا حق کیسے دیں گے۔ ذرا یورپ کی تاریخ کو دیکھئے۔ کیا مزدوروں کو یا عورتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق حاصل ہے؟ اگر کل بالغوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہوجائے تو اچھوتوں کے حقوق بالکل محفوظ ہوجائیں گے۔ خود کٹر ہندوؤں کو ان کے پاس ووٹ مانگنے کے لئے جانا پڑے گا۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو پھر ان کے نمائندے ڈاکٹر امبیڈکر ان کی طرف سے جداگانہ انتخاب پر کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ میں ڈاکٹر امبیڈکر کی عزت کرتا ہوں۔ انھیں ہر طرح حق ہے کہ ہم سے بیر رکھیں ان کا ضبط قابلِ تعریف ہے کہ وہ ہم لوگوں کے سر نہیں توڑ دیتے۔ اس وقت ان کا دل شبہہ سے

اس قدر معمور ہے کہ انھیں اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ وہ ہر ہندو کو اچھوتوں کا پکا مخالف سمجھتے ہیں اور یہ قدرتی بات ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ جنوبی افریقہ میں پیش آچکی ہے کہ میں جہاں کہیں جاتا تھا یورپی مجھے دھتکار دیتے تھے۔ ان کا غصہ بالکل بجا ہے۔ لیکن اس جداگانہ انتخاب سے جو وہ چاہتے ہیں، معاشرتی اصلاح نہیں ہوگی۔ چاہے خود انھیں جاہ و مراتب حاصل ہوجائیں مگر اچھوتوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا میں یہ باتیں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اس لئے کہ میں برسوں اچھوتوں کا رفیق اور ان کے دکھ سکھ کا شریک رہ چکا ہوں۔"

برطانیہ کا ورثہ

جلسہ طالب علموں کا تھا اور وہ طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے۔ ان میں بعض انگلستان کے ہندوستانی طالب علموں کے خاص رنگ میں تھے۔

ان میں سے ایک نے پوچھا "کیا آپ انگلستان کی نیک نیتی کے قائل ہیں؟"

اس کا جو جواب ملا وہ ان لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ گاندھی جی نے کہا "میں انگلستان کی نیک نیتی کا اسی حد تک قائل ہوں جس حد تک انسانی فطرت کی نیک نیتی کا قائل ہوں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی سعی کا ماحصل ہمیں گرانا نہیں بلکہ ہمیں اٹھانا ہے اور یہ محبت کے قانون کا نتیجہ ہے جس کا عمل غیر شعوری سہی مگر بالکل معیّن ہے۔ نسل انسانی کا باقی رہنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ربط پیدا کرنے والی قوتیں انتشار پیدا کرنے والی قوتوں سے بڑی ہیں، در مرکزی قوت برمرکزی قوت پر غالب ہے۔ چونکہ میری نظر میں محبت کی شاعری

چھائی ہوئی ہے اس لئے اگر میں انگریز قوم پر اعتماد رکھتا ہوں، تو آپ کو متعجب نہ ہونا چاہیئے۔ مجھے اکثر غصہ آتا ہے اور میں جل کر اپنے دل میں کہتا ہوں "آخر یہ ڈھونگ کب تک چلے گا؟ یہ لوگ دوسروں کو لوٹنے سے کب باز آئیں گے"۔ مگر میرا دل خود بخود جواب دیتا ہے:۔

"یہ وہ ورثہ ہے جو انھوں نے روما سے پایا ہے۔ مجھے یہ چاہیئے کہ محبت کے قانون پر چلوں اور اپنے دل میں یہ امید رکھوں کہ ایک نہ ایک دن، انگریزوں کے دل پر ضرور اثر ہوگا"۔

"ہندوستان میں صنعتی نظام قائم کرنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

صنعتی نظام

"مجھے اندیشہ ہے کہ صنعتی نظام تمام نوع انسانی کے لئے ایک عذاب ثابت ہوگا۔ ایک قوم کا دوسری قوم کو لوٹنا ہمیشہ چلنے والی چیز نہیں۔ صنعتی نظام سراسر اس پر مبنی ہے کہ آپ دوسری قوم کو تجارت کے ذریعے لوٹ سکیں، باہر کے بازار آپ کے لئے کھلے ہوں اور مقابلہ کرنے والے نہ ہوں۔ انگلستان کو یہ تینوں چیزیں حاصل تھیں مگر اب روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے یہاں بے روزگاروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے ورنہ ہندوستان کا مقاطعہ تو محض ایک ذراسی چیز تھی۔ ظاہر ہے کہ جب انگلستان کا یہ حال ہے تو ہندوستان کے سے وسیع ملک کا صنعتی نظام سے کیونکر بھلا ہو سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو جس دن ہندوستان نے دوسری قوموں کو لوٹنا شروع کیا (اور صنعتی نظام اختیار کرنے کے بعد اسے یہ کرنا ہی پڑے گا) اسی دن سے وہ دوسری قوموں کے لئے عذاب ہو جائے گا، دنیا کے لئے ایک بلا بن جائے گا۔ اور آخر اس کی ضرورت کیا ہے کہ دوسری قوموں کو لوٹنے کے لئے ہندوستان میں

صنعتی نظام رائج کیا جائے؟ آپ کو موجودہ صورت حال دیکھ کر عبرت نہیں ہوتی کہ ہم تو اپنے تیں کرور بے روزگاروں کے لئے کام فراہم کرسکتے ہیں مگر انگلستان کے تیس لاکھ بے روزگاروں کو کوئی کام نہیں ملتا اور اس ملک کے بہترین دماغ اس مشکل کو حل کرنے سے عاجز ہیں؟

صنعتی نظام کا انجام برا نظر آتا ہے۔ انگلستان کے کئی کامیاب حریف موجود ہیں یعنی امریکہ، جاپان، فرانس، جرمنی۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کے مٹھی بھر کارخانے کر رہے ہیں اور جس طرح ہندوستان میں بیداری پیدا ہو گئی ہے اسی طرح جنوبی افریقہ میں بھی پیدا ہو گئی ہے جہاں طبعی اور معدنی وسائل اور انسانی قوت ہندوستان سے بہت زیادہ ہے لمبے تڑنگے انگریز افریقہ کے قوی ہیکل باشندوں کے سامنے بونے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ انھیں دیکھیں تو کہیں کچھ بھی ہو یہ وحشی ہیں شاندار۔ وہ شاندار تو ضرور ہیں مگر وحشی ہرگز نہیں ہیں اور شاید چند سال میں مغربی قوموں کو معلوم ہو جائے گا کہ اب افریقہ ان کے فاضل مال کو کھپانے کا بازار نہیں رہا۔ جب مغرب میں صنعتی نظام کا انجام یہ ہونے والا ہے، تو ہندوستان میں تو اور بھی بری گت ہو گی؟"

"آئی، سی، ایس، کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

سول سروس والے	آئی، سی، ایس اصل میں ہندوستان کی سول سروس نہیں ہے بلکہ اسے ای، سی، ایس

یعنی انگلستان کی سول سروس کہیں تو بجا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سروس میں ہندوستانی بھی ہیں اس کے باوجود میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ جب تک ہندوستان محکوم ملک ہے وہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ

انگلستان کے فائدے کے لئے کام کریں۔ مگر فرض کیجئے کہ ہندوستان آزاد ہوجائے اور قابل انگریز ہندوستان کی ملازمت کرنے پر تیّار ہوجائیں تو اس صورت میں وہ بھی قوم کے سچے خادم ہوں گے۔ آج کل تو آئی، سی، ایس کہلانے کے باوجود وہ لوٹنے والی حکومت کی خدمت کررہے ہیں۔ جب ہندوستان آزاد ہوگا تو انگریز یا تو منچلے پن کے جوش میں ہندوستان آئیں گے یا اپنے گناہوں کے کفّارے کی غرض سے، خوشی سے چھوٹی تنخواہ پر کام کریں گے اور ہندوستان کی آب وہوا کی سختیاں جھیلیں گے، بجائے اس کے غریبوں کے سر پر بوجھ بن کر رہیں، حد سے زیادہ تنخواہ لیں، انگلستان کے سے ٹھاٹ سے زندگی بسر کریں بلکہ انگلستان کی سی آب وہوا بھی مہیّا کرلیں۔ ہم انھیں معزز رفیقوں کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں لیکن اگر ان کے دل میں کہیں اس بات کی چھپی چھپائی خواہش بھی ہوئی کہ ہم پر حکومت کا رُعب گانٹھیں اور ہم سے اس طرح پیش آئیں گویا ان کی نسل ہماری نسل سے برتر ہے تو وہ ہمیں معاف ہی رکھیں۔"

"کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگ کامل آزادی کے پوری طرح اہل ہیں؟"

ہندوستان اور سلطنت برطانیہ

"اگر ہم نہیں ہیں تو کوشش کریں گے کہ ہوجائیں لیکن یہاں اہل ہونے یا نہ ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے ہماری آزادی ہم سے چھین لی ہے وہ اسے واپس کردیں۔ اگر آپ کو اپنے طرز عمل پر ندامت ہے تو اس کے اظہار کا طریقہ یہی ہے کہ

آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔"

"مگر آخر مقبوضات کا مرتبہ کیا بُرا ہے؟ بات یہ ہے کہ مقبوضات کا مرتبہ ایک ایسی چیز ہے جسے انگریز سمجھتے ہیں۔ آپ شرکت کا نام لیتے ہیں انھیں نہیں معلوم کہ یہ شرکت کسے کہتے ہیں۔ مقبوضات کا مرتبہ قریب قریب وہی ہے جو آپ چاہتے ہیں اگر یہ آپ کو ملے تو آپ کیوں نہ قبول کرلیں جس طرح آئرستان والوں نے اپنی خوشی سے خودمختار ریاست کا مرتبہ قبول کرلیا۔ کیا آپ کی شرکت کوئی اس سے الگ چیز ہے؟"

"معاملہ میرے سامنے لے کر آئیے، مجھے یہ سمجھائیے کہ مقبوضات کے مرتبے میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں۔ اگر میں دیکھوں گا کہ جس حیثیت سے آپ اسے پیش کر رہے ہیں یہ وہی چیز ہے جو آزادی ہے تو میں فوراً قبول کرلوں گا۔ لیکن اس کا بارِ ثبوت میں انھیں لوگوں پر رکھتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ مقبوضات کا مرتبہ اور آزادی ایک چیز ہے۔"

ریلے کلب کے ممبروں سے نہایت ہی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ اس لئے کہ یہ وہ طالب علم ہیں جو مقبوضات سے آئے ہیں، سلطنت کے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سیاسی مسائل کا بہت غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کا جو سوال تھا وہ صاف اور موقع کا۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس گفتگو کا بہت سا حصہ نقل کردوں۔

"آپ ہندوستان کا قطع تعلق سلطنت سے کس حد تک چاہتے ہیں؟"

"سلطنت سے تو بالکل مگر برطانوی قوم سے بالکل نہیں اس لئے کہ میں ہندوستان کا نقصان نہیں چاہتا بلکہ اس کا بھلا چاہتا ہوں۔

برطانوی سلطنت صرف ہندوستان ہی کی بدولت سلطنت بنی ہوئی ہے اس شاہنشاہی کا تو خاتمہ ہونا چاہیئے لیکن یہ میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہمارا ملک برطانیہ کا برابر کا شریک، اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہو اور تمام مقبوضات کے ساتھ بھی برابری کی شرکت رکھے۔ البتہ شرط یہی ہے کہ شرکت بالکل برابری کی ہو۔"

"ہندوستان انگلستان کے دکھ میں کس حد تک شریک ہونے کو تیار ہے؟"

"پوری طرح سے"۔

"کیا آپ کے خیال میں ہندوستان اپنی قسمت مضبوط رشتوں سے انگلستان کے ساتھ وابستہ کر دے گا؟"

ہاں، اس وقت تک جب تک شرکت قائم رہے۔ لیکن اگر وہ دیکھے گا کہ یہ شرکت ایسی ہے جیسے ایک دیو اور بونے کی، یا اس سے فائدہ اٹھا کر انگلستان دنیا کی دوسری قوموں کو لوٹتا ہے تو وہ اسے فسخ کر دے گا۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا کی سب قوموں کا بھلا ہو۔ اگر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تو مجھے مدتوں انتظار کرنا منظور ہے مگر جھوٹا موٹا کی شرکت منظور نہیں۔"

"آپ کے نزدیک کسی قوم کو لوٹنے میں اور اس کے ساتھ تجارت کرنے میں کیا فرق ہے؟"

" اس کی دو شرطیں ہیں:۔

(۱) وہ قوم جس کے ساتھ ہم تجارت کریں خود ہماری چیزوں کی خواہشمند ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہم اس کی مرضی کے خلاف مال لے جا کر ڈال دیں۔

(۲) تجارت کی پشتی پر بحری فوج نہ ہو۔

اس موقع پر میں یہ کہوں تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اگر آپ کو اس ظلم کی خبر ہو جو انگلستان نے ہم ہندوستانیوں جیسی قوموں پر کیا ہے تو آپ یہ گیت فخر کے ساتھ نہ گائیں "برطانیہ سمندر کی موجوں پر راج کرتا ہے" جو چیزیں آج انگلستان کی درسی کتابوں میں فخر کے ساتھ لکھی جاتی ہیں ان پر آپ کو آگے چل کر شرم آئے گی۔ آپ اس پر ناز کرنے سے باز آئیں گے کہ ہم نے دوسری قوموں کو مغلوب یا ذلیل کیا!!

"برطانیہ کا جو رویہ فرقہ وارانہ مسئلے میں ہے وہ آپ کی راہ میں کہاں تک حائل ہے؟"

"بہت کچھ۔ یا یوں کہیے کہ آدھم آدھ۔ یہاں بھی، جان بوجھ کر یا بے جانے وہی طریقہ چل رہا ہے جو ہندوستان میں چلتا ہے یعنی آپس میں لڑا کر حکومت کرنا۔ برطانوی حکام کبھی ایک جماعت کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی دوسری کو۔ ظاہر ہے کہ اگر میں برطانوی حاکم ہوتا تو غالباً میں بھی یہی کرتا کہ دوسروں کی آپس کی نزاع سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت کو مضبوط کروں۔ ہمارا یہ قصور ہے کہ ہم بڑی آسانی سے اس دھوکے میں آجاتے ہیں۔

"کیا آپ کے خیال میں برطانیہ حکومت کو فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل تجویز کرنا چاہیے؟"

"ہرگز نہیں۔ لیکن اکیلا میں ہی ہوں جو یہ کہتا ہوں۔ یہ ہمارے لئے بڑی ذلت کی بات ہے اور اسے نہ کانگریس گوارا کر سکتی ہے نہ میں کر سکتا ہوں۔ میں نے قانونی عدالت کی تجویز پیش کی ہے۔ حکومت ہند اور صوبوں کی حکومتوں نے جو مراسلے بھیجے ہیں ان میں وہ ایک حد تک

اپنی رائے ظاہر کر چکی ہیں کہ حکومت کے تمام فیصلے اپنی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہیں۔ اب رہے ہم لوگ تو ہم میں ہر فریق انصاف پکارتا ہے مگر ثالثی سے کتراتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں سیاسی چالوں کو بہت کچھ دخل ہے اور سب ہی فریقوں کے معاملے میں حق و باطل دونوں ہیں۔ فرق صرف کم اور زیادہ کا ہے۔ قانونی عدالت پر اس معاملے میں یقیناً اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ سب کے مطالبات کو جانچ کر صحیح فیصلہ کر دے گی۔"

"کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عدالت کے ارکان کون کون لوگ ہونا چاہئیں؟"

"یا تو ہندوستانی ہائی کورٹوں کے غیر ہندو اور غیر مسلم جج ہوں یا پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے جج۔"

"کیا ان کے فیصلے کو لوگ قبول کر لیں گے؟"

"عدالت کے فیصلے میں قبول کرنے یا نہ کرنے کا کیا سوال ہے اور میں یہ بھی صاف کہے دیتا ہوں کہ اس تجویز میں ایک چال ہے اگر حکومت نیک نیتی سے کام لے اور میری تجویز قبول کر لے تو ساری فضا بدل جائے گی اور عدالت کے اجلاس سے پہلے ہی سب فریق مل کر اس مسئلے کو حل کر لیں گے کیونکہ جو گفت و شنید ہو چکی ہے اسی میں کافی مسالہ موجود ہے جس سے سیاسی ذوق رکھنے والوں کا اطمینان ہو سکتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے دعوے کی کمزوریاں خوب معلوم ہیں۔

ہم آکسفورڈ کے سفر سے بہت سے لوگوں کی خوشگوار یاد لے کر لوٹے۔ سب سے گہرا اور خوش گوار نقش ہمارے دل پر اپنے میزبانوں یعنی ڈاکٹر لنڈسے اور مسز لنڈسے کی شخصیت کا ہے۔ ایک دن گفتگو کے سلسلے میں کہیں گاندھی جی نے جنرل ڈائر کا اور اس گلی کا ذکر کر دیا جس میں لوگ پیٹ کے بل گھسٹنے پر مجبور کئے گئے تھے۔ سننے والے اس قدر ہمدرد تھے کہ اس واقعے کو سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جلسے کے ختم ہونے کے بعد مسز لنڈسے گاندھی جی کے پاس آئیں اور بہت دلکش انداز سے کہنے لگیں "مسٹر گاندھی اگر ہم پچاس بار پیٹ کے بل رینگیں تو کیا آپ کے خیال میں یہ کفارہ کافی ہوگا؟" گاندھی جی نے کہا "نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص بھی ایسا کرے میں یا آپ تو خوشی سے پچاس بار رینگ لیں گے۔ لیکن اگر میں انگلستان کی کسی لڑکی کو اس پر مجبور کرنا چاہوں پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ وہ میرے ایک ٹھوکر رسید کرے گی اور بہت بجا کرے گی۔ میں تو آپ کے سامنے صرف ان خوفناک واقعات کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا تھا۔ انگریزوں سے ہم بس یہی کفارہ چاہتے ہیں کہ وہ نوکر بن کر رہیں آقا بن کر نہ رہیں۔" صدر سیلیبل نے جمہوریت کے مسئلے کا مطالعہ کیا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا بھی ہے اس لئے قدرتی طور پر وہ آزاد ہندوستان کے مستقبل کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت سمجھتے ہیں اور انھیں اس کی بڑی فکر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی خوفناک حادثہ نہ ہونے پائے۔ لیکن اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آیا اور اس کی شکل وہی ہوئی جو گاندھی جی کی تحریکوں کی ہوا کرتی ہے، یعنی لوگوں نے محض اپنی ذات پر تکلیفیں

برداشت کیں تو یقیناً ڈاکٹر لنڈے کی ہمدردی سراسر ہماری طرف ہوگی۔
آنے والے زمانے کے متعلق باتیں کرنے کے بعد جب ہم سونے کے لئے لیٹے
تو انھوں نے اپنی بڑی بھاری الماری میں سے ایک کتاب نکالی۔ اور
مجھے یہ معرکے کے شعر پڑھ کر سنائے جو جان براؤن کی شان میں ہیں۔

"کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمانے کا سینہ تڑق جاتا ہے۔
کبھی ایک اندھا جوش سطح زمین کو شق کر دیتا ہے۔
کبھی ایک مورت کو جو مدتوں سے
قطب تارے کی طرح اپنی جگہ پر جمی ہوئی ہے۔
ایک اتھاہ قوت دم بھر میں اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔
اب اسے معاشرت کہئے یا خدا یا تقدیر۔
انسانی روح سمجھئے یا معاشی قانون۔
بہر حال یہ قوت دنیا میں موجود ہے اور کار فرما ہے۔
اور جب یہ قوت حرکت میں آتی ہے۔
تو سچ مچ کے سخت پتھر سے
سچ مچ کی دیواروں کو پاش پاش کر دیتی ہے۔
اور دنیا کے واقعات کا نقشہ بدل دیتی ہے۔
جان براؤن بھی ایک ایسا ہی پتھر تھا۔
پتھر کی طرح بے دلیل، پتھر کی طرح بے پناہ
مگر پتھر ہی کی طرح بہادر اور وفادار۔
اسے نہ جینا آتا تھا نہ جلانا آتا تھا۔
اس کے پاس بس ایک جسم تھا اور ایک نوکدار کٹیلا پتھر۔

مگر جان دینا اسے خوب آتا تھا"

ظاہر ہے کہ اگر صدر ہبلیل کے فلسفے میں جان براؤن جیسے شخص کی گنجائش ہے تو گاندھی جی کی ضرور گنجائش ہوگی جنھوں نے جان براؤن کے طرز عمل کی اصلاح کر کے اسے مکمل کر دیا ہے۔

پونا کے سرجن ایک دن کرنل میڈک جن کا حال گاندھی جی نے انگلستان پہنچتے ہی دریافت کیا تھا آ پہنچے اور اپنے گھر چلنے کے لئے جو ریڈنگ کے قریب واقع ہے اصرار کرنے لگے۔ انھوں نے کہا "میری بیوی نے بڑے خوب صورت پھول، پھل اور ترکاریاں فراہم کی ہیں۔ آپ کی خدمت میں پیش کریں گی۔ یہ اچھا تھا کہ ان کا گھر ریڈنگ سے بہت قریب تھا جہاں سے ہمیں اسٹین سے آکسفورڈ جاتے ہوئے گذرنا تھا اس لئے گاندھی جی نے ان کی دعوت منظور کر لی۔ گاندھی جی ان میاں بیوی سے سات برس کے بعد ملے۔ اور جانبین کو بڑی خوشی ہوئی۔ گاندھی جی نے احسان شناسی کی راہ سے کہا "اگر آپ کے شوہر نے ایسا اچھا اپریشن نہ کیا ہوتا تو آج میں دنیا میں نہ ہوتا کہ آپ کے سلام کو حاضر ہوں"۔ میں اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں کہ میں نے کرنل میڈک کی شام زندگی کا منظر دیکھا۔ وہ علمی تحقیقات کا کام اس مستعدی سے کر رہے ہیں جیسے کوئی بیس برس کا نوجوان ہو اور اس کے علاوہ بھی انھیں بہت سی چیزوں سے دلچسپی ہے اور ان میں منہمک رہتے ہیں۔ وہ باغبانی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں اور ان کا ایک خوبصورت باغ ہے جس میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے درخت ہیں اور وہ ان پر مختلف قسم کے تجربے

کیا کرتے ہیں۔

انھیں دودھ دہی تیار کرنے کا بھی شوق ہے اور اس تحقیقات کے ضمن میں کہ گائے کو دق ہونے کے کیا اسباب ہیں انھوں نے گھاس کی قسموں پر جو گائے کھاتی ہے، عجیب و غریب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے ان جراثیم کے متعلق بہت دن تک مسلسل تجربہ کیا جس سے بہتر ین مکھن پیدا ہوسکتا ہے اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی مگر یہ معلوم ہوا کہ اس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر بار کے کام کے لئے خود پیٹرول سے گیس تیار کررہے ہیں اور ہر وقت کام میں محو رہتے ہیں۔ مسز میڈک نے گاندھی جی کو دیکھتے ہی کہا تھا "مسٹر گاندھی آپ کی عمر اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی جتنی اس زمانے میں معلوم ہوتی تھی جب میں نے آپ کو پونا میں دیکھا تھا" سچ پوچھئے تو کرنل میڈک بھی اس زمانے سے زیادہ مُسن نہیں بلکہ اور کم سن معلوم ہوتے تھے کیونکہ اب وہ نوکری کے جھمیلے سے آزاد ہیں اور جن کاموں کا شوق ہے انھیں ایسا انجام دے سکتے ہیں۔ کاش اور لوگ بھی پنشن لینے کے بعد اپنے وقت کو کرنل میڈک کی طرح اس قدر مفید مشاغل میں صرف کرتے۔

پڑھایا ہوا سبق پڑھنے والی برطانوی قوم

مسٹر ہورابن اور کرشنا مینن نے ازراہ عنایت گاندھی جی کے اعزاز میں "کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ" کی طرف سے ایک صحبت منعقد کی۔ مسٹر ہورابن نے یہ یقین دلایا کہ یہ لیگ ہندوستان کے سوراج کے مطالبے کی بڑے جوش سے حمایت کرے گی اور گاندھی جی سے پوچھا کہ حمایت کا سب سے مفید طریقہ کیا ہے۔ گاندھی جی نے

انھیں صرف ایک ہی پیام دیا کہ ہندوستان کے متعلق سچی اور صحیح معلومات کی اشاعت کیجئے اور لوگوں کے دل سے وہ جھوٹی تاریخ محو کر دیجئے جس سے برطانیہ کی رائے عامہ ابتدا سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ اس کی مثال میں، کہ برطانیہ کے اخبارات خاص کر کے سچی خبریں چھپاتے اور جھوٹی خبریں پھیلاتے ہیں انھوں نے ایک طرف چاٹگام اور ہجلی کے وحشیانہ مظالم کا اور دوسری طرف مسٹر ولیرس اور مسٹر ڈرنو کے خلاف قاتلانہ حملوں کا ذکر کیا۔ چاٹگام اور ہجلی کے مظالم کا جن کی بدولت ہندوستان کا بوڑھا بیمار شاعر کنج عزلت سے نکل کھڑا ہوا اور اس کا دل نیکوں کے غصے سے معمور ہو گیا، برطانوی اخباروں میں محض سرسری طور پہ ذکراً کر رہ گیا لیکن یہ ثابت کرنے کے لئے انھوں نے سارا زور لگا دیا کہ نظر بند بڑے بدہیں وہی اس قسم کے حملے کرتے ہیں اور اسی قابل ہیں کہ انھیں گولی مار دی جائے۔ گاندھی جی نے کہا :۔

"اس میں شک نہیں کہ یہ حملے افسوسناک اور شرمناک ہیں میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ مجھے اس کی شکایت نہیں کہ انھیں اس قدر اہمیت دی گئی۔ لیکن اگر آپ انھیں اہم سمجھتے ہیں تو ان ہولناک مظالم کو کیوں نہیں سمجھتے تو چاٹگام اور ہجلی میں کئے گئے؟"

"یہ تو سبب اور نتیجے کا اٹل قانون ہے۔ یہ نوجوان بیچارے محض شبہہ پر، بغیر کسی تحقیقات کے غیر معیّن مدت کے لئے قید کئے جاتے ہیں۔ انھیں کچلنے اور دبانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جاتی۔ ان کے بعض دوست آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور انتقامی افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مجھ سے بڑھکر ان حرکتوں پر ملامت کرنے والا کوئی

نہیں۔ یوں تو مجھے دونوں طرف کے تشدّد سے نفرت ہے مگر خود غرضی کی بناء پر اپنی طرف کے تشدّد سے زیادہ ہے کیونکہ اس سے میرے کام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ لوگ کانگریسی نہیں ہیں مگر میں اسے کوئی عذر نہیں سمجھتا۔ بہر حال وہ ہندوستانی ہیں اور ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کو ان کی جد و جہد پر قابو نہیں ہے اور وہ انھیں اس مجنونانہ طرزِ عمل سے باز نہیں رکھ سکتی۔ لیکن معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے"

"ہندوستان جیسے وسیع براعظم میں تو تعجب اس بات پر کرنا چاہیئے کہ شورش پسندانہ جرم اس قدر کم ہوتے ہیں کیونکہ جیسے وحشیانہ مظالم چاٹگام اور ہجلی میں ہوئے اگر کسی اور ملک میں ہوتے، تو اس سرے سے اس سرے تک کھلم کھلا بغاوت ہو جاتی۔ میں چاہتا ہوں کہ اخبار پوری بات سچ سچ بیان کر دیا کریں مگر انھوں نے سازش کر رکھی ہے کہ کہیں تو خاموش رہیں گے اور کہیں واقعات کی غلط اور ناقص خبریں دیں گے"

اس اپیل کا اثر ہوا اور پادری بیلڈن صاحب نے یہ تحریک پیش کی کہ برطانوی اخباروں کو پورے واقعات صحت کے ساتھ بیان کرنے کی اہمیّت کا احساس دلایا جائے اور متنبّہ کر دیا جائے کہ اصلیّت کو چھپانا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے ساتھ سخت بدسلوکی ہے۔ پادری بیلڈن صاحب نے یہ تحریک پیش کرتے وقت بڑی پرجوش تقریر کی اور گاندھی جی کو یقین دلایا کہ اگر ہندوستان میں ستیاگرہ شروع ہوئی تو اس کے ساتھ انگلستان میں بھی ستیاگرہ ہوگی۔ رجعت پسند

اخباروں کے نمائندوں کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور انھوں نے احتجاج کیا کہ یہ تحریک برطانیہ کے اخباروں کے لئے توہین کا باعث ہے۔ ان میں سے ایک نے تو یہاں تک کہا کہ گاندھی جی خود ہمیں خبریں نہیں دیتے حالانکہ ہماری کمپنی اس کے لئے تیار تھی کہ ان کا ایک بولتا ہوا فلم تیار کرے! ان بزرگ نے اوروں کو گاندھی جی کے سامنے بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ گاندھی جی کے یہ الفاظ سن کر سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے :-

"جو صاحب ابھی تقریر کر چکے ہیں ان کی تجویز تو زیادہ تر تجارتی اغراض پر مبنی ہے۔ مگر اور حضرات کو میں ایک بڑا عمدہ موقع دیتا ہوں میں اس کے لئے تیار ہوں کہ چاٹگام اور ہجلی کے تمام واقعات بہت صحت اور اختصار کے ساتھ ان کے سامنے بیان کر دوں کیا وہ انھیں شایع کریں گے؟"

"ایک تحفہ اور حاضر ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں انھیں بغیر کسی معاوضے کے ہندوستان سے روز مرّہ کی خبریں لاسلکی کے ذریعے منگا کر دیتا ہوں، وہ ان خبروں کو چھاپیں گے؟۔ مجلس میں خاموشی چھاگئی اس کے بعد احتجاج کی کوئی آواز نہ اٹھی اور تجویز دو ایک مخالف رایوں کے ساتھ پاس ہو گئی۔"

دریائے کیم کے کنارے

جب ہم ایٹن جارہے تھے تو سب سے پہلا سوال گاندھی جی نے یہ کیا کہ یہ وہی مدرسہ تو نہیں جہاں جواہرلال پڑھتے تھے۔ میں نے کہا "جی نہیں وہ ایٹن نہیں بلکہ ہیرو ہے۔ اور میں مبالغہ نہیں کرتا کہ یہ معلوم ہونے کے بعد گاندھی جی کو ایٹن سے جو دلچسپی تھی وہ کم ہو گئی۔ اب ناظرین سمجھ جائیں گے کہ گاندھی جی کو کیمبرج جانے کا اس قدر اشتیاق کیوں تھا اس لئے کہ یہ جواہرلال اور چارلی اینڈریوز کا کیمبرج ہے۔ جب اینڈریوز صبح اٹھ کر ان کے سامنے ٹہلنے کو گئے تو وہ اصرار کر کے ٹرینٹی کالج کے وسیع احاطے سے گذرے، جہاں جواہرلال نے تعلیم پائی تھی۔ اب چاہے آپ اسے جذبات پرستی کہیں یا جو کچھ کہیں یہ چیز انسان کی فطرت میں ہے اور گاندھی جی پر بھی اس کا اتنا ہی اثر ہے جتنا اوروں پر۔ ٹرینٹی صرف جواہرلال کا ہی کالج نہیں ہے بلکہ ٹینیسن اور بیکن اور نیوٹن کا بھی ہے مگر اسے جواہرلال سے تعلق نہ ہوتا تو شاید ہم ادھر کا رُخ بھی نہ کرتے۔ چنانچہ ہم جانتے تھے کہ کرائسٹ چرچ ورڈسورتھ کا کالج ہے مگر ہم نے وہاں جھانکا تک نہیں اسی طرح پیمبروک ہماری نظروں میں خصوصیت کے ساتھ چارلی اینڈریوز کا کالج ہے اگرچہ گرے اور اسپینسر جیسے شاعر بھی یہیں کے تھے۔ جب آکسفورڈ میں ۱۸۶۲ء میں پہلا کالج قائم ہوا تو کیمبرج کی رگ حمیت جوش میں آئی اور بیلیل اور مرٹن کے قائم ہونے کے چند ہی سال بعد کیمبرج میں

پیٹر ہاؤس کی بنیاد پڑی ۔ تب سے اب تک اتنی صدیاں گذر گئیں مگر یہ مفید مقابلہ برابر چلا آتا ہے اور دونوں اپنے قابل فرزندوں پر یکساں فخر کر سکتے ہیں۔ اگر کیمبرج میں کالج آکسفورڈ سے کم ہیں، تو طالب علم زیادہ ہیں اور اگر آکسفورڈ میں ٹیمس کے خوشنما کنارے ہیں تو کیمبرج میں کالجوں کے پشت کے چمن ہیں جن میں سے دریائے کیم لہراتا ہوا گذرتا ہے اور اس کی بدولت یہ پشت کے احاطے کیمبرج میں سب سے حسین منظر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سب کالج ابتدا میں مذہبی حیثیت رکھتے تھے اور یہ اس حد تک اب بھی باقی ہے کہ ہر کالج میں ایک عبادتگاہ موجود ہے۔ کنگ کالج کی عبادت گاہ جو ہنری ششم نے پندرھویں صدی میں بنوائی تھی فن تعمیر کا وہ نادر نمونہ ہے کہ جو لوگ انگلستان میں وارد ہوتے ہیں وہ خاص طور پر اسے دیکھنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ اسی عبادتگاہ سے متاثر ہو کر گرے نے اپنے مرثیے میں وہ مشہور شعر کہے جس کا مضمون یہ ہے :-

"جہاں مناجات کی گھنٹیوں کی سُریلی آواز،
بغلی نشست گاہوں کے طولانی سلسلے،
اور کٹاؤ کی محرابی چھت کی بھول بھلیاں میں گونجتی
نغمۂ حمد کے سُروں کا پاٹ بڑھاتی ہے"

اس کی کھڑکیوں کے متعلق جن کے دو دصیاشیشوں پر مسیح کی زندگی کے واقعات منقوش ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان سے بہتر بڑے پیمانے کی شیشے پر بنی ہوئی تصویریں دنیا میں کہیں نہیں ہیں اور ان کے میر عمارت اور معمار خود اس کالج کے فیلو تھے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ورڈسورتھ نے جس

کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی تھی اور جس نے اس عبادت گاہ میں بارہا عبادت کی ہوگی اس کی شان میں ایسا معرکے کا قطعہ کہا جس کی شیرینی کا مقابلہ اگر کر سکتا ہے تو وہی نغمہ جس کی اس میں تعریف ہے :۔

"اس دلی بادشاہ کو فضول خرچی کا طعنہ نہ دو،
اس میر عمارت پر بے اصولی کا الزام نہ رکھو،
جس نے مٹھی بھر سفید عبا والے طالب علموں کے لئے
یہ بے نظیر عالی شان عمارت بنائی ہے،
'خدا کی راہ میں سب کچھ دے ڈالو، جو کم و بیش کو تولے
اُس کا تحفہ اُس بارگاہ سے رد ہو جاتا ہے'
یہ تھا دل میں اس شخص کے جس نے ہماری نظروں کے لئے
یہ اونچے ستون تراشے، یہ شاخ در شاخ چھت بنائی
جو آپ اپنے سہارے قائم ہے اور ہزاروں حجروں پر سایہ کئے ہے،
جن میں روشنی اور تاریکی کا جال بچھا ہے
اور نغمے کی آواز دیر تک گونجتی رہتی ہے۔
گویا اس کا جی مرنے کو نہیں چاہتا
ان خیالوں کی طرح جن کی دلکشی خود اس کا ثبوت ہے،
کہ وہ حیات ابدی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔"

ہمارے دلوں کو نلندا، ٹکشا شیلا، پاٹلی پترا اور کاشی کی یاد ستانے لگی اور جب گاندھی جی سے کسی نے ہندوستان کی آئندہ تعلیم کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے حسرتناک لہجے میں نئے زمانہ کے سفید ہاتھیوں کا ذکر کر دیا جو بنگلور اور بمبئی میں کھڑے ہیں۔

آکسفورڈ کے پروفیسر تو اس الجھن میں تھے کہ کانگریس کا ہندوستان کی نمائندگی کا دعوے کس حد تک بجا ہے اور کیمبرج والوں کو اس کی فکر تھی کہ کہیں ہندوستان ناعاقبت اندیشی سے انگلستان اور سلطنت برطانیہ سے قطع تعلق نہ کرلے۔ وہ کہتے تھے آپ کامل آزادی کا نام لے کر انگلستان کو کیوں بھڑکاتے ہیں؟ کیا ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت سے نقصان ہی نقصان ہوا ہے؟ دیکھئے چین کی قومی حکومت کا کیا انجام ہوا۔ کیا ہندوستان انگریزوں کے ماتحت رہ کر چین سے جو خود مختار ہے بدرجہا بہتر حالت میں نہیں ہے؟ اگر برطانوی سپاہی غیر برطانوی حکومت کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے تو آپ ان کی خاطر ایک دور تغیر کو کیوں نہیں قبول کرلیتے؟ کیا صورت حال اس قدر نازک ہے کہ اگر ہندوستان کو کامل اختیارات نہ ملیں تو وہ لاکھوں جانیں قربان کردے؟ وغیرہ وغیرہ صدر کیمبرج کے گھر پر یونیورسٹی کی چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے کہ ہندوستان کے معاملے کو گاندھی جی سے سمجھیں اور یہ معلوم کریں کہ ان کے لئے کس حد تک مدد کرنے کا موقع ہے۔ اس جلسے میں اس پائے کے پروفیسر موجود تھے جیسے ائیس بارکر جن کی تحقیق عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کی سیاسیات کے متعلق مشہور ہے۔ اس مرتبے کے فاضل جیسے لوالیس ڈکنسن جن کے متعلق ہم ہندوستانی بھی جانتے ہیں کہ انھوں نے مسئلہ مشرق کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مخالفین جنگ کے عقیدے کی طرف مائل ہیں اور اس فضل و کمال کے عالم دینیات جیسے ڈاکٹر جان مرے اور ڈاکٹر بیکر۔ ان حضرات کے علاوہ ہیڈ اسپیکر کی طرف سے مسٹر ایولن تو تشریف لائے تھے کہ کوئی ایسی صورت نکالیں جو انگلستان اور ہندوستان

دونوں کے لئے قابل قبول ہو اور ان دونوں میں جنگ کی نوبت نہ آئے۔
مجھے ان حضرات کے علم و فضل، ان کی وسعت نظر اور سب سے بڑھ کر ان کی پُر خلوص خواہش کا کہ معاملات کو سمجھیں اور مدد کریں پورا پورا اعتراف ہے مگر افسوس ہے کہ نہ آکسفورڈ میں اور نہ کیمبرج میں کسی بزرگ کو سر کیمبیل بینرمین کے اس زبردست قول کی حقیقت کا احساس ہے کہ "اچھی حکومت اپنی حکومت کا بدل نہیں ہو سکتی"۔ وہ اس مسئلے پر اخلاقیات کے فلسفۂ عدل کے، مصلحت کے تمام پہلوؤں سے غور کرتے ہیں مگر یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مذکورہ بالا بنیادی حقیقت پر ان تمام بحثوں کا دارومدار ہے۔ اب میں اس گفتگو کا خلاصہ درج کرتا ہوں جو گاندھی جی نے ان تمام سوالوں کے جواب میں کی تھی۔

آزاد ہندوستان اور شرکت

"شرکت برابر کی ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ شاندار الفاظ کے پردے میں وہی محکومی چھپی ہو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان اور انگلستان میں تعلق تو رہے مگر اس کی نوعیت بالکل بدل جائے۔ ان دونوں کا تعلق سراسر نوعِ انسانی کے بھلے کے لئے ہو۔ ہندوستان خود اس قابل نہیں ہے کہ دنیا کی اور قوموں کو لوٹ سکے مگر برطانیہ کی مدد سے اس کے لئے ایسا کرنے کا امکان ہے۔ لہٰذا ان دونوں کی شرکت میں یہ شرط ہونا چاہیئے کہ یہ تجارتی لوٹ بالکل موقوف ہو جائے اور اگر انگلستان اس سے باز نہ آئے تو ہندوستان اس سے قطع تعلق کرلے۔ ضرورت محض اس کی ہے کہ برطانیہ کی تجارت میں لوٹنے کی پالیسی سرے سے بدل جائے۔ اس کے بعد برطانیہ کبھی اس بات کو فخر کے ساتھ نہ کہے گا کہ اس کی

بحری فوج اس قدر قوی ہے اور تمام سمندر کے راستوں اور سمندر پار کی تجارت کی حفاظت کرتی ہے۔"

"آپ جنوبی افریقہ کو لیجئے۔ میں برطانیہ کے ساتھ شرکت کو تو اس امر پر مشروط نہیں کروں گا کہ اس کے تعلقات جنوبی افریقہ کے ساتھ بدل جائیں مگر اپنی طرف سے یہ کوشش ضرور کروں گا کہ جنوبی افریقہ کی ان نسلوں کو آزاد کراؤں جن کے متعلق میں اپنے تجربے سے یہ جانتا ہوں کہ تجارتی لوٹ انھیں پیسے ڈالتی ہے۔ ہماری مخلصی ایسی ہونا چاہیئے جس میں ان کی بھی مخلصی ہو اگر یہ نہ ہو سکے تو مجھے برطانیہ کے ساتھ شرکت کرنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو گی۔ چاہے اس میں ہندوستان کا فائدہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں اپنی ذات سے یہ کہتا ہوں کہ یہ شرکت جو دنیا کے لئے تجارتی لوٹ سے آزادی کا پیام لائے گی میری قوم کے لئے باعث فخر ہو گی اور میں چاہوں گا کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے۔ مگر ہندوستان تجارتی لوٹ کی پالیسی کو کسی صورت سے گوارا نہیں کر سکتا اور میں تو اس خیال کا آدمی ہوں کہ اگر کانگریس شاہنشاہی کی پالیسی اختیار کرے تو میں کانگریس سے بھی قطع تعلق کر لوں۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ کیا کانگریس کم سے کم عارضی طور پر وہ مرتبہ بھی قبول نہ کرے گی جو جنوبی افریقہ یا کناڈا کو حاصل ہے؟ میں جانتا ہوں کہ اس کے جواب میں "ہاں" کہنا بہت خطرناک ہے۔ اگر آپ کی مراد اس سے کوئی ایسا مرتبہ ہے جس سے بہتر اور برتر مرتبہ بھی تصور میں آسکتا ہے اور ایک کو حاصل کرنے کے بعد ہمیں دوسرے کے لئے کوشش کرنا ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ "ہرگز نہیں"۔ لیکن اگر یہ وہ

مرتبہ ہے جس سے زیادہ ہم چاہتے ہی نہیں تو میں ہاں کہنے کو تیار ہوں۔ میں تو وہ مرتبہ چاہتا ہوں جو معمولی آدمی کی نظر میں بھی موجودہ حالت سے سراسر مختلف ہو اور اس دور تغیر کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا جس میں ہمیں اپنے اعلیٰ مقصد سے کم پر قناعت کرنا پڑے۔

"اب رہا رنبیوں کا معاملہ۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ کامل" آزادی نہیں چاہتے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ نہیں چاہتے اس لئے کہ وہ برطانوی حکومت کے بڑھائے ہوئے طوطے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ جب تک برطانیہ کی تلوار کا سایہ نہ ہو ان کی زندگی محال ہے۔ مگر میں تو کامل فوجی اختیارات سے کم پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ملک کے سارے لیڈر مل کر فوج کے مسئلے میں کسی درمیانی صورت کو قبول کرلیں تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ خود الگ رہوں مگر اس کی مخالفت نہ کروں اور قوم کو تکلیفیں سہنے کی دعوت نہ دوں۔ اگر ہم اتنی دور آگے بڑھ سکیں کہ وہاں سے آگے چل کر منزل مقصود تک پہنچنا سہل ہو جائے تو میں اسے قبول تو نہ کروں گا مگر خاموش ہو جاؤں گا۔"

"لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ برطانوی فوجیں قومی حکومت کی ملازمت کرنے پر ہرگز راضی نہیں ہوں گی تو یہ تو میرے نزدیک برطانیہ کے ساتھ تعلق نہ رکھنے کے خلاف بڑا سخت اعتراض ہے۔ ہم تجربی فوج ہرگز نہیں چاہتے اس کے ہرگز روادار نہیں ہو سکتے۔ فوج میں رفتہ رفتہ ہندوستانی عنصر بڑھانے کی تجویز سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ آخر وقت تک اعلیٰ افسر انگریز رہیں گے اور جو اعتراض آج ہوتا ہے کہ ہم میں پورے اختیارات برتنے کی قابلیت نہیں وہ اس وقت بھی

ہوگا۔ حقیقی ذمہ دار حکومت اس وقت قائم ہو سکتی ہے جب برطانیہ والے
ہندوستان کی نیت اور قابلیت پر بھروسا کر سکیں۔ ابتری کے دور ہونے
کی صرف یہی صورت ہے کہ برطانیہ کو دل سے احساس ہو کہ ہم نے
ہندوستان کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور اب اس کی تلافی کے لئے
برطانوی فوجوں کو ہندوستانی وزیروں کے ماتحت رکھنا چاہیئے۔ آپ
کو یہ خوف ہے کہ کہیں ہندوستانی وزیر حماقت کے احکام دے کر برطانوی
سپاہیوں کو نہ کٹوا دیں۔ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ جنگ بوئر کے
دوران میں ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب انگلستان میں برطانوی جنرل
گدھے اور برطانوی سپاہی سورما کہلاتے تھے۔ اگر برطانوی جنرلوں سے
غلطی ہو سکتی ہے تو ہندوستانی وزیروں سے بھی ہو سکتی ہے۔ یقیناً
ہندوستانی وزیر ہر معاملے میں کمانڈر انچیف اور دوسرے فوجی ماہرین فن
سے مشورہ کریں گے لیکن اعلےٰ اختیار اور آخری ذمہ داری وزیروں
ہی کی ہوگی۔ کمانڈر انچیف یا تو ان کا حکم مانے گا یا استعفا دیدے گا۔"
"آپ میری زبان سے یہ سُن کر چونک پڑتے ہیں کہ ہم آزادی کی
قیمت اپنے خون سے ادا کریں گے۔ میرا دعوےٰ ہے کہ میں ہندوستان
کی حالت کو خوب جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان سسک
سسک کر جان دے رہا ہے۔ لگان جو وصول کیا جاتا ہے حقیقت
میں وہ نوالے ہیں جو کسانوں کے بچوں کے مُنہ سے چھینے جاتے ہیں۔
کسان جو مصیبت اٹھا رہا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اس حالت
کو سُدھارنے کی تدبیر دورِ تغیّر نہیں ہے۔ آخر برطانوی حکومت کا دورِ
تغیّر سے کیا مطلب ہے؟ وہی جو میرا ہے؟ کیا وہ برطانوی سپاہیوں

کو ہماری مدد کے لئے یعنی ہمارے مقاصد کی حفاظت کے لئے رکھے گی؟
اگر ایسا ہے تو ہم انھیں خوشی سے رکھیں گے اور اپنی مقدرت کے مطابق تنخواہ دیں گے۔ لیکن اگر آپ کا ایما ندارہی سے یہ خیال ہے کہ ہم میں قابلیت نہیں ہے اور برطانیہ اپنی نگرانی نہیں ہٹائے گا تو ہم انشاءاللہ مصیبت کی آگ میں تپ کر دکھا دیں گے۔ میں نے دوسروں کے خون کے دریا بہانے کا نام نہیں لیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تشدد کی حمایت کرنے والی جماعت کم ہوتی جاتی ہے مگر میں نے اپنے لوگوں کے خون کی گنگا بہنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ اپنی خوشی سے قربانی کرنے کا پاک عمل ہے جو ہم اپنے مقصد کے حصول کے لئے انجام دینا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ تزکیہ نفس بہت اچھا ہے اگر بغیر اس کے کام نہ چلتا ہو۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کا جس قدر خوف آپ کو ہے اس حد تک کبھی نہیں ہو گا۔ ہندوستان کے نوّے فی صدی باشندے دیہات میں رہتے ہیں اور یہ جھگڑے اس دس فی صدی آبادی تک محدود ہیں جو شہروں میں ہے۔ میرے نزدیک تو جو ذلت کی موت ہم آج کل مرتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ خونریزی کوئی چیز نہیں۔ یہ میں اس حالت کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں کہ ہندوستان تسخیری فوج اور دنیا کی سب سے مہنگی سول سروس کے بے شمار مصارف ادا کرنے کی وجہ سے فاقوں مر رہا ہے۔ جاپان تک جو سر سے پیر تک مسلح ہے اپنی فوج پر اتنا صرف نہیں کرتا جتنا ہم کرتے ہیں۔"

"مجھے آپ سے بس یہی شکایت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر سچا انگریز ہندوستان کی آزادی چاہتا ہے مگر رونا اس کا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں،

جس دن انگریزوں کی فوج ہٹ جائے گی اسی دن حملے شروع ہو جائیں گے اور خانہ جنگی ہونے لگے گی۔ اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ ان اندرونی جھگڑوں کا سبب خود انگریزوں کی موجودگی ہے۔ کیونکہ آپ کی قوم آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کے اصول پر عمل کرتی رہی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ چونکہ آپ کی نیت نیک ہے اس لئے آپ کی چکی میں پسنے سے غریب ہندوستانی کو تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ تو فطری چیز ہے کیونکر نہ ہوگی۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ آپ ہندوستان میں ہماری فرمائش سے رہتے ہوں۔ یہ اچھی طرح جان لیجئے کہ سارے ملک میں ناراضی اور بے چینی ہے اور ہر شخص کہتا ہے "ہم غیر ملکیوں کی حکومت نہیں چاہتے"۔ اور آپ کو اتنی زیادہ فکر کیوں ہے کہ آپ کے بغیر ہمارا کیا انجام ہوگا؟ ذرا برطانوی عہد سے پہلے کے ہندوستان پر نظر ڈالیئے۔ تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس زمانے میں ہندو مسلمانوں کی لڑائیاں آج کل سے زیادہ ہوتی ہوں۔ سچ پوچھئے تو ہمارا زمانہ اس لحاظ سے بہت بدتر ہے۔ بات یہ ہے کہ انگریزوں کا ہاتھ باوجود اتنا قوی ہونے کے کہ گنہگار اور بے گناہ سب کو سزا دیتا ہے ان فسادات کو روکنے میں بے بس ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کہیں فساد نہیں ہوتا تھا۔ اب رہے حملے تو سخت سے سخت حملے سے بھی گاؤں محفوظ رہتے تھے۔ ان کی کیفیت یہ تھی جیسے کبھی کبھی طاعون آیا کرتا ہے۔ اگر اس طاعون سے بچنے کے لئے جو شاید قدرت کی طرف سے ایک طرح کی صفائی ہو ہمیں ڈاکٹروں کی فوج رکھنا پڑے اور انھیں تنخواہ دیتے دیتے ہم فاقوں مرجائیں تو ہمارے نزدیک تو وہ صفائی ہزار درجے بہتر ہے۔ مثلاً کبھی کبھی شیر آبادی میں آکر حملہ کرتا ہے تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرکے قتلے

بنائیں یا یہ کہ شیر سے لڑیں اور اس کی جوکھم کو سہہ لیں۔ معاف کیجئے ہماری قوم اب ایسی بزدل بھی نہیں کہ ہمیشہ خطرے کے نام سے بھاگے غیر ملکوں کی سنگینوں کے سہارے جینے سے تو یہی اچھا ہے کہ ہم صفحہ ہستی سے ہٹ جائیں۔ نہیں صاحب، آپ کو ہم پر بھروسا کرنا چاہیئے کہ اپنے آپس کے جھگڑے نبٹا لیں گے اور حملہ کرنے والوں سے نبٹ لیں گے۔

ہندوستان ایسے بہت سے حملوں سے بچ نکلا ہے اور اس کی تہذیب اس شان سے قائم رہی ہے کہ دنیا کی کوئی تہذیب اس سے بڑھنے نہ پائی وہ اس کا محتاج نہیں کہ آپ اس پر ترس کھائیں اور اسے روئی میں لپیٹ کر رکھیں۔"

میں نے ان چند جملوں میں گھنٹوں کی گفتگو کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اور بھی بہت سے سوالات کئے گئے تھے مگر میں نے صرف اصل بحث کا ذکر کیا ہے۔ یہ حضرات ازراہ عنایت ساری گفتگو صبر سے سنتے رہے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم ابھی اس کے متعلق اور باتیں کریں گے تاکہ کوئی ایسا حل سمجھ میں آئے جو برطانوی وزیروں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

آکسفورڈ کی طرح یہاں بھی لوگ بڑی مہربانی اور ہمدردی سے پیش آئے اور معاملات کو سمجھ کر مدد کرنے کی خواہش ہر شخص کے دل پر غالب تھی۔ میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی کہ ہندوستان مقبوضات کی حیثیت قبول کرنے یعنی مادر سلطنت کی دختر بننے پر تیار ہے یا نہیں۔ بعض دوستوں نے کہا کہ ہندوستان کو مقبوضات کا مرتبہ منظور کر لینا چاہیئے۔ مسز ہچینسن بولیں "ہندوستان کا معاملہ کناڈا یا جنوبی افریقہ جیسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیا ہم نے کبھی اس کے ساتھ

'مادرانہ' سلوک کیا ہے؟ مقبوضات سے ہمارا فطری رشتہ ہے۔ انھیں مادر وطن کے فرزندوں نے بسایا ہے۔ ہندوستان کو ہم اس طرح کی نوآبادی کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ رشتہ کیسے قائم کر سکتے ہیں؟"
گاندھی جی نے شکر گزاری کے لہجے میں کہا "مسز ہچینن آپ نے گُر کی بات کہی۔"

"ہندوستانی مجلس" میں سچ پوچھئے تو معقول سوال ہندوستانی طلبہ نے نہیں بلکہ انگریز طلبہ نے کئے۔ ناواقفیت کے اعتراضات دونوں کی طرف سے ہوئے۔ اقلیتوں کا مسئلہ چھڑا۔ اور گاندھی جی نے اس کے متعلق یہ موثر الفاظ کہے:۔

"آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اور سکھ جماعت کی عقل ماری گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں آج بڑی جماعت کا نمائندہ ہو کر نہ آتا۔ حماقت ساری ہمیں لوگوں کے حصّے میں آئی ہے جو یہاں موجود ہیں۔" جب گاندھی جی نے اس آخری فقرے کو سمجھایا تو لڑکے ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئے۔ "ہم لوگوں سے مطلب یہ مجلس نہیں۔ بلکہ گول میز کانفرنس کے ہندوستانی ڈیلیگیٹ جن میں مَیں بھی شامل ہوں" ایک انگریز لڑکے نے ناواقفیت کی بناء پر پوچھا "گاؤں کے بے روزگار یہ کیوں نہیں کرتے کہ شہروں میں جاکر کسی صنعتی کارخانے میں کام کریں؟" اس کا یہ ظریفانہ جواب ملا:۔ "یہ تدبیر تو شاہی زرعی کمیشن کو بھی نہیں سوجھی۔"

لیکن ان قہقہوں میں اصل پیام گم نہیں ہونے پایا اور گاندھی جی نے انھیں بہت تفصیل سے بتایا کہ "برطانوی حکومت میں ایک قوم

کی قوم کس طرح باضابطہ سائنس کے طریقوں سے جھلس دی گئی" اس جلسے میں ایک انگریز تھا جو فوج میں ملازمت کرنا چاہتا تھا اور پندرہ دن کے اندر ہندوستان جانے والا تھا۔ اس نے پوچھا "مہربانی کر کے یہ فرمایئے کہ ایک انگریز جو ہندوستان جا رہا ہو ہندوستانیوں کے ساتھ تعاون اور ہندوستان کی خدمت کس طرح کرے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا "سب سے پہلے تو یہ کرے کہ چارلی اینڈریوز سے مل کر پوچھے کہ آپ نے ہندوستان کے لئے کیا کیا اور اس کی خاطر کیا کیا مصیبتیں جھیلیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہندوستان کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے اور وہ کام کیا ہے جو کئی ہزار انگریز مل کر کرتے۔ اس لئے اس انگریز کو پہلا سبق ان سے لینا چاہیئے۔ اس کے بعد اسے معلومات بہم پہونچانا چاہیئے، تعلیم دینے کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کی خدمت کرنے کے لئے اور اگر وہ اس نیت سے کام شروع کرے گا تو لوگ اس سے خود بخود تعلیم حاصل کریں گے۔ لیکن اس کام میں اسے اپنے آپ کو مٹا دینا اور اپنی ذات کو ہندوستانیوں میں کھپا دینا پڑے گا جیسا مسٹر اسٹوکس نے شملے کی پہاڑیوں میں کیا ہے۔ سب انگریزوں کو یہی کرنا چاہیئے۔ سچی محبت کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ جن لوگوں کے دل میں ہندوستان کی محبت کا جوش ہے وہ وہاں ضرور جائیں ان کی وہاں ضرورت ہے۔"

اقلیتیں فرینڈس یا کویکر[1] جماعت جس نے سب سے پہلے گاندھی جی کا استقبال اپنے مکان میں کیا تھا۔ ہماری ہر طرح

---

[1] عیسائیوں کا ایک فرقہ۔

سے مدد کرتی رہی ہے۔ ایک بار ان لوگوں نے یہ تجویز کی کہ ایک وفد ہندوستان بھیجیں اور اس کے ارکان مقاصد اور طریق کار کے متعلق بہت تفصیل سے گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے گاندھی جی سے مل کر ہندوستان کی صورت حال کے متعلق بہت سے دلچسپ سوال کیے۔ میں یہ سب سوال اور جواب یہاں نقل نہیں کروں گا لیکن ان گرم الفاظ کو لکھے بغیر نہیں رہ سکتا جن میں گاندھی جی نے اس ریا کاری اور الٹ فریبی کا پردہ چاک کیا کہ اقلیتوں کا مسئلہ دستور کے مسئلے کے طے ہونے میں حائل ہے۔ انھوں نے کہا "میں نے کانفرنس کو حکومت کے آوردوں کی جماعت جان بوجھ کر کہا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں کہ اس کانفرنس کو منعقد کرنے کے لئے کیسی کیسی بری حرکتیں کی گئیں، کیا کیا ریشہ دوانیاں ہوئیں۔ فرض کیجیے ہم سے کہا جاتا، کہ مہاسبھا کے یا مسلمانوں کے یا اچھوتوں کے نمائندے منتخب کرکے بھیجو تو یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے کانگریس کے خیال کے لوگ بھیجے جاتے۔ کیا کانگریس اسے گوارا کرتی کہ ریاست کی رعایا کے حقوق بیچ ڈالے جائیں؟ رئیسوں کا یہ دعوے کہ وہ اپنی رعایا کے بھی نمائندے ہیں بے بنیاد ہے۔ یہ کانفرنس کا بہت بڑا نقص ہے کہ رئیسوں کو دو حیثیتوں سے دعوت دی گئی۔ ہندوستان میں ریاستوں کی رعایا کی کانفرنس موجود ہے اور اس معاملے میں ایک آفت برپا کردیتی مگر میں نے اسے سمجھا بجھا کر روکا۔"

"میں نے آپ کو وہ بات بتادی جو میرے دل میں کھٹک رہی ہے۔ آپ کانگریس پر اتنا بھروسا کرسکتے ہیں کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کو ہرگز

بیچ نہیں سکتی۔"

"اچھوتوں کے متعلق میرا دعوےٰ ہے کہ جتنی اچھی طرح میں انھیں جانتا ہوں کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ انھیں جداگانہ انتخاب کا حق دینا ان کے حق میں زہر ہے۔ وہ آج کل اونچے طبقوں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ لوگ چاہیں تو انھیں بالکل کچل دیں۔ اسی بات کو روکنے کے لیئے میں اس مطالبے کی سختی سے مخالفت کرتا ہوں کہ انھیں جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔ یہ الفاظ کہتے وقت مجھے احساس ہے کہ میں اپنے ملک کی شرمناک حالت کا پردہ آپ کے سامنے کھول رہا ہوں۔ مگر یہ بتائیے کہ ایسی حالت میں میں ان کی تباہی کیونکر گوارا کرلوں؟ مجھ سے یہ پاپ نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر امبیڈکر بڑے قابل آدمی ہیں مگر اس معاملے میں ان کے حواس بجا نہیں رہے۔ میں ان کے اس دعوے کی تردید کرتا ہوں کہ وہ اچھوتوں کے نمائندے ہیں۔"

"اب دوسری جماعت یعنی یورپیوں کو لیجئے۔ ان کی جداگانہ نمایندگی کا میں دوسری وجوہ سے سختی سے مخالف ہوں۔ وہ حاکم قوم سے ہیں اور ملک میں ان کا عجیب و غریب اثر ہے۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ انھوں نے پہلے ہندوستانی گورنر کا جینا دشوار کردیا تھا۔ خود ان کے سکریٹری ہر وقت ان کے حرکات و سکنات کی نگرانی کرتے تھے اور ان کے نوکران کے مخبر تھے۔ میں نے سر ہیوبرٹ کار سے جو گول میز کانفرنس میں یورپی جماعت کے نمائندے ہیں کہا "آپ ووٹ لینے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ آپ یقین کیجئے کہ ہندوستانی حلقہ انتخاب مسٹر اینڈریوز جیسے شخص کو یقیناً منتخب کرے گا۔" انھوں نے کہا کہ مسٹر اینڈریوز انگریزوں کی نمائندگی کے

لئے موزوں نہیں ہیں۔ وہ انگریزوں کے خیالات سے اسی قدر دور ہیں، جتنا کوئی ہندوستانی۔ تو میرا یہ کہنا ہے کہ اگر کسی انگریز کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اسے چاہیئے کہ ہندوستانیوں کے خیالات کا نمائندہ بنے۔ آخر لارڈ سالسبری کے "کالے آدمی" دادا بھائی نوروجی نے کیا کیا تھا؟ وہ مرکزی فنسبری کی طرف سے پارلیمنٹ میں گئے تھے یا نہیں؟ اب رہے انگلو انڈین تو ان میں جو غریب لوگ ہیں انھیں میں اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ کرنل گڈلی نہیں جانتے ہوں گے۔ مجھے ان کی حالت رتی رتی معلوم ہے۔ وہ میرے آگے آکر روئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں کی نقالی کرتے ہیں مگر انگریز ہمیں اپنے اندر شامل نہیں کرتے اور ہندوستانیوں سے ہمارا رشتہ اس وجہ سے ٹوٹ گیا کہ ہم نے غیروں کا چلن اختیار کر لیا۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آؤ ہم تمھیں، اپنے اندر شامل کرتے ہیں۔ اب اگر ان لوگوں کو جداگانہ انتخاب مل گیا تو یہ بھی اچھوت بن جائیں گے۔ ممکن ہے کہ کرنل گڈلی کو کوئی خطرہ نہ ہو مگر ان کی طرح سب کو تو سر کا خطاب ملنے سے رہا۔ البتہ اگر وہ لوگ ہماری قوم کے پاس آئیں اور خدمت کے حق کی بنا پر ووٹ مانگیں تو ان سب کے لئے کوئی خطرہ نہ رہے۔

لنکاشائر کا سفر

لنکاشائر کے بعض صنعتی خطوں میں کارخانے صرف یہی کام کرتے ہیں کہ روئی کے کپڑے بنا کر ہندوستان بھیجیں۔ گاندھی جی نے اس بات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ انھیں لنکاشائر کے اجیروں اور مزدوروں سے ملنے کا موقع دیا گیا فرمایا "ہم اس کے لئے تیار تھے کہ ہمارے ساتھ تہذیب کا برتاؤ ہوگا جس کی ہم سب شریف آدمیوں سے توقع رکھتے ہیں۔ اس کے لئے بھی تیار تھے کہ کچھ غصّے کا اظہار ہوگا جو اکثر پریشانی اور غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے مگر جس گرم جوشی اور محبت سے ہمارا استقبال کیا گیا اس کی ہمیں توقع نہ تھی"۔ اس گرم جوشی اور محبّت کی برابری اگر کوئی چیز کر سکتی ہے تو وہ عقیدت جو ہندوستان کے شہروں اور گانوؤں میں گاندھی جی کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے۔ عام جلسے تو نہیں ہوئے مگر ان سے بہتر صورت اختیار کی گئی یعنی آجروں اور مزدوروں کے مختلف حلقوں سے دل کھول کر باتیں ہوئیں اور انھیں جو کچھ کہنا تھا انھوں نے گاندھی جی سے کہا۔ گو اس میں یہ دقت تھی کہ قریب قریب ایک ہی جواب بار بار دہرانا پڑتا تھا۔ مگر گاندھی جی تمام حلقوں سے ملے۔ انھوں نے کسی سے انکار نہیں کیا۔

مصیبت کا سبب

ان سب کی کتھا سننے کے بعد گاندھی جی کے لئے ان سے یہ کہنا کوئی خوشی کی بات نہ تھی کہ میں آپ کو کچھ زیادہ تسکین نہیں دے سکتا۔ شاید وہ اپنے دل میں ٹھی

بڑی امیدیں لے کر آئے تھے مگر گاندھی جی کو نہایت رنج کے انھیں یہ سمجھانا پڑا کہ آپ مجھ سے ایسے کام کی توقع کرتے ہیں جو میرے اور میرے ملک کے بس کا نہیں۔ "میری قومیت پسندی اس قدر تنگ نظری پر مبنی نہیں، کہ مجھے آپ کی مصیبت کا احساس نہ ہو یا میں اسے دیکھ کر خوش ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے ملک کے سُکھ کے لئے کسی دوسرے ملک کو دُکھ پہنچے میں یہ مانتا ہوں کہ آپ کو بہت سخت نقصان پہنچا ہے مگر میرے خیال میں آپ کی مصیبت کی ذمہ داری ہندوستان پر کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ چند سال سے کاروبار کی حالت یوں بھی خراب تھی۔ مقاطعے نے صرف یہ کیا کہ گرتے کو اور دھکا دے دیا۔"

اسپرنگ ویل گارڈن میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"پانچ مارچ سے جب کہ معاہدے پر دستخط ہوئے تھے انگلستان کے کپڑے کا مقاطعہ دوسرے ملکوں کے کپڑے سے علیحدہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ بہ حیثیت قوم ہم لوگ اس کے پابند ہیں کہ سب غیر ملکوں کے کپڑے کا مقاطعہ کریں لیکن انگلستان اور ہندوستان میں کوئی باعزت تصفیہ یعنی مستقبل طور پر صلح ہو جائے تو جس حد تک ہمیں اپنے کپڑے کے علاوہ باہر سے لینے کی ضرورت ہوگی، میں بے تکلف چند خاص شرطوں پر لنکاشائر کے مال کو دوسرے ملکوں کے مال پر ترجیح دوں گا۔ معلوم نہیں اس سے آپ کی مشکل کس حد تک حل ہو سکے۔ آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اب دنیا کے سب بازار تو آپ کے لئے کھلے نہیں ہیں۔ جو آپ نے کیا تھا وہی آج سب قومیں کر رہی ہیں۔ خود ہندوستان کے کارخانوں کی پیداوار روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آپ ہم سے یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ لنکاشائر کی خاطر

ہندوستان کی صنعت کی ترقی روک دو۔"
انھوں نے کہا "مجھے یہاں بے روزگاری کا حال دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ مگر یہاں فاقوں مرنے کی یا آدھے پیٹ کھانے کی نوبت نہیں آئی۔ ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں موجود ہیں۔ آپ ہندوستان کے دیہات میں جائیں تو گاؤں والوں کی آنکھوں سے ان کے حال زار کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ کو آدھے پیٹ کھانے والے ہڈیوں کے پنجر، زندہ لاشیں نظر آئیں گی۔ اگر ہندوستان انھیں کام دے کر ان کا پیٹ بھر دے اور ان میں جان ڈالدے تو یہ ساری دنیا پر احسان ہوگا۔ آج ہندوستان دنیا کے لئے ایک لعنت ہے۔ میرے ملک میں ایک جماعت ایسی ہے جو چاہتی ہے کہ یہ لاکھوں کروروں نیم فاقہ کش مر جائیں تو اچھا ہے تاکہ جو لوگ بچیں وہ جی سکیں۔ میں نے ایک خدا ترسی کی بات سوچی کہ ان لوگوں کو وہ کام دیا جائے جو ان کا جانا بوجھا ہو، جو وہ اپنی جھونپڑیوں میں کر سکیں جس کے اوزار خریدنے کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت نہ ہو اور جس کی پیداوار آسانی سے فروخت ہو سکے۔ یہ چیز اس قابل ہے کہ لنکا شائر بھی اس کی طرف توجہ کرے۔"
بعض آجروں نے کہا "مگر آپ ان ملوں کو تو دیکھئے جو کل تک کام کی کثرت سے شہد کی مکھیوں کے چھتے بنے ہوئے تھے اور آج سنسان پڑے ہیں۔ بلیک برن، ڈاروِن۔ گریٹ ہارووڈ اور ایکرنگٹن میں سو زیادہ مل بند ہوگئے۔ گریٹ ہارووڈ کے ضلعے میں ۶۳۴۷ کرگھے رُک گئے۔"
"ہم لوگوں نے کالج میں ہندوستان کے کام کا کپڑا بنانے کی خاص

طور پر تعلیم پائی تھی۔ ہم صرف ہندوستان کے لئے دھوتیاں تیار کیا کرتے تھے۔ اب کیا وجہ ہے کہ ہم یہی کام نہ کریں اور ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بہتر تعلقات نہ قائم ہو جائیں"

مزدوروں میں سے بعض نے کہا" ہم نے ۹۹-۱۸۹۷ء کے قحط میں ہندوستان کی مدد کی تھی۔ غریبوں کے لئے چندہ کر کے بھیجا تھا۔ ہم ہمیشہ حریت پسندی کی پالیسی کے حامی رہے آخر ہمارے خلاف یہ مغالطہ کیوں ہے؟" چند آدمیوں نے اپنی ذاتی شکایتیں بھی گاندھی جی کے آگے بیان کیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلگداز ایک شخص کے یہ الفاظ تھے " میں کپڑے کے کارخانے کا مزدور ہوں چالیس برس تک میں کپڑا بننے کا کام کرتا رہا اور اب بیکار ہوں۔ مجھے افلاس اور مصیبت کی فکر نہیں۔ مگر میری عزت نفس جاتی رہی۔ میں خود اپنی نظروں سے گر گیا اس لئے کہ میں بے روزگاری کا وظیفہ پاتا ہوں۔ اب میری بقیہ زندگی خودداری سے گزرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی"

کھری کھری سچی بات ہیز فارم پارک شائر میں آجروں اور خوش حال مزدوروں کی قیام گاہ ہے، جہاں وہ کبھی کبھی ہفتے کا آخری حصہ گزارنے چلے جاتے ہیں۔ یہاں سے بے روزگاروں کے کئی وفد گاندھی جی کے پاس آئے اور ان سب نے قریب قریب ایک ہی سی کتھا سنائی۔ جو لوگ قیام گاہ میں تھے انھوں نے جمع ہو کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے۔ گاندھی جی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اپنے جذبات کو چھپائیں انھوں نے کہا" اگر میں آپ کے سامنے صاف گوئی سے کام نہ لوں تو گویا آپ کو دغا دوں گا اور دوستی کے پردے میں

دشمنی کروں گا"۔ کوئی پون گھنٹے تک وہ انھیں اپنے دل کی باتیں سناتے رہے کہ ان کی زندگی میں معاشیات او. اخلاقیات اور سیاسیات ملی جلی ہیں اور ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتیں، کس طرح انھوں نے حق کا جھنڈا اور سب چیزوں سے اونچا رکھا اور نتیجے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ کس وجہ سے انھوں نے ملک میں چرخے کو رواج دیا اور کیونکر دنیا کے حالات نے انھیں موجودہ صورت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ تقریر کے دوران میں انھوں نے کہا "میں نے گزشتہ مارچ میں لارڈ ارون سے بڑی بحث کی کہ ہمیں شراب اور بدیسی کپڑے کے مقاطعے کی آزادی رہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ یہ مقاطعہ تین مہینے کے لئے علامت صلح کے طور پر چھوڑ دیجئے، اس کے بعد پھر شروع کردیجئے گا۔ میں نے کہا کہ میں اسے تین منٹ کے لئے بھی چھوڑنے پر تیار نہیں۔ آپ کے یہاں تو تیس لاکھ بے روزگار ہیں ہمارے یہاں تیس کروڑ آدمی ہیں جن میں سے بہت سے بے روزگار ہیں اور باقی سال میں چھ مہینے بیکار رہتے ہیں۔ آپ کے یہاں بے روزگاری کا اوسط وظیفہ ستر شلنگ ماہوار ہے ہمارے یہاں اوسط آمدنی ساڑھے سات شلنگ ہے۔ اس مزدور نے بہت ٹھیک کہا کہ وہ خود اپنی نظروں سے گر گیا ہے۔ میرے نزدیک بھی یہ یقیناً ذلت کی بات ہے کہ انسان بیکار رہے اور بے روزگاری کے وظیفے پر زندگی بسر کرے۔ جب میں ایک ہڑتال چلا رہا تھا تو میں نے ایک دن کے لئے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ ہڑتالی بیکار رہیں بلکہ میں نے ان سے پتھر کھدوائے ریت اٹھوائی سڑکوں پر کام کرایا اور اپنے رفیقوں کو بھی اس کام

میں ان کا شریک رکھا۔ اب آپ ذرا سوچئے یہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ ملک میں تیس کروڑ بے روزگار ہوں، کروڑوں اس بے روزگاری کے سبب سے روز ٹھوکریں کھاتے پھریں، ذلت میں آلودہ، ایمان سے خالی میری ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے آگے خدا کا پیام لے جاؤں۔ ان کروڑوں بھوکوں کو جن کی آنکھوں میں رونق نہیں، جن کا خدا بس روٹی ہے، اللہ کا پیام سنانا ایسا ہی ہے جیسا اس کتے کو سنانا میں یہ پیام ان کے پاس کام کی مقدس دعوت کی شکل میں پہنچاتا ہوں۔ ہم یہاں مزے میں ناشتہ کر کے بیٹھے ہیں اور خدا کا نام لیتے ہیں مگر میں ان غریبوں کے آگے کس منہ سے خدا کا نام لوں جنھیں دن میں دو دو وقت بھی روٹی نہیں جڑتی۔ انھیں خدا صرف دال روٹی کی صورت میں نظر آسکتا ہے۔ ہندوستان کے کسانوں کو روٹی تو اپنی زمین سے مل رہتی تھی۔ میں نے ان کے سامنے چرخا رکھ دیا کہ دال کی بھی فکر ہو جائے۔ میں برطانوی قوم کے سامنے دھوتی باندھ کر اسی لئے آیا ہوں کہ میں ان بے زبان، نیم برہنہ، نیم فاقہ کش غریبوں کا تنہا نمائندہ ہوں۔ ہم نے یہاں عبادت کی ہے تاکہ خدا کی برکت نازل ہو اور ہم اس سے دل کھول کر فیض اٹھائیں۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب کروڑوں بھوکے کسی کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں تو عبادت کرنا ناممکن ہے۔

مقابلے میں دیکھا جائے تو آپ اس مصیبت میں بھی چین سے ہیں۔ آپ کا یہ چین میری آنکھوں میں کھٹکتا نہیں۔ میں آپ کا بھلا چاہتا ہوں۔ مگر آپ یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ ہندوستان کے غریبوں کی قبروں پر آپ کی کھیتی لہلہائے گی۔ میں ہر گز یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان

ساری دنیا سے الگ ہو جائے۔ مگر مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ میرا ملک کھانے اور کپڑے کے لئے کسی اور ملک کا دست نگر ہو۔ ممکن ہے کہ موجودہ مشکلات کو رفع کرنے کی کوئی تدبیر سوچی جائے مگر یہ امید نہ رکھئے کہ لنکاشائر کی تجارت کو وہ اگلا سا فروغ ہو گا۔ یہ محض ناممکن ہے۔ مجھے اس بین ڈ کرنے سے میرا مذہب روکتا ہے۔ فرض کیجئے دفعتاً میری سانس رک جائے اور کچھ دیر مصنوعی تنفس سے مدد لینے کے بعد میں پھر سانس لینے لگوں تو کیا مجھے یہ چاہیئے کہ اسی مصنوعی تنفس کے سہارے رہوں اور اپنے پھیپھڑوں سے کام لینا چھوڑ دوں؟ نہیں یہ تو خودکشی کے برابر ہے۔ مجھے چاہیئے کہ اپنے پھیپھڑوں کو قوت پہنچاؤں خود اپنے جسم کی طاقت سے کام لوں۔ آپ خدا سے یہ دعا کیجئے کہ ہندوستان اپنے پھیپھڑوں کو قوت پہنچائے۔ اپنی مصیبت کا سبب ہندوستان کو نہ قرار دیجئے۔ ان عالمگیر قوتوں کو دیکھئے جو آپ کی مخالفت میں برسرکار ہیں۔ واقعات پر عقل کی بے لاگ روشنی میں نظر ڈالیئے۔"

آگے چل کر گاندھی جی نے کہا "مہربانی کر کے یہ بتائیے کہ دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ فاقے کی سی حالت میں ہو اور اپنی عزت نفس کھو بیٹھا ہو تو میں ایسی صورت میں کیا کروں؟ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر لنکاشائر کے بے روزگاروں تک کو غور کرنا چاہیئے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے ۱۸۹۹ء کے قحط میں ہماری مدد کی تھی ہم اس کا بدلہ سوائے غریبوں کی دعاؤں کے اور کیا دے سکتے ہیں؟ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کو جائز تجارت کرنے کا موقع دوں۔ اگر میں بغیر کچھ دئے واپس چلا جاؤں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہو گا۔ میرے دل میں ذرا

بھی نفرت نہیں ہے۔ مجھے دعوےٰ ہے کہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ جانور سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ تو انگریزوں سے کیوں نہ رکھوں گا جن کا ہمارا چاہے بھلا ہو یا بُرا، ایک صدی سے زیادہ کا ساتھ ہے اور جن کے اندر میرے بعض بہت عزیز دوست ہیں؟ مجھ سے معاملہ کرتا آپ بہت آسان پائیں گے۔ لیکن اگر آپ نے میری صلح کی چھیڑ چھاڑ رد کردی تو میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا، غصّے سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ابھی میرا تنا پاک نہیں ہوا کہ آپ کے دل میں گھر کر سکوں۔"

غیر ملکی کپڑے کا مقاطعہ

ایجورتھ میں آجروں کے ساتھ جو گفتگو ہوئی وہ دوستانہ لہجے میں ٹھنڈے دل سے ہوئی۔ وہاں گاندھی جی نے غیر ملکی کپڑے کے مقاطعے کا معاشی پہلو بہت مدلل طریقے سے سمجھایا۔

سوال کیا گیا:۔

"کیا اس مقاطعے کو جو سیاسی مقصد سے کیا جائے معاشی مقاطعے سے الگ کرنا ممکن ہے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا "جب مقاطعہ کا تنہا مقصد برطانیہ کو سزا دینا تھا مثلاً سنہ ۱۹۳۰ء میں کہ لوگ امریکہ یا جرمنی کی بنی ہوئی چیزوں کو برطانوی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے تو یہ کھلم کھلا سیاسی مقاطعہ تھا۔ اس زمانے میں برطانوی مشینوں تک کا خریدنا موقوف ہوا۔ مگر اب صرف معاشی مقاطعہ رہ گیا ہے۔ آپ چاہے اس کو مقاطعہ کہیں مگر اصل میں یہ تزکیۂ نفس کی تعلیم دینے کی کوشش ہے۔ یہ ہندوستانیوں کو جوش دلانا ہے کہ اپنا پرانا پیشہ پھر اختیار کریں، کاہلی کو دور کرکے اٹھ کھڑے

ہوں اور اپنی روزی چاہے وہ کتنی ہی کم ہو، وظیفوں سے نہیں بلکہ اپنے ہاتھ پیر کی محنت سے کمائیں۔"

"مگر جب آپ اپنے ملوں کے کپڑے کو باہر کے کپڑے پر ترجیح دیتے ہیں تو مقاطعے کا سیاسی پہلو بدستور باقی ہے؟"

"مقاطعہ ملوں کی خاطر نہیں شروع کیا گیا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو یہ پہلی عملی کوشش تھی جو ملوں کے مالکوں سے ہمارا جھگڑا ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ لکھ پتی لوگ ہماری تحریک کو مدد دے رہے ہیں مگر ہماری پالیسی ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ہمیں ان پر اثر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ہم دیہات میں جاتے ہیں تو لوگوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہندوستانی ملوں کا کپڑا پہنو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ کھادی پہنو یا خود کھادی تیار کرو۔ اور کانگریس کے ہر ممبر پر کھادی پہننے کی تاکید کی جاتی ہے۔"

"آپ چاہے جو کچھ کہیں آپ کا مقصد یہی ہے کہ مزید سیاسی قوت حاصل کریں اور وہ آپ کو مل جائے گی۔ قوت ہاتھ آتے ہی یہ ملوں کے مالک لالچ سے اندھے ہو کر ملک کو ہماری محصولوں کی دیواریں محصور کر لیں اور آپ کے دیہات کے لئے لنکاشائر کی تجارت سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔"

"اگر میں اس وقت تک زندہ رہوں اور یہ افسوسناک واقعہ میرے سامنے ہو، تو میں وعوے سے کہتا ہوں کہ مل اس کوشش میں خود برباد ہو جائیں گے۔ پھر جب ہمیں سچی سیاسی قوت حاصل ہو گی تو اس کے ساتھ کل بالغوں کو حق رائے دہندگی بھی مل جائے گا۔ اور اس

صورت میں امیروں کے لئے یہ ناممکن ہو جائے گا کہ وہ غریب دیہاتیوں کے مفاد کو پامال کریں۔"

"کیا آپ کے خیال میں عام لوگ خود کچھ دن کے بعد پھر سے مل کا کپڑا نہ پہننے لگیں گے جیسے امریکہ والے پھر سے شراب پینا شروع کرتے جاتے ہیں؟"

"نہیں۔ امریکہ میں امتناع شراب ایک قوی حربہ تھا جو ایک زبردست قوم نے عوام کی مرضی کے خلاف استعمال کیا۔ لوگ شراب پینے کے عادی تھے۔ یہ چیز فیشن میں داخل تھی۔ ہندوستان میں مل کا کپڑا کبھی فیشن میں داخل نہیں ہوا بلکہ کھادی کا فیشن ہو گیا ہے اور اس کو پہن کر انسان شرفاء کی صحبت میں اٹھ بیٹھ سکتا ہے۔ اور فرض کیجئے ایسا ہی ہو جیسا آپ کہتے ہیں تو میں اپنی قوم کی معاشی آزادی کے لئے لڑتا رہوں گا۔ اور اس بات کو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ یہ مقصد ایسا ہے جس کے لئے انسان کا جینا اور مرنا بے جا نہیں۔"

"یہ لڑائی برابر کی نہیں ہو گی۔ معاشی مقابلے کی زبردست طاقت کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکے گی۔"

"گویا آپ کے نزدیک خدا نے دولت کے بت سے شکست کھائی ہے اور کھاتا رہے گا۔ خیر، ہندوستان کے اندر خدا کو شکست نہیں ہونے پائے گی۔"

یہ دلچسپ گفتگو زیادہ تر روئی کاتنے والوں اور بننے والوں کی انجمن[1] کے

---

[1] Cotton Spinners' and Manufacturers' Association.

سکریٹری مسٹر گرے سے ہوئی تھی۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ یہ مصیبت زیادہ سخت اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے پیش نظر ایک خاص رقبہ ہے مثلاً بلیک برن میں اگر پچاس فی صدی بے روزگاری ہندوستان کے سبب سے ہے تو ان کے علاقے یعنی برنلے میں صرف پندرہ فی صدی ہے۔ انھوں نے یہ بھی مان لیا کہ بہت سے مل اس سے پہلے بند ہو چکے تھے۔ جب کانگریس نے برطانوی مال کے مقاطعے کا اعلان کیا اور موجودہ مصیبت زیادہ تر عالمگیر اسباب پر مبنی ہے اس لئے اگر ہندوستان کا مقاطعہ بالکل اٹھا دیا جائے تب بھی یہ پوری طرح دور نہیں ہو سکتی۔

افلاس انگلستان اور ہندوستان میں

بے روزگار مزدوروں نے جو گاندھی جی سے ملنے آئے غصے یا آزردگی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہندوستان کی زراعت کے متعلق سوالات کرتے رہے کہ کاشتکار کے سال میں چھ مہینے بیکار رہنے کی کیا وجہ ہے اور مادی زندگی کا معیار اس قدر پست کیوں ہے وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ ہمارے لئے فاقے کا سوال نہیں بلکہ تنگی ترشی سے زندگی بسر کرنے کا ہے۔ اگر ہم پہلے ایک شلنگ خرچ کر سکتے تھے تو اب چھ پنس کرتے ہیں۔ ہم سے بعض کے پاس کچھ نہیں بچتا اور بعض کو تو پہلے کا جمع کیا ہوا روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ان کے موجودہ وظیفے کی شرح مرد کے لئے ۱۷ شلنگ عورت کے لئے ۵ا شلنگ (مزدور کی بیوی کو اگر وہ خود مزدورنی نہ ہو ۹ شلنگ) اور بچے کے لئے ۲ شلنگ ہفتہ وار ہے۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تو اچھی خاصی رقم ہے اور آپ جیسے باتدبیر لوگوں کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ اپنے لئے اور پیشے یا مشاغل ڈھونڈھ لیں۔ میرے

کروڑوں فاقہ کشوں کے لئے اور کوئی شغل نہیں۔ اگر آپ کے ماہرین فن کوئی اور صورت بتا سکیں تو میں خوشی سے چرخے کو چھوڑ کر اسے اختیار کرلوں۔ اس وقت تو میں آپ کو اس سے بڑھ کر کوئی امید نہیں دلا سکتا کہ آزاد ہندوستان جو برطانیہ کا برابر کا شریک ہوگا لنکاشائر کے کپڑے کو جہاں تک ہندوستان کو ضرورت ہو اور وہ خود نہ بنا سکتا ہو اور سب ملکوں کے کپڑے پر ترجیح دے گا۔"

اس سے ان کو کیا تسکین ہوتی۔ لیکن جاتے وقت بھی وہ خفا نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "اس سے کچھ نہ کچھ مفید نتیجہ نکلے گا اور فرض کیجئے کوئی فائدہ نہ ہو تو کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔ اتنا فائدہ تو یقیناً اسی وقت پہنچا کہ آپس میں اچھے تعلقات کی راہ نکل آئی۔ اب ہم ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھ گئے۔ ہمارے لئے بڑے فخر کی بات ہے کہ ہم نے مسٹر گاندھی کی زیارت کرلی۔ ان کی ذات ایک عظیم الشان قوت ہے جو بیدار ہونے والے مشرق کے اندر سے پیدا ہوئی ہے۔" ایک اور شخص نے کہا "میں بھی بے روزگار ہوں لیکن اگر میں ہندوستان میں ہوتا تو وہی کہتا جو مسٹر گاندھی کہہ رہے ہیں۔"

کنٹربری کے ڈین

ڈین صاحب نے اپنے خاص بے تکلف، دلکش انداز میں کہا "اخبار والے اس چکر میں ہیں کہ گاندھی جی کنٹربری کیوں آئے۔ ان کے خیال میں میرا انھیں بلانا اور ان کا یہاں آنا تعجب کی بات ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ سیاست سے قطع نظر کرکے ایک بہت بڑی چیز مجھ میں اور مسٹر گاندھی میں مشترک ہے یعنی مذہب۔ انھی روحانی مسائل پر گفتگو کرنے کی غرض سے مجھے مسٹر گاندھی کی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ یقین ہے کہ دونوں اس کے بعد پھر ملیں گے۔"

ان دونوں میں بڑی بے تکلفی سے باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد تین بجے سے گاندھی جی نے اپنا چُپ کا روزہ شروع کر دیا کیونکہ دوسرے دن انھیں اسی وقت ایک اہم جلسے میں تقریر کرنا تھا۔ گاندھی جی نے کہا: —

"ڈین صاحب آپ گواہ رہیئے کہ اب میں چُپ سادھتا ہوں۔"

ڈین صاحب بولے "کسی کی مجال نہیں کہ آپ کو بولنے پر مجبور کرے۔"

اس سے پہلے وہ دریافت کر چکے تھے کہ آپ سہ پہر کی عبادت میں شریک ہوں گے یا نہیں اور گاندھی جی نے جواب دیا تھا "بڑے شوق سے۔"

چنانچہ ہم لوگ کنٹربری کے قدیم گرجے کی شاندار رسم عبادت میں شریک ہوئے۔ عبادت کے بعد ڈین نے حاضرین کے ساتھ ملکر گول میز کانفرنس کے ہندوستانی نمائندوں کے لئے خاص طور پر دعا کی کہ خدا ہندوستان کو وہ باامن آزادی عطا کرے جو انگلستان کو حاصل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے چین کے کروروں ستم زدوں کی نجات کی دعا مانگی۔ مجھے تھوڑی

ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ یہ خالی خولی رسمی دُعائیں نہیں ہیں۔

چین

میں نے ڈین صاحب سے کہا "آپ کے دیوان خانے میں جو کتابیں رکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو آج کل چین کے معاملات سے دلچسپی ہے۔" میرا ذرا سا چھیڑنا تھا کہ انھوں نے سب کچھ کہہ سنایا بڑے جوش میں کہنے لگے "جی ہاں۔ میں چین کے مسائل کا مطالعہ بہت دن سے کر رہا ہوں مگر آج کل جو مصیبت اس پہ نازل ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ مطالعہ اور بھی لازم ہو گیا اور ہم لوگوں کی تجویز ہے کہ آئندہ سال موسم بہار میں وہاں جائیں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر شوائیتزر اور ڈاکٹر گرین فیل بھی میرے اور چارلی اینڈریوز کے ساتھ جائیں گے۔ جو رقبہ تہ آب ہوا ہے وہ برطانیہ اور آئرستان کے مجموعی رقبہ کے برابر ہے۔ اس سے ۸ کروڑ آدمیوں کو نقصان پہنچا ہے اور کوئی دس لاکھ ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ وہاں پہنچ کر صورت حال کا معائنہ کریں۔ اور ممکن ہو تو ساری دنیا کی توجہ اس طرف منعطف کرا دیں۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ معاملات کے سیاسی پہلو کا بھی مطالعہ کریں گے؟"

ڈین صاحب نے فرمایا "جی ہاں۔ میرے نزدیک آزادی کے معنی صرف میری آزادی نہیں بلکہ ہر فرد اور ہر قوم کی آزادی۔"

میں نے کہا "آپ نے تحقیقات کے لئے جن اشخاص کو منتخب کیا ہے ان سے بہتر اس کام کے لئے کوئی نہیں ہو سکتا۔" ڈین صاحب ڈاکٹر گرین فیل اور ڈاکٹر شوائیتزر کی تعریف کرنے لگے۔ "ڈاکٹر شوائیتزر کا نام انگلستان بھر میں مشہور ہے۔ وہ لبراڈور کے دور دراز ملک میں

وہاں کے مظلوموں کی حمایت کرنے پہنچے تھے۔ البرٹ شوائٹزر اس کام کو یوں سمجھیں گے کہ یہ اسی کام کا سلسلہ ہے جو میں وسط افریقہ میں کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "انھوں نے ابھی اپنی نئی کتاب گاندھی جی کو بھیجی ہے" ڈین صاحب نے فرمایا کہ میں اس کتاب سے واقف ہوں۔" ڈاکٹر شوائٹزر نے یورپ میں دینی خیالات کے دھارے کا رخ پلٹ دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسرے پہلو پر حد سے زیادہ زور دیدیا۔ مگر میرے خیال میں انھوں نے لوگوں کو بر وقت متنبّہ کر دیا۔ وہ عجیب و غریب شخص ہیں۔ انھوں نے موسیقی میں کمال حاصل کیا خصوصاً باخ کی چیزیں خوب بجاتے تھے۔ اس کے بعد جرّاحی سیکھی اور ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد ان کے دل میں یہ سمائی کہ افریقہ کے اس سرے پر مظلوموں کی خدمت کرنے کے لئے جا پہنچے ان کے عمل کی محرّک دو چیزیں ہیں۔

(۱) اس ارشادِ خداوندی پر کامل ایمان کہ جو اپنی جان کھوئے گا وہی سچی زندگی پائے گا۔

(۲) اور یہ عقیدہ کہ ان پر ہماری قوم کے گناہوں کا، ان وحشیانہ مظالم کا، جو ہم نے ناپاک بردہ فروشی کے عمل سے ان قوموں کے اخلاق کو شراب سے بگاڑ کر، کئے ہیں، کفارہ ادا کرنا فرض ہے۔ ان کے نزدیک اس کا کوئی کفارہ ممکن نہ تھا اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو بیماری اور خطرے اور موت کے منہ میں ڈال دیا۔"

روس | میں نے برٹرینڈ رسل کی کتاب "مسئلہ چین"[1] کا ذکر کیا جو ان کی میز پر رکھی تھی۔ وہ برٹرینڈ رسل کے حالات بیان کرنے لگے اور اس سلسلے میں انھیں اپنے متعلق بھی کچھ کہنا پڑا۔ میں برٹرینڈ رسل کو خوب جانتا ہوں۔ انقلاب روس کے زمانے میں میں نے انھیں روس پر تقریر کرنے کے لئے بلایا تھا۔ مانچسٹر کے فوجی حکام مجھ سے بدظن ہو گئے کیونکہ جلسے میں فوج کے سپاہی بھی تھے۔ میرا یہ خیال تھا کہ روسی جو کچھ کر رہے ہیں انھیں وہی کرنا چاہیئے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ مذہب خصوصاً عیسوی مذہب کو برا کہتے ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہ تھی کیونکہ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ان کا عمل ان کے قول سے زیادہ اہم ہے۔ ان کی یہ کوشش کہ غریبوں اور مظلوموں کی حمایت میں لڑیں اور ایسا بندوبست کریں کہ زندگی کی آسائشیں پہلے غریبوں کو ملیں پھر دوسروں کو سراسر مسیح کے اصول کے مطابق ہے۔ سچا عیسائی وہ نہیں جو اللہ کے نام کی تسبیح پڑھا کرے بلکہ وہ جو اللہ کے حکم کو مانے۔"

میں نے کہا "ڈین صاحب آپ کو تعجب ہوگا اور خوشی ہوگی کہ یہی خیال قریب قریب انھی الفاظ میں فوئل اور ڈوروتھی بکسٹن کی کتاب "بالشویکی طریق کا صلائے عام"[1] میں ظاہر کیا گیا ہے۔" وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے یہ کتاب نہیں دیکھی تھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ آپ کو بھیج دوں گا۔ ڈین صاحب نے آہ سرد بھر کر کہا "کاش ہم ان لوگوں سے واقف ہوتے جن سے ہم جنگ کرتے رہے ہیں۔"

---

[1] The Challenge of Bolshevism.

مثال کے طور پر انھوں نے جرمن قوم کا ذکر کیا۔ "میں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا اور انھیں جانتا تھا اس لئے میرا دل کہتا تھا کہ ہمیں ان لوگوں سے نہیں لڑنا چاہیئے۔" میں نے لارڈ ہالڈین کا نام لیا۔ انھوں نے کہا "وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو جرمنی اور جرمن قوم سے واقف تھے۔ وہ اسکاٹستان کے رہنے والے تھے اور شاید صحت کے خیال سے انھوں نے یہاں کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ جرمنی چلے گئے اور وہاں انھوں نے جرمن تہذیب کے بہترین عناصر سے پورا استفادہ کیا۔"

وہ ان مسائل پر گفتگو کر رہے تھے مگر ان کے دل میں دنیا کے مختلف حصوں کے مظلوموں کا خیال بسا ہوا تھا۔ کہنے لگے "سہ پہر کی عبادت کے دوران میں جب ہم تیئیسویں مناجات پڑھ رہے تھے جو مسٹر گاندھی کی وہی کیفیت ہوگی جس کی اس میں ہو بہو تصویر ہے اور انھوں نے خدا کی قوت سے تقویت حاصل کی ہوگی :-

"میں کون ہوں؟ ایک ادنیٰ سا انسان، ایک حقیر کیڑا، سب کی نظروں میں ذلیل، جماعت سے نکالا ہوا۔

جو لوگ مجھے دیکھتے ہیں حقارت کی ہنسی ہنستے ہیں۔ وہ منہ بنا کر اور سر ہلا کر کہتے ہیں اس شخص نے خدا پر بھروسا کیا تھا کہ وہ اسے بچالے گا اب وہ آئے اور اسے بچائے۔"

آگے چل کر یہ الفاظ ہیں :-

"اگرچہ میں وادیٔ اجل سے گذر رہا ہوں لیکن مجھے ضرر کا خوف نہیں۔ کیونکہ تو میرے ساتھ ہے۔ تیرے عصا کا مجھے سہارا ہے۔"

اس کے بعد ڈین صاحب نے آخری آیتیں پڑھیں اور فرمایا "بہت سے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ مسٹر گاندھی کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے جھنجلا کر کہا کہ عیسائی بنانا کیا معنی میں نے تو ان کی زندگی میں حضرت عیسیٰ کی جو شان دیکھی وہ کسی اور میں آج تک نظر نہیں آئی۔"

میں نے کہا "کسی شخص کا قول ہے کہ کلیسا سے دل بھاگتا ہے اور مذہب کی طرف کھنچتا ہے۔ یہ لوگ مذہب کی حقیقی روح سے خالی ہیں۔"

رُکن کلیسا

ڈین صاحب نے کہا "یہ تو خوب بات کہی۔ خدا جانے کس کا قول ہے۔" مگر اسی کے ساتھ انہوں نے اتنا اور بڑھا دیا "مگر ترقی اور اصلاح کی ہر تحریک انھیں لوگوں کو اٹھانا چاہیئے اور وہی اٹھا بھی سکتے ہیں جو کلیسا کے اندر ہیں۔ میرے نزدیک تو کلیسا درخت کی چھال کی طرح ہے۔ چھال کا کام حفاظت کرنا ہے مگر وہ نشو و نما بھی چاہتی ہے۔ زندگی کی خاطر چھال کا برس کی برس پھٹنا ضروری ہے تاکہ جوہر حیات کو پھیلنے کا موقع ملے مگر چھال پھر جوں کی توں ہو جاتی ہے اور درخت کی حفاظت کرتی ہے۔ میں اگر کلیسا میں نہ ہوتا تو اس طرح بغاوت کبھی نہ کرتا۔" ان کی بغاوت میں پہلے ہی دکھا چکا ہوں۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب اس فرانسیسی ہوگونو[1] جماعت سے ملاتے ہیں جو صدیوں پہلے انگلستان آئی تھی اور جس نے یہاں ریشمی کپڑا بننے کو رواج دیا۔ انھوں نے بڑے فخر سے کہا "میں جولاہا بھی ہوں اور باغی بھی یہ دو باتیں مجھ میں اور مہاتما گاندھی میں مشترک ہیں۔"

---

[1] Huguenots فرانس کا قدیم پروٹسٹنٹ فرقہ

دونوں ایک ہو جائیں گے

وہ پھر اصل بحث پر آ گئے اور کہنے لگے اگر مجھے مہاتما گاندھی کی کوئی مثال تاریخ میں نظر آتی ہے تو وہ اسیسی کے مقدس فرانسیس کی ذات ہے۔ اسیسی کا ذکر آیا تو انھیں اپنی پیاری بیوی یاد آ گئیں جنھوں نے اپنے مرنے سے کچھ دن پہلے ان کے ساتھ اسیسی میں اور ساونارولا کے وطن فلارنس میں قیام کیا تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کی انتہائی تعریف کر رہے تھے تو میں اپنے دل میں اس بات پر فخر کر رہا تھا کہ مجھے اس شخص کی صحبت نصیب ہوئی جس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ موت زندگی کی ایک برتر شکل کا نام ہے۔ انھوں نے کہا "موت نے ہم دونوں کو جدا نہیں کیا وہ اب مجھ سے اور قریب ہو گئی ہیں۔ مجھے ہر دم یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجود ہیں اور مجھے اُن کی ذات سے فیض پہنچ رہا ہے۔ جو کام میں نے اپنے ذمے لیا ہے اس میں میرا اور ان کا ہر روز ساتھ رہے گا۔"

ڈین صاحب اس خوبی سے جیسے کوئی تصویر کھینچ کر دکھاتا ہے، اپنی بیوی کے لافانی کام کا ذکر کر رہے تھے جو اُن کا حاصل زندگی تھا کہ کیونکر انھوں نے مانچسٹر کی بیس ہزار ماؤں کی خدمت کی، کس خاموشی اور عزم و استقلال سے سرطان کے موذی مرض کو سہتی رہیں اور کس طرح دُنیا سے رخصت ہوئیں میں نے مشہور و معروف مناجات کے الفاظ دُہرائے :-

"اے موت تیری تلخی کدھر گئی، اے قبر تیرا غلبہ کہاں ہے؟"

پھر وہ اپنی نوجوانی کا ذکر کرنے لگے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ مشنری بن کر ہندوستان جائیں۔ چنانچہ انھوں نے دینیات اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ مگر ان کے خیالات اس قدر آزادانہ سمجھے گئے کہ وہ ہندوستان بھیجے جانے کے

قابل نہیں ٹھہرے۔ انھوں نے فرمایا "اکثر مجھے یہ خیال آیا کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مشرق چلا جاؤں اور اپنی زندگی مظلوموں کی خدمت کے لئے وقف کر دوں۔ میری بیوی کا دل ہر وقت انھیں میں رہتا ہے۔ مگر ہمارے معتمد اور با اثر دوستوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ آپ کا کنٹربری میں رہنا ضروری ہے کیونکہ یہی تمام انگریزی زبان بولنے والے عیسائیوں کا مرکز ہے۔ یہاں قریب اور دور سے لوگ آتے ہیں، ان سے تعلقات پیدا کر سکتے ہیں، اور ممکن ہو تو ان مسائل کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جو اس وقت دنیا کے پیش نظر ہیں۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کا آنا اسی قسم کی چیز ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر انھیں یہاں کا امن و سکون پسند آیا تو وہ پھر تشریف لائیں گے۔ اخبار والے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ مسٹر گاندھی بڑے گرجے میں گئے تھے یا نہیں اور گئے تھے تو وہاں انھوں نے کیا کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہاں وہ میرے ساتھ گئے تھے اور گرجے میں اسی انداز سے کھڑے رہے اور وہی حرکتیں کرتے رہے جو عبادت میں کی جاتی ہیں۔ مگر آپ چاہیں تو اخبار میں یہ لکھ سکتے ہیں کہ میرے دل میں ان کی جو تصویر ہمیشہ نقش رہے گی وہ اس حالت کی ہے جب وہ میرے دیوان خانے میں آگ کے پاس بے تکلفی سے کتاب ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ کاش کوئی نقاش ہوتا جو یہ مرقع کھینچتا!"

امرتسر کا واقعہ اب ہرگز نہ ہو انھوں نے کہا "معلوم نہیں میں نے جو کچھ کہا ہے اخبار والے وہ سب شائع کریں گے یا نہیں۔ خیر مجھے اس کی پروا نہیں۔ بس وہ اتنی مہربانی فرمائیں کہ جو میں نے نہیں کہا وہ میری طرف منسوب نہ کریں۔ شمال میں

اخبار والوں کا سلوک میرے ساتھ اچھا تھا معلوم نہیں، یہاں کیسا ہوگا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کے توسط سے برطانوی قوم کے سامنے اعلان کر دیا کہ اگر گول میز کانفرنس ناکامیاب ہوئی تو کم سے کم میں جبر کی حکومت کا روادار نہیں ہوں گا۔ برطانوی قوم ہر گز یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جو واقعہ امرتسر میں ہوا تھا وہی پھر پیش آئے۔"

ڈین صاحب نے گاندھی جی کو کرائسٹ چرچ کتھیڈرل دکھایا اور اس قدیم عمارت کے ایک ایک حصے کی تاریخ بیان کرتے رہے۔ سب سے زیادہ زور انھوں نے ان واقعات پر دیا جن سے سچی حرّیت پسندی اور رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔ فرمانے لگے "ٹامس ایبکٹ نے اصل میں آزادی کی خاطر جان دی۔ اس نے بادشاہوں کے اقتدار کی مخالفت کی اسی وجہ سے اس کا نام یورپ بھر میں عزّت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ دیکھئے اس عمارت کے عین وسط میں ایک قدیم گرجا ہے۔ جہاں فرانس کے پریسبیٹیرین[51] جو اپنے ملک کے تشدد سے بھاگ کر آئے تھے امن امان سے عبادت کرتے تھے۔ وہ ہیوبرٹ والٹر کی قبر ہے جو صلیبی جنگوں میں گئے تھے اور وہاں انھیں معلوم ہوا کہ سلطان[52] نہایت ہی خلیق آدمی ہیں۔ وہ دیکھئے قبر پر سلطان کا چہرہ بنا ہوا ہے۔ اور کئی چہرے تھے جو مٹ گئے یا مٹا دیئے گئے مگر خوشی کی بات ہے کہ یہ اب تک باقی ہے۔"

۵۱ـ Presbyterians. عیسائیوں کا ایک فرقہ

۵۲ـ غالباً سلطان صلاح الدین کی طرف اشارہ ہے۔

انسان مشینوں کے لئے نہیں بنایا گیا ہے

رات کو وہ ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھے اور گاندھی جی کو چرخا چلاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں "مسٹر گاندھی کو مشینوں سے نفرت ہے۔ مگر یہ بھی تو مشین ہے اور اس قدر نازک کہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔" وہ اخبار والوں سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ "مسٹر گاندھی کا جو خیال مشینوں کے متعلق ہے اس کے بارے میں لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہے۔ مشین کو اتنا نہ بڑھانا چاہیئے کہ انسان اس کے غلام ہو جائیں، وہ ان کا روزگار چھین لے اور انھیں افلاس میں مبتلا کر دے۔ ہندوستان میں اس نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو محتاج کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے مسٹر گاندھی لوگوں سے کہتے ہیں کہ چرخے کی طرف لوٹ چلو۔"

باتیں کرتے کرتے ان کے دل کو مظلوم چینیوں کے قلق نے پھر بے چین کر دیا کہنے لگے "مہاتما جی، ہمیں امید ہے کہ جب ہم چین جائیں گے تو آپ کی دعائیں ہمارے ساتھ ہوں گی۔"

ڈین صاحب کے ہر قول اور ہر عمل سے جوش خدمت کا اظہار ہوتا ہے اس میں کچھ تو ان کی نیک نہاد بیوی کی مبارک صحبت کا فیض ہے اور کچھ عشق الٰہی کا فیضان ہے۔ ان کی حرکات و سکنات اور ان کی ساری زندگی پر مرحوم بیوی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ذرا ذرا سی بات میں وہ انھیں یاد آجاتی ہیں۔ جب وہ صبح تڑکے ہمارے لئے چائے بنا رہے تھے تو انھوں نے فرمایا "میں اس باورچی خانے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں۔ البتہ مانچسٹر میں جو باورچی خانہ تھا وہ میرا جانا بوجھا تھا کیونکہ جب زمانے میں میری بیوی بیمار تھیں، مجھے رات کو کبھی کبھی پانچ پانچ سات سات بار کچھ نہ کچھ پکانا پڑتا تھا۔"

ڈین صاحب بڑے ظریف آدمی ہیں اور اکثر اپنے اوپر اور اپنے پیشہ وروں پر، جن کی تصویریں دیوان خانے میں چوبی گروے پر نصب ہیں، فقرے چست کر کے ہمیں ہنسایا کرتے ہیں. لیکن ان کی جو تصویر مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی وہ ایک محبت والے بزرگ کا چہرہ ہے جو ہمیشہ مظلوموں کو یاد کرتا ہے اور اس طرح اپنی بیوی کی ابدی رفاقت کا لطف اٹھاتا ہے۔
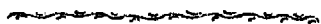
لندن | جو بچہ گاندھی جی کو پیار سے "چچا گاندھی" پکارتا ہے وہ ایک تین سال کا لڑکا ہے اور کنگسلے ہال کے "بچوں کے گھر" میں رہتا ہے۔ جب سے بچوں نے گاندھی جی کو دیکھا ہے وہ دن رات انھیں کے خیال میں رہتے ہیں وہ پوچھا کرتے ہیں "اماں بتاؤ گاندھی کیا کھاتے ہیں اور جوتے کیوں نہیں پہنتے؟" یہ سلسلہ اسی طرح چلا جاتا ہے۔ ماں کہتی ہے "دیکھ بیٹا" انھیں گاندھی نہیں بلکہ مسٹر گاندھی کہنا چاہیئے وہ بڑے اچھے آدمی ہیں" ننھا پکار اٹھتا ہے "اماں تو یہ ہے۔ اب میں انھیں چچا گاندھی کہا کروں گا۔" اللہ میاں کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ "چچا اللہ" کہلاتے ہیں۔ مگر اس قصے کو میں چھوڑتا ہوں۔ غرض گاندھی جی کا یہی نام پڑ گیا اور ان کی سالگرہ کے دن۔ بچوں نے "پیارے چچا گاندھی" کو سالگرہ کے تحفے کے طور پر کھلونے کا کتا اور مٹھائی بھیجی اور لکھا "کاش آپ کو سالگرہ کا کیک ملتا جس پر شکر کی بیل بنی ہوتی اور چڑیا بیٹھی ہوتی۔ آپ اپنی سالگرہ کے دن ہمارے یہاں آیئے تو ہم بینڈ بجائیں گے اور "ڈیزی"[۱] "درکٹھوتی کے اندر" اور "بتیاں روشن کرو" یہ گیت باجے پر سنائیں گے۔"

نظریہ اور عمل | ایک بچی ہے جو بچوں کے گھر میں نہیں بلکہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے اور وہ جس روز شام کو گاندھی جی کے پاس آئی تھی اس کی یاد انوکھے طریقے سے تازہ رکھتی ہے۔ سالگرہ کے دن اس کے باپ نے گاندھی جی سے کہا "مجھے آپ سے ایک شکایت ہے"

۱؎ daisy پھول کا نام ہے

گاندھی جی نے ہنس کر پوچھا" بھئی وہ کیا ؟" اس نے جواب دیا "میری ننھی جین روز صبح آکر مجھے مارتی ہے اور سوتے سے جگا دیتی ہے اور کہتی ہے" دیکھو خبردار لوٹ کر نہ مارنا ۔ اس دن گاندھی نے کہا تھا کہ کسی کو لوٹ کر نہیں مارنا چاہیئے!
اور بچوں کے ماں باپ پیار سے شکایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ روز اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں صبح تڑکے جگا دیا کرو تاکہ جب گاندھی جی ٹہلنے جاتے ہیں ہم انھیں سلام کر لیا کریں۔ ماں باپ کے لئے جو صبح اٹھنے کے عادی نہیں ہیں، یہ ایک مصیبت ہے کہ خود تڑکے اٹھیں اور انھیں اٹھائیں۔ ممکن ہے کہ یہ بچے آگے چل کر زبردست باغی ہوں اور اگر ماں باپ ان کے ساتھ آگے نہ بڑھیں تو ان کا ناک میں دم کر دیں۔ میں خیالی پلاؤ نہیں پکا رہا ہوں بلکہ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ واقعات پر مبنی ہے۔ یہ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ بچوں نے کیا اثرات قبول کئے ہیں۔
مثلاً گاندھی جی کی سالگرہ کے دن ایک چھوٹی سی لڑکی نے یہ مضمون لکھا۔

" اسیسی کے مقدس فرانسس اسیسی کے فقیر کہلاتے تھے۔ وہ بالکل گاندھی جیسے تھے۔ گاندھی لنگوٹی باندھتے ہیں۔ وہ بھی جب اس دنیا میں تھے لنگوٹی باندھتے تھے۔"
"گاندھی اور مقدس فرانسس دونوں امیر سوداگروں کے بیٹے تھے۔ ایک روز رات کو مقدس فرانسس اپنے ساتھیوں کے ساتھ دعوت اڑا رہے تھے کہ انھیں اطالیہ کے غریبوں کا خیال آیا اور وہ دوڑ کر باہر نکل گئے انھوں نے اپنے قیمتی کپڑے اور روپیہ پیسہ غریبوں کو دے دیا اور پرانا ٹاٹ پہن لیا جیسا گاندھی پہنتے ہیں۔"

"مقدس فرانسس اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کو لے کر چلے۔ انھوں نے جنگل میں جھونپڑیاں بنائیں۔ گاندھی نے بھی یہی کیا۔ انھوں نے اپنا عیش و آرام ہندوستان کے غریبوں کی خاطر تج دیا۔"

"گاندھی کی قوم نے انھیں لندن آنے کے لئے لنگوٹیاں لے دیں۔ انھوں نے خود ہم سب بچوں کے سامنے جو کنگسلے ہال جایا کرتے ہیں، کہا کہ میرے پاس اتنا نہ تھا کہ میں لنگوٹی مول لے سکتا۔"

"پیر کے دن وہ دن بھر چپ رہتے ہیں کیونکہ یہ ان کا مذہب ہے۔ گاندھی کو سالگرہ کے تحفے میں کھلونے، موم بتیاں اور مٹھائی ملی۔ وہ بکری کے دودھ، مونگ پھلی اور پھلوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔"

ہم ایک اور عبارت ایک دس سال کے بچے کی نقل کرتے ہیں۔ اور پچھلی عبارت کی طرح اس میں بھی کسی قسم کی تبدیلی، ہجے یا صرف و نحو کی نہیں کریں گے۔

"مسٹر گاندھی ایک ہندوستانی ہیں جنھوں نے ۱۸۹۰ء میں لندن میں قانون کی تعلیم پائی۔ انھوں نے اس کو چھوڑ دیا تاکہ اپنے ملک کی حالت سنبھالیں۔"

"وہ ہندوستانی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان آئے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو تجارت پھر مل جائے۔ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ برہمن اچھوتوں کو اپنے مندروں میں آنے دیں۔ یہ لوگ ساٹھ لاکھ ہیں اور انھیں یہ خبر نہیں کہ پیٹ بھر کھانا کیسے کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا دھن دولت سب لٹا دیا ہے اور غریب سے غریب ہندوستانیوں کی طرح رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی لئے وہ لنگوٹی باندھتے ہیں۔

"ان کی غذا دودھ، پھل اور ترکاری ہے۔ وہ گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے کیونکہ وہ کسی کی جان لینے کے قائل نہیں ہیں۔ گاندھی عیسائی ہندوستانی ہیں۔"

"مسٹر گاندھی اپنے لئے آپ روئی کاتتے ہیں۔ وہ انگلستان میں روز ایک گھنٹہ کتائی کرتے ہیں اور جب اسپتال میں تھے تب بھی کرتے تھے۔ وہ حال ہی میں لنکا شائر کے ملوں کو دیکھ بھال کر واپس آئے ہیں۔"

"وہ اتوار کو ۷ بجے شام سے پیر کو ۷ بجے شام تک عبادت کرتے ہیں اور اگر ان سے بات کرو تو جواب نہیں دیتے۔ جب وہ سب سے ملنے نکلے تو میرے گھر بھی آئے اور میری ماں استری کررہی تھیں مگر انھوں نے کہا "اپنا کام کئے جائیے، میں نے خود یہ کام کیا ہے۔" میں نے گاندھی سے ہاتھ ملایا ہے۔ ہندوستانی میں "اچھا آئیے" اور "خدا حافظ" کو "نمسکار" کہتے ہیں۔

ڈبلیو۔ اے۔ آئی۔ بسویل

۱۴ رائیکلنگ روڈ، باؤ، لندن، ای ۳، ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

یہ الفاظ کتنے سچے اور اصلیت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ان مہملات کے مقابلے میں جو بعض اخبار نویس گھڑتے ہیں تاکہ اخبار میں چھاپنے کے لئے سنسنی خیز مضمون مل جائے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ باتیں بچوں کو یا تو اپنے استادوں سے معلوم ہوئی ہیں یا انھوں نے گاندھی جی سے میل جول میں سیکھی ہیں۔

حبشی اور ہمارا جھنڈا اس سے بالکل مختلف دیہات کے ایک مدرسے کی تصویر ہے جو لندن سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں مسٹر بریلسفورڈ کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ تو میں کس ملک کا ہوں" چند لمحے تک سناٹا رہا اس کے بعد مدرس کی

پانچ برس کی لڑکی نے کہا "حبشیوں کے ملک کے۔" اس کے قریب جو لڑکا بیٹھا تھا اس نے گھبرا کر اس کے کان میں کہا "یہ کالے تھوڑی ہیں یہ ہندستانی ہیں۔" ایک اور درجے میں مسٹر بریلیسفورڈ نے پوچھا کہ ہندوستان نقشے میں کہاں پر ہے انھوں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ مگر استاد نے فوراً ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے "یہ ملک ہمارے جھنڈے کے نیچے ہے اور یہ صاحب اپنے ملک کے لئے حقوق طلب کرنے آئے ہیں۔" ان بیچاروں نے کبھی گاندھی کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن آگے چل کر معلوم ہوا کہ جس لڑکے نے اس لڑکی کے کان میں باتیں کی تھیں اور اس کی غلطی کی اصلاح کی تھی وہ ایک مزدور کا لڑکا ہے جو اخبار پڑھتا ہے اور گاندھی جی کی بہت عزت کرتا ہے۔

بچوں کے گھر کے جو حالات میں نے بیان کئے ہیں ان سے ان کے منتظموں کی تعریف نکلتی ہے اور آئندہ نسل کا نمونہ نظر آتا ہے۔ گاندھی جی کے انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے ہزاروں بچے انھیں دیکھ چکے ہوں گے۔ اور کیا تعجب ہے کہ یہی وہ نسل ہو جس سے ہمیں معاملہ کرنا پڑے۔ یہ لوگ زیادہ اچھے اور زیادہ منصف مزاج ہوں گے بہ نسبت موجودہ نسل کے جو روزانہ اخباروں کا پڑھایا ہوا سبق پڑھتی ہے۔ جو ہندوستان کے متعلق کوئی اچھی بات بھول کر بھی نہیں لکھتے البتہ بُری اور غلط باتیں بہت لکھا کرتے ہیں۔

ایچ ۔ این بریلسفورڈ

مسٹر بریلسفورڈ ۔ جب آپ نمک کا محصول معاف کر دیں گے تو آمدنی کی کمی پوری کرنے کے لئے اس کی جگہ پر کون سی چیز تجویز کریں گے ۔

گاندھی جی ۔ نمک تو چھوٹی سی چیز ہے ۔ بڑی چیز شراب، تاڑی اور افیم کی آمدنی ہے ۔ یہ البتہ ملک کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس کی کمی کسی طرح پوری نہیں ہو سکے گی ۔ بجز اس کے کہ ہم فوج کا خرچ کم کر دیں جو بلا بنکر ہمارے سر پر مسلط ہے اور ہمارا گلا گھونٹ رہا ہے ۔ اس زبردست بوجھ کو کسی نہ کسی طرح ہٹانا ہے ۔

مسٹر بریلسفورڈ ۔ میرے خیال میں گول میز کانفرنس میں اصل موضوع بحث یہی ہو گا ۔

گاندھی جی ۔ بیشک ہو گا ۔ اس سے ہم کسی طرح بچ ہی نہیں سکتے ۔

مسٹر بریلسفورڈ ۔ تو کیا آپ کا ارادہ یہ ہے کہ گوروں کی فوج کو رخصت کر دیں ۔

گاندھی جی ۔ جی ہاں میرا یہی ارادہ ہے ۔

مسٹر بریلسفورڈ ۔ کیا فوج کے ساتھ آپ سول ملازموں کو بھی شامل کرتے ہیں ۔

بھاری تنخواہیں

گاندھی جی ۔ ہمارے سر پر جو بوجھ ہے اس میں یہ لوگ بھی شامل ہیں ۔ ان کی وجہ سے حکومت کا خرچ بے حد بڑھ گیا ہے ۔ ان کو اتنی بڑی بڑی تنخواہیں دینا کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ ان کے ٹھاٹھ اسی طبقے کے لوگوں سے جو انگلستان میں ہیں کہیں زیادہ ہیں ۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ ان بڑی تنخواہوں کی جو توجیہہ عموماً کی جاتی ہے کیا وہ بالکل قابل غور نہیں؟ یہ سویلین جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور انھیں بڑی تکلیف دہ آب و ہوا کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

گاندھی جی۔ اب یہ بات نہیں ہے۔ آمدورفت کے ذرائع بہتر ہو جانے سے صورت حال بدل گئی ہے۔ ہفتے میں دو بار ڈاک آتی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو وطن سے عزیز و اقارب کے حالات برابر معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ ہم میں مل جُل کر ہماری طرح رہیں تو ہم ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں۔ مگر ان کا تو یہ رنگ ہے کہ کسی سے واسطہ نہیں رکھتے۔ اپنی چھاؤنیوں میں الگ تھلگ رہتے ہیں۔ چھاونی کے نام سے فوج کی بُو آتی ہے اور ہے بھی یہی کہ وہاں اب تک فوجی قانون کا دَور دَورہ ہے۔ اس کی حد کے اندر کوئی مکان بھی ہو، اگر فوج کہے کہ ہم کو اس کی ضرورت ہے تو وہ فوراً چھینا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ایک صاحب پر گذرا جو ہمارے آپ کے دوست ہیں۔ اگرچہ انھوں نے مکان اپنے رہنے کے لئے بنایا تھا۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ فوج کے متعلق دو الگ الگ سوال ہیں یا یوں کہیے، کہ ایک سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک تو اصولی بات ہے کہ فوج پر ہندستانیوں کا اختیار ہو۔ دوسرا معاشی مسئلہ ہے جو فوج کی تخفیف سے حل ہو سکتا ہے کیا یہ ضروری ہے کہ آپ دونوں پر زور دیں؟

گاندھی جی۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ فوج پر ہمارا اختیار ہو، ہم جو چاہیں کریں۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ بیشک۔ بغیر اس کے کوئی قوم قوم نہیں کہلا سکتی۔

فوج

گاندھی جی۔ لوگ کہتے ہیں یہ فوج اس لئے ہے کہ افغانوں کے حملے سے آپ کی حفاظت کرے۔ ہمیں اس حفاظت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو یہ آزادی چاہیئے کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں ممکن ہے ہم ان سے لڑائی ٹھان لیں۔ ممکن ہے صلح و آشتی سے کام نکالیں۔ غرض جو کچھ کریں اپنی مرضی سے کریں۔ ہم تو اس پر راضی ہیں، کہ تھوڑے دن تک گوروں کی کچھ فوج ہندوستان میں رکھیں۔ مگر ہم سے کہا جاتا ہے کہ گورے ہندوستانی حکومت کی ماتحتی میں نہیں دیئے جاسکتے۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ بے شک اس وقت تک نہیں دیئے جاسکتے جب تک وہ خود راضی نہ ہوں۔ مگر میرے نزدیک ان میں سے بہت سے معقول شرائط پر ہندوستانی فوج میں خوشی سے بھرتی ہوجائیں گے۔

گاندھی جی۔ ممکن ہے کہ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوجائے لیکن جب فوج کم کی جائے گی تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے بے روزگاروں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ اچھا اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ فوج پر ہندوستان کا اختیار ہوگا تو کیا آپ اس معاملے میں گفت و شنید کرنے کو تیار ہیں۔ کہ آپ اتنی مدت تک گوروں کی فوج رکھیں گے۔ ان کی یہ تعداد ہوگی اور یہ خرچ ہوگا؟

گاندھی جی۔ ہم اس قسم کی ہر بات قبول کرلیں گے بہ شرطیکہ اس میں ہندوستان کا فائدہ ہو۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ سچ پوچھئے تو اس میں آپ کے فائدے سے زیادہ ہمارا فائدہ ہے۔

گاندھی جی۔ (ہنس کر) پھر بھی ہم اسے قبول کرلیں گے۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ یہ اختیار کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ آپ کو اختیار ملے۔ تخفیف کی اور بات ہے۔ اس میں آپ کو ایک حد تک کامیابی ہوگی۔

ہم لوگ عنقریب تخفیف اسلحہ کی کانفرنس میں شریک ہونے والے ہیں۔ ممکن ہے کہ دنیا کی تخفیف اسلحہ میں جو خدمت ہم کریں اس کا ایک جُز یہ بھی ہو۔

گاندھی جی۔ میں تو جو کچھ چاہتا ہوں میں نے کہہ دیا ہے۔ میری شرطیں سَب کو معلوم ہیں۔ مگر حکومت ابھی تک جھجک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ دینا چاہتی ہے اسے ظاہر کرتے ڈرتی ہے۔ خیر میں انتظار کرنے کو تیار ہوں۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ جب تک ہم معاشی مشکلات میں گرفتار ہیں اس کام میں دیر لگنا ضروری ہے لیکن عجب نہیں کہ اس دیر کا نتیجہ اچھا ہو۔

والیان ریاست

مسٹر بریلسفورڈ۔ میں باہر کا آدمی ہوں شاید میرا اندازہ صحیح نہ ہو مگر آپ بتائیے کہ ایک اور مشکل درپیش ہے یا نہیں؟ کیا یہ ہندوستانی والیان ریاست آپ کی راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ نہیں ڈالتے؟

گاندھی جی۔ یہ لوگ تو برطانوی حکومت کے افسر ہیں جو دیسی لباس میں نظر آتے ہیں۔ ایک والی ریاست کا وہی حال ہے جو ایک برطانوی افسر کا۔ دونوں کا کام اطاعت کرنا ہے۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ تو آپ والیان ریاست کو وائسرائے کے ماتحت رہنے دیں گے؟

گاندھی جی۔ ان کو ہندوستان کی حکومت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔

مسٹر بریلسفورڈ۔ مگر وہ تو شاید وائسرائے کے ماتحت رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

گاندھی جی۔ ہاں ان سے پوچھئے تو یہی کہیں گے۔ لیکن کیا واقعی وُہ دل سے

اس پر راضی ہیں؟ آخر وہ بھی اسی رنگ کے ہیں جس کے ہم ہیں۔ وہ بھی ہندوستانی ہیں۔

مسٹر بریلیسفورڈ۔ مگر موجودہ صورت میں اُنھیں وہ بات حاصل ہے، جسے آپ کبھی گوارانہ کریں گے۔ آج کل کی دفتری حکومت انھیں آداب نیاز اور آداب سیاست کے بجالانے پر تو مجبور کرتی ہے لیکن انھیں اس کا موقع دیتی ہے کہ اپنی رعایا کے ساتھ جو چاہیں کریں۔

گاندھی جی۔ آداب کا لفظ موزوں نہیں۔ عاجزانہ اطاعت کہیئے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی مرضی کا مالک نہیں۔ فرض کیجئے نظام کوئی کام کرنا چاہتے ہیں وائسرائے کا ایک عتاب آمیز فقرہ انھیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کے لئے کافی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ لارڈ ریڈنگ کے زمانے میں کیا ہوا تھا؟

مسٹر بریلیسفورڈ۔ ماتحتی کے مسئلے سے قطع نظر کرکے یہ بتائیے کہ اگر والیان ریاست وفاقی مجلس وضع قوانین کے چالیس فی صدی ممبروں کو نامزد کیا کریں گے، تو اس کی کوئی امید ہو سکتی ہے کہ قانون آپ کے کروروں یتیم فاقہ کش غریبوں کی رائے سے بنے؟

گاندھی جی۔ ہم ان سے اسی طرح نبٹ لیں گے جیسے آپ سے نبٹ رہے ہیں۔ وہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہوگا۔

مسٹر بریلیسفورڈ۔ میرے خیال میں تو ان کا جواب ہمارے جواب سے زیادہ وحشیانہ ہوگا۔ ہم لاٹھی سے کام لیتے ہیں وہ رائفل سے کام لیں گے۔

گاندھی جی۔ یہ آپ کا قومی غرور ہے۔ اچھی چیز ہے۔ مجھے پسند آئی۔ ہم سب میں یہ بات ہونا چاہیئے۔ مگر آپ کو یہ اندازہ نہیں کہ ہندوستان میں برطانوی قوت کس حد تک رُعب پر موقوف ہے۔ اس نے ہندوستانیوں کے دلوں پر جادو

کر دیا ہے۔ آپ کی قوم بہادروں کی قوم ہے اور آپ کی شہرت سے ہم مرعوب ہو گئے ہیں۔ یہی چیزیں میں نے جنوبی افریقہ میں دیکھی۔ زولو قوم بڑی جنگجو ہے۔ لیکن جہاں کسی زولو نے ریوالور دیکھا، چاہے خالی ہی کیوں نہ ہو وہ ڈر سے کانپنے لگتا ہے۔ اگر ہم کو والیان ریاست سے لڑنا پڑے تو انھیں یہ بات حاصل نہ ہوگی جو آپ کو اپنے رُعب کے بدولت حاصل ہے۔ فرض کیجئے ہماری قوم کو مرہٹوں سے مقابلہ کرنا پڑے تو وہ اپنے دل میں کہے گی "ہم بھی تو مرہٹے ہیں"۔ جنوبی افریقہ میں ہمیں اس تغیّر کی نظیر بھی ملتی ہے جو ہم اپنے اور والیان ریاست کے تعلقات میں چاہتے ہیں۔ سوازستان[1] کی ریاست پہلے برطانوی حکومت کے ماتحت تھی۔ جب جنوبی افریقہ کی متحدہ حکومت قائم ہوئی تو اس کے ماتحت کردی گئی۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست بھی اسی طرح ہندوستانی حکومت کے ماتحت کر دیئے جائیں۔

---

[1] Swaziland
جنوبی افریقہ کی ایک ریاست کا نام۔

فولاد کے ملک میں ووڈ بروک بستی وہ جگہ ہے جہاں بین الاقوامی امن، دوستی اور برادری کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔

یہ کوئیکر[1] حضرات کی کوشش اور سرگرمی کا نتیجہ ہے مثلاً مسٹر ایلیگز ینڈر جو پچھلے سال اس خطرناک زمانے میں اپنی بیوی کو جو ہاتھ پاؤں سے معذور تھیں اور جنھیں ہر وقت ان کی موجودگی کی ضرورت تھی، اکیلا چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے، مسٹر جیک ہوائے لینڈ جنھوں نے ہندوستان کے متعلق صحیح معلومات کی اشاعت میں بہت کام کیا، اس زمانے میں بھی جب وہ ہندوستان میں پروفیسر تھے اور اس کے بعد بھی جب وہ ووڈ بروک میں پندرہ قوموں کے طلباء کو پڑھاتے رہے۔ اور مسٹر ایچ، جی ووڈ جو ان کے صدر مدرس ہیں اور جن سے ہر شخص محبت اور عقیدت رکھتا ہے۔

ووڈ بروک اس لحاظ سے زیارت کے قابل ہے کہ یہاں دولت خلق اللہ کی امانت کی حیثیت سے حاصل کرنے اور خرچ کرنے کی مثال نظر آتی ہے۔ یہ ادارہ اس وقف سے چلتا ہے جو چاکولیٹ کے مشہور تاجر کیڈبری نے قائم کیا تھا۔ اس کی عمارت وہی گھر ہے جس میں مسٹر کیڈبری رہتے تھے اور جہاں ان کے بیٹے نگراں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ جس جوش سے گاندھی جی کا خیر مقدم کیا گیا اس کا اندازہ مسٹر ووڈ کے خط سے ہوتا ہے جس میں وہ گاندھی جی سے معذرت کرتے ہیں کہ اس روز شام کو ووڈ بروک میں موجود نہ ہوں گے:۔

---

[1] Quakers عیسائیوں کی ایک مخیّر جماعت کا رکن

"بہ قول فرانسیسیوں کے میرا دل اجاڑ ہے کہ ایک اور تقریب کی وجہ سے جس میں شریک ہونے کا میں نے بہت پہلے سے وعدہ کر رکھا ہے میں آئندہ اتوار کے دن سہ پہر کو ووڈبروک کے جلسے میں صدارت نہیں کر سکتا اور اس عزّت سے محروم رہوں گا کہ آپ کے برمنگھم کے بہت سے دوستوں اور قدردانوں کی طرف سے آپ کا استقبال کروں۔"

"انگلستان میں بہت سے لوگ آپ کے خیالات کو نہیں سمجھتے، اور اگر سمجھتے ہیں یا سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان پر ہمیشہ عمل نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ اس نے دنیا کی اور ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک وقت میں آپ جیسا پیمبر پیدا کر دیا جو اخلاقی رہبری کی صفات رکھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آج کل آپ پر کتنی ذمّہ داریاں ہیں۔ اور اگر ہمارے ووڈبروک کے حلقے میں ایک دن سکون و اطمینان سے گزارنے کی وجہ سے آپ کو اس قوت کے قائم رکھنے میں مدد ملے جو آپ کے عظیم الشان کام میں درکار ہے تو ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہمیں امّید ہے کہ جس کانفرنس میں آپ مشغول ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان اور انگلستان، ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی مفاہمت ہو جائے جو ہندوستان کی قومی تحریک کے جائز مطالبات کو پورا کرتی ہو۔

"ہمیں امید ہے کہ کوئی ایسا تصفیہ بھی ہو گا جس سے آپ کا یہ مقصد کہ ہندوستان پستی سے نکل کر انسانیت کی بلندی پر پہنچے۔ پورا ہو۔ کیونکہ آپ کی زندگی اور آپ کے کام سے جو عظیم الشان سبق ہم کو ملتا ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے مگر ہم اس پر بہت کم عمل کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ ہمیں ہمیشہ رابندرناتھ ٹگور کی یہ دعا یاد دلاتے رہتے ہیں "خدایا ہمیں یہ

قوت عطا کر کہ ہم غریبوں کو اپنا سمجھیں غیر نہ سمجھیں" حقیقت میں وہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی اس بستی کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے، شاعر کی اس دعا کے مصداق ہیں۔

برمنگھم کے بشپ سائنسدان بشپ نے سائنس اور مشینوں کی حمایت میں دلیلیں پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ ان ذریعوں سے انسان کو ہاتھ پیر کی محنت سے نجات دلانا چاہیئے تاکہ وہ اپنا سارا وقت یا اکثر وقت ذہنی مشاغل میں صرف کر سکے۔ گاندھی جی نے کہا کہ آپ عام طور پر لوگوں پر اعتماد نہیں کر سکتے کہ وہ اپنا خالی وقت اچھے کاموں میں صرف کریں گے اور اپنی تائید میں یہ مثل پیش کی "شیطان ہمیشہ بیکاروں کے لئے کچھ نہ کچھ کام نکالتا ہے"۔ بشپ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "میں تو ہاتھ کا کام ایک گھنٹے روز سے زیادہ نہیں کرتا۔ باقی وقت میں ذہنی مشاغل میں صرف کرتا ہوں"۔ گاندھی جی نے ہنسکر جواب دیا "یہ ٹھیک ہے لیکن اگر سب لوگ بشپ ہو جائیں تو بشپ بیچارے کیا کریں گے"۔

چار آنے روز ہم کوئی ایک گھنٹہ ڈاکٹر پاردی اور مسز پاردی کے ساتھ رہے جنھوں نے برمنگھم کے ہندوستانیوں کو گاندھی جی سے ملنے کے لئے اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ ان دوستوں نے کہا کہ ہمیں کوئی ہدایت کیجئے۔ گاندھی جی نے دو لفظوں میں انھیں یہ نصیحت کی:-

"آپ مٹھی بھر ہندوستانی جو برطانیہ میں ہیں ہندوستان کی عزت کے امانتدار ہیں۔ یہ ہمیشہ یاد رکھئے!" کسی شخص نے پوچھا کہ ہندوستان کی خدمت کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا "اپنی قابلیت سے روپئے بنانے کی جگہ اپنے ملک کی خدمت میں صرف کیجئے۔ اگر آپ لوگ

طبیب ہیں تو ہندوستان میں بیماری اس کثرت سے ہے کہ اسے آپ کے سارے کمال فن کی ضرورت ہے۔ اگر آپ وکیل ہیں تو ہندوستان میں جھگڑوں بکھیڑوں کی کمی نہیں۔ اور زیادہ فساد برپا کرنے کی جگہہ ان جھگڑوں کو چکائیے اور مقدمہ بازی موقوف کرائیے۔ اگر آپ انجینیر ہیں تو نمونے کے مکان بنائیے جو ہماری قوم کی ضرورت اور مقدرت کے لحاظ سے مناسب ہوں مگر اسی کے ساتھ صحت بخش اور تازہ ہوا سے معمور ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی سیکھا ہے اس میں سے ہر چیز کام آسکتی ہے۔ جن صاحب نے یہ سوال کیا وہ سند یافتہ محاسب[1] تھے۔ گاندھی جی نے فوراً کمار اپا کا نام نمونے کے طور پر پیش کیا۔

"آپ وہ کیجئے جو کمار اپا کرتے ہیں وہ بھی آپ کی طرح پیشہ ور محاسب ہیں۔ ہر مقام پر محاسبوں کی سخت ضرورت ہے تاکہ کانگریس اور متعلقہ انجمنوں کے حسابات کی جانچ کرسکیں۔ آپ میرے ساتھ ہندوستان چلیئے میں آپ کو کافی کام دوں گا اور مزدوری بھی دوں گا۔ چار آنے روز جو ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کی اوسط آمدنی سے زیادہ ہے"

ظاہر ہے کہ ہندوستانی لوگوں کو موجودہ زمانے کے مقابلے میں آئندہ کی زیادہ فکر تھی اور گاندھی جی نے اس کے متعلق جو کچھ کہا وہ میں یہاں نقل کرتا ہوں" ابھی ہندوستان کو آزمائش کی آنچ میں تپنا پڑے گا تب وہ دن آئے گا کہ انگریزوں کو کہنا پڑے گا افسوس ہمیں جو کچھ کرنا چاہیئے تھا وہ ہم نے پہلے نہیں کیا، ایک قوی قوم کا مغلوب ہونا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ اور میں جو عدم تشدد کا پابند ہوں یہ نہیں چاہتا کہ انگلستان مجبور ہوکر اپنی مرضی کے خلاف کوئی چیز دے۔ انگلستان کو یہ یقین دلانا ہے کہ اس

---

[1] Chartered Accountant

کی بہتری آزادی دینے میں اور ہندوستان کی بہتری آزادی پانے میں ہے۔
تب جا کر وہ اپنے اختیارات چھوڑنے پر راضی ہوگا۔"
مسٹر پاردی نے کہا "کیا ہندوستان کو یقین دلانے کے لئے یہ ضروری نہیں
کہ آپ یہاں کچھ دن اور قیام کریں۔"
گاندھی جی نے فرمایا "نہیں، میں اپنے وقت سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔
اگر اس سے زیادہ ٹھہروں تو میرا یہاں جو اثر ہے وہ جاتا رہے گا اور جو لوگ
میری بات سُنتے ہیں وہ نہیں سُنیں گے۔ میرا موجودہ اثر عارضی ہے مستقل نہیں
ہے۔ میری جگہ ہندوستان میں اپنی قوم کے درمیان ہے جس کو ممکن ہے،
تکلیفیں سہنے کی ایک اور مہم سر کرنا پڑے۔ سچ پوچھئے انگریزوں پہ آج جو کچھ
اثر ہو رہا ہے وہ محض اس لئے کہ میں اس قوم کا نمائندہ ہوں جو اپنے مقصد
کے لئے سختیاں برداشت کر لی ہے اور جب میں ہندوستان میں اپنے ملک
والوں کے ساتھ کڑیاں جھیلتا رہوں گا تو گویا میری گفتگو انگریزوں سے جاری
رہے گی، وہ گفتگو جو دل کی دل سے ہوا کرتی ہے۔

صحت بخش تعلیم گاندھی جی کا روڈولف اشٹائنر کے صحت بخش تعلیم کے مدرسے میں جانا بھی قابل ذکر ہے۔ روڈولف اشٹائنر نے ۱۹۲۵ء میں انتقال کیا مگر اس کے پیرو اس کا کام چلا رہے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فطرت انسانی کا زیادہ گہرا اور سچا مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے اور تسلیم کیا جائے کہ فلاں قوم اس حد تک دنیا کی ارتقا میں حصہ لے سکتی ہے وہ اس تعلیم کا حامی تھا جسے شلر "نوع انسانی کی جمالی تعلیم" کہتا ہے۔[۵]

۵؎ اشٹائنر کے نصاب تعلیم کی تفصیل سے ناظرین کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس میں جمالی تعلیم مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مولف نے غالباً اشٹائنر کے کسی پیرو سے یہ دعویٰ سُنا ہوگا کہ اس کی تعلیم شلر کے نظریئے کے مطابق ہے مگر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔

اس کا انصاب سائنس کی متعدد شاخوں پر حاوی ہے اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ طبیعی قوتوں اور فلکیات کے قوانین کے زیادہ گہرے مطالعہ سے زمین کی کاشت کا بہتر طریقہ اخذ کیا جائے۔ ہمیں یہاں جس چیز سے تعلق ہے وہ تعلیمی تجربات ہیں۔ یہ لوگ مدرسے میں ان بچوں کو داخل کرتے ہیں جو جسمانی یا اخلاقی حیثیت سے ناقص الخلقت ہیں اور جن کا علاج ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ ایک لڑکا جسے ہم نے برمنگھم کے سن فیلڈ اسکول میں دیکھا موٹر کے حادثے کی وجہ سے بالکل معذور ہو گیا تھا صرف ہاتھ پیر ہی سے نہیں بلکہ دماغ سے بھی۔ صحت بخش تعلیم اس بات کے اندازے اور مشاہدے پر مبنی ہے کہ بچہ جمالی اثرات مثلاً چاند سورج اور ستاروں کی خوبصورتی، دلکش مناظر قدرت، نقاشی اور موسیقی سے (جس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے) کس حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے بڑی صحت بخش قوت جس سے کام لیا جاتا ہے وہ محبت ہے جو اپنے آغوش میں معذوروں، لاچاروں اور ناقص الخلقت لوگوں کو لے لیتی ہے۔ میں نے انھیں لاطینی اور یونانی گیت (جو مجھے دیدوں کے گیتوں سے بہت مشابہ معلوم ہوئے) اور جرمن گیت گاتے ہوئے سُنا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ ہمیں مجنونوں کے مجمع کی جگہ ہنستے کھیلتے بچّوں کا کنبہ نظر آیا۔ اگر ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا، تو ہم انھیں ہرگز ناقص الخلقت نہ سمجھتے۔ شام کو ان لوگوں نے گاندھی جی کے آنے کی یادگار میں ایک ناٹک کیا مگر ہم اس میں نہ جا سکے اس تجربے سے بہت کچھ امیدیں ہیں اور یہ اس قابل ہے کہ نفسیات اور تعلیم کے ماہر غور سے اس کا مطالعہ کریں۔

برطانوی قوم کا فرض | وڈ بروک ہال میں بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں مختلف اداروں کے نمائندے موجود تھے۔

گاندھی جی نے اپنی تقریر میں کہا "دوسرے مقامات پر تو میں کام کے لئے، اپنا پیام پہنچانے کے لئے جاتا ہوں مگر یہاں زیارت کے لئے آیا ہوں۔ مجھ پر اس کی زیارت اس وجہ سے لازم ہے کہ اسی بستی نے اس وقت جب ہمیں ایک دوست کی ضرورت تھی مسٹر ہوریس الیگزینڈر کو بھیجا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ستیاگرہ کی خبریں ہندوستان سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ جو خبر بھیجی جاتی وہ احتساب کی زد میں آجاتی تھی اور خاص خاص لوگ سب جیل خانے میں تھے۔ اس موقع پر فرینڈس کی جماعت نے یہ تصفیہ کیا کہ ایک مشن ہندوستان بھیجی جائے اور مسٹر الیگزینڈر اس کام کے لئے منتخب کئے گئے۔ صرف آپ ہی نے ان کی جدائی برداشت نہیں کی بلکہ ان کی بیوی نے بھی جو ہاتھ پیر سے معذور ہیں اسے گوارا کر لیا اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں یہاں آنے کو زیارت کیوں کہتا ہوں۔"

"میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ جو کام میں کرنے والا ہوں اس کے ذکر میں آپ کا وقت صرف کروں۔ یہاں کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس قوم کی طرف سے کیا مطالبہ کرتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم نے کون سے ذریعے اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے اختیار کئے ہیں جو شاید کسی نے تاریخ میں اس سے پہلے نہیں کئے تھے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ پچھلے چند سال میں ہماری قوم نے کس حد تک اپنے عقیدے کی پیروی کی۔"

"میں آپ کے سامنے اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اس کام کا جو

گول میز کانفرنس میں ہو رہا ہے کوئی نتیجہ اسی صورت میں نکل سکتا ہے، کہ سمجھ دار لوگوں کی عام رائے کا دباؤ حکومت پر پڑے۔ میں اکثر کہہ چکا ہوں، کہ انگلستان میں میرا اصلی کام کانفرنس کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ اپنی معدودے چند عام تقریروں میں میں نے بے تامل یہ کہہ دیا کہ کانفرنس میں کوئی کام نہیں ہو رہا ہے اور ان سب لوگوں کا جو ہندوستان میں آئے ہیں یا جو انگلستان کے مقاصد کی وکالت کر رہے ہیں بیکار وقت ضائع ہوتا ہے۔ جب میری یہ رائے ہے تو میں اس بات پر جتنا اصرار کروں کم ہے، کہ برطانیہ کی رائے عامہ کے ذمہ دار لیڈروں کو چاہیئے کہ اس لڑائی کے متعلق صحیح حالات معلوم کریں جو ہندوستانی اپنے سے کہیں زیادہ قوی فریق سے لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ جب تک آپ اس لڑائی کی حقیقت سے اور اس کے اندرونی مقصد سے واقف نہ ہوں آپ ان لوگوں پر جن کے ہاتھ میں سلطنت کا کاروبار ہے اتنا دباؤ نہیں ڈال سکیں گے جس کا پورا اثر ہو۔"

"مجھے اس جلسے کے شرکا کے متعلق اس قدر معلوم ہے کہ آپ سب لوگ حق کے سچے طالب ہیں اور نہ صرف اس معاملہ میں بلکہ ہر معاملے میں جو انسانوں کی امداد کا مستحق ہے نیکی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اس مسئلے میں یہ نقطہ نظر اختیار کریں تو بہت ممکن ہے کہ گول میز کانفرنس کے مشوروں کا کوئی مفید نتیجہ نکل سکے۔"

آپس میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنا

اس تقریر کے بعد گاندھی جی سے جو سوال کئے گئے ان میں سے ایک یہ تھا۔ کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہندوستانی نمائندوں کے فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں آپس میں متفق نہ ہونے سے کامیابی ناممکن ہو گئی ہے۔ گاندھی جی

نے اس بات سے قطعی انکار کرتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہی بات سکھائی گئی ہے۔ آپ پر جو جادو کا سا اثر ڈالا گیا ہے اسے آپ دور نہیں کر سکتے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ غیر ملکی حکمراں ہندوستان میں آپس میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کے اصول سے کام لیتے رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں کسی غیر سلطنت کی حکومت بغیر اس کے قائم ہی نہیں رہ سکتی، کہ ہمارے فرماں روا کبھی ایک فریق سے لگاوٹ کریں کبھی دوسرے سے۔ ہم میں پھوٹ اس وقت تک رہے گی جب تک غیر ملکی حکومت کی پچر لگی ہوئی ہے اور اندر گھستی جاتی ہے۔ پچر کا یہی قاعدہ ہے لیکن جیسے ہی پچر نکل جائے دونوں ٹکڑے آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کانفرنس جن اجزا سے مرکب ہے ان کی بدولت اتحاد اس قدر مشکل ہو گیا ہے کہ ہفتخوان رستم سے کم نہیں۔ یہ سب لوگ نامزد کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بھی باقاعدہ انتخاب نہیں ہوا ہے مثلاً اگر قومیت پسند مسلمانوں سے کہا جاتا کہ اپنا نمائندہ منتخب کرو تو وہ ڈاکٹر انصاری کو کرتے۔ پھر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اگر یہی نمائندے جو آئے ہیں منتخب کئے جاتے تو انھیں ذمہ داری کا زیادہ احساس ہوتا۔ مگر صورت یہ ہے کہ ہم لوگ برطانیہ کے وزیر اعظم کی مرضی سے یہاں آئے ہیں۔ ہم کسی کے آگے ذمہ دار نہیں۔ ہمارا کوئی حلقہ انتخاب نہیں جسے ہم مخاطب کریں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جب تک تم فرقہ وارانہ مسئلے میں آپس میں متفق نہ ہو جاؤ ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ اس لئے یہ قدرتی بات ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی کہتا ہے اور چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو مل سکے وہ حاصل کرے۔ پھر یہ کہ ہم سے فرقہ وارانہ مسئلے کا متفقہ حل پیش کرنے کی فرمائش تو کی جاتی ہے مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ اگر ہم متفق ہو جائیں تو ہمیں

ملے گا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ محرک جس کی بدولت پہلے اتفاق ہونا ممکن تھا باقی نہیں رہا اور تصفیہ قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے۔ حکومت کو یہ اعلان کرنے دیجئے کہ چاہے ہندوستانیوں میں اتفاق ہو یا نہ ہو وہ ہندوستان سے دست بردار ہو جائے گی۔ پھر دیکھئے اتفاق ہوتا ہے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی شخص کو یہ خیال نہیں کہ ہمیں سچ مچ کی جیتی جاگتی آزادی ملے گی۔ جو چیز ہمیں پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دفتری حکومت میں شریک ہو کر ہندوستان کو لوٹو اور اس کی وجہ سے ہم میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ حکومت نے دستور اساسی کی ترتیب کو فرقہ وارانہ مسئلے کے حل ہونے پر مشروط کر دیا ہے اس لئے ہر پارٹی اپنے مطالبات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے اگر حکومت کو واقعی کچھ کرنا منظور ہوتا تو وہ بے تامل میری تجویز مان لیتی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک قانونی عدالت مقرر کر دی جائے۔ اگر اس کا اعلان ہو جائے تو اغلب ہے کہ عدالت کے دخل دینے سے پہلے ہی متفقہ طور پر کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔

برطانیہ کا کام ہندوستان میں

اس سوال کے جواب میں کہ اگر برطانوی حکومت اپنے کام سے دست بردار ہو جائے تو تغیر کے دور میں ہندوستان کا کیا حال ہو گا۔ گاندھی جی نے کہا "بیرونی حکومت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جسم نامی میں فاسد خارجی مادہ ہو۔ زہر کو دور کرتے ہی جسم فوراً اپنی اصلی حالت پر آنے لگتا ہے۔ برطانوی حکومت کا صرف ایک کام ہے اور وہ ہندوستان کو لوٹنا ہے اگر برطانیہ ہندوستان کو لوٹنا چھوڑ دے تو ہندوستان معاشی حیثیت سے فوراً سنبھل جائے گا۔

برطانوی بنیا ایک اور ممبر نے کہا "آپ کہتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ کی لوٹ کے بدولت غریب ہو گیا ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کاشتکاروں کی مصیبت کا اصل سبب بنیوں کی غارت گری اور وہ فضول خرچی ہے جو شادی اور غمی کے موقعوں پہ کی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ آپ برطانوی حکومت پر فضول خرچی کا الزام لگاتے ہیں مگر آپ ہندوستان کے والیان ریاست کی فضول خرچی کو کیا کہیں گے۔"

گاندھی جی نے کہا "ہندوستانی بنیئے کو انگریز بنیئے سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم تشدد پر عامل ہوتے تو ہندوستانی بنیا گولی مارنے کے قابل تھا مگر پھر برطانوی بنیا تو اس قابل تھا کہ اُسے سو بار گولی ماری جائے۔ ہندوستانی بنیا جو سود لیتا ہے وہ اس لوٹ کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جو برطانوی بنیئے نے مبادلۂ زر کے شعبدوں اور مالگذاری کی بے دردانہ وصولی سے مچا رکھی ہے۔ مجھے تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک ایسی غیر منظم اور حلیم و بردبار قوم اس طرح منظم طریقے سے لوٹی گئی ہو۔ اب رہی ہندوستانی والیان ریاست کی فضول خرچی تو اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ میں موقع پاؤں تو ان کے پُرنخوت محلوں کے چھین لینے میں زیادہ تامّل نہیں کروں گا لیکن برطانوی حکومت نئی دھلی چھیننے میں مجھے اس سے بھی کم تامّل ہوگا۔ جس بیدردی سے کروروں روپیہ نئی دہلی پر صرف کیا گیا جب لاکھوں آدمی فاقوں مر رہے تھے محض اس لئے کہ ایک وائسرائے کے دل میں یہ لہر اٹھی تھی کہ ہندوستان میں انگلستان کا نمونہ نظر آئے اس کے آگے والیان ریاست کی فضول خرچی ہیچ ہے۔"

اس کے بعد یہ سوال ہوا "کیا خود ہندوستان کے لوگ بنیادی مسائل پر

متفق ہو گئے ہیں؟"

اس کا یہ جواب دیا گیا "کانگریس کے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک متفقہ حل پیش کیا ہے مگر وہ منظور نہیں ہوا۔ اس کانفرنس میں کانگریس کی حیثیت محض ان متعدد پارٹیوں میں سے ایک پارٹی کی ہے جن کی نمائندگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف کانگریس ہی ایک نمائندہ جماعت ہے جو ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کی وکیل ہے۔ یہ ایک زندہ، نامی آزاد انجمن ہے، جو تقریباً پچاس برس سے قائم ہے۔ یہی ایک انجمن ہے جو بے انتہا تکلیفوں کی آزمائش میں پوری اُتری۔ اسی سے حکومت نے معاہدہ کیا ہے اور آپ چاہے جو کچھ کہیں یہی ایک دن موجودہ حکومت کی قائم مقام ہو گی۔ میرا دعویٰ ہے کہ جو تجویز اس نے ایک نمائندہ کمیٹی سے تیار کرائی ہے جس میں اس کی مجلس عاملہ کا ایک سکھ ایک مسلمان اور ایک ہندو ممبر تھا وہ عدل و انصاف کے لحاظ سے ہر قانونی عدالت کی جانچ میں پوری اُترے گی۔"

ایک صاحب نے ایک عجیب مضحک سوال کیا۔ انھوں نے مانچسٹر گارجین میں سے ایک خط پڑھ کر سُنایا جس میں نامہ نگار نے یہ اعتراض کیا تھا کہ گاندھی جی کو اچھوتوں کی وکالت کا کیا حق ہے جب کہ وہ برہمنوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ان غریبوں کو اب تک پستی کی حالت میں رکھا اور پھر یہ پوچھا کہ کیا اس مسئلے کے تصفیے میں خود آپ کی ذات بہت بڑی رُکاوٹ نہیں ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا "مجھے یہ آج تک نہیں معلوم تھا کہ میں برہمن ہوں۔ اصل میں میں بنیا ہوں جو ایک تکلیف دہ لقب سمجھا جاتا ہے اور ملامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

لیکن حاضرین کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ جب میں چالیس سال پہلے انگلستان آیا تھا تو میری جماعت نے مجھے ذات باہر کر دیا تھا اور جو کام میں کر رہا ہوں اس کی بنا پر میں کسان، جولاہا اور اچھوت کہلانے کا مستحق ہوں میں چھوت چھات کے دُور کرنے کا عہد اپنی بیوی سے پیمان وفا باندھنے سے پہلے کر چکا تھا۔ شادی کے بعد میری زندگی میں دو موقعے ایسے آئے جب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یا تو اچھوتوں کی خدمت کروں یا اپنی بیوی کے ساتھ رہوں اور میں یقیناً پہلی صورت کو ترجیح دیتا مگر میری نیک سیرت بیوی کی بدولت یہ مشکل حل ہو گئی۔ میرے آشرم میں جو میرا کنبہ ہے کئی اچھوت رہتے ہیں اور ایک چنچل پیاری لڑکی کو میں نے اپنی بیٹی بنا کر رکھا ہے۔ اب رہا یہ کہ میں تصفیئے میں رُکاوٹ ڈال رہا ہوں یہ سچ ہے اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ سوائے ہندوستان کے لئے سچی اور کامل آزادی حاصل کرنے کے میں اور کسی چیز پر مصالحت نہیں کر سکتا۔

آخری سوال جو گاندھی جی سے کیا گیا یہ تھا:۔

دل یا دماغ

بعض وقت ہمیں اس میں دقت پڑتی ہے کہ احتجاج کے اس خاص طریقے کو جو آپ نے ایجاد کیا ہے عقلی دلیل کے ساتھ مطابقت دے سکیں۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کبھی کبھی عقلی دلیل کو بالائے طاق رکھ کر زیادہ سخت طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں؟"

گاندھی جی نے جواب دیا "۱۹۰۶ء تک میں صرف عقلی دلیل پر بھروسا کرتا تھا۔ میں بڑا سرگرم مصلح تھا۔ میں مسودے تیار کرنے میں مہارت رکھتا تھا اور واقعات پر پوری طرح حاوی رہتا تھا۔ اور یہ لازمی نتیجہ تھا اس کا

کہ مجھے ذرا ذرا سی بات میں تلاش حق کی فکر رہتی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ
جب جنوبی افریقہ میں نازک وقت آیا تو دلیل سے کچھ کام نہیں چلا۔ میری
قوم میں بہت جوش تھا۔ مثل ہے کہ کبھی کبھی کیڑا بھی مقابلے کو کھڑا ہو جاتا
ہے۔ ہر طرف انتقام کا چرچا تھا۔ اس وقت مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ تشدّد
کا ساتھ دوں یا اس مشکل کو حل کرنے کا کوئی اور طریقہ نکالوں جس سے
بلوہ رُک جائے۔ مجھے یہ بات سوجھی کہ جس قانون سے ہماری ذلّت ہوتی
ہے اس کی پابندی سے انکار کروں۔ چاہے حکومت مجھے جیل خانے بھیج دے
اس طرح سے وہ چیز پیدا ہو گئی ہے جو جنگ کا اخلاقی بدل ہے۔ اس وقت
تک میں حکومت کا وفادار تھا کیونکہ آنکھ بند کرکے اس بات پر ایمان
لے آیا تھا کہ برطانوی سلطنت کی جد و جہد مجموعی حیثیت سے ہندوستان
کے لئے اور نوع انسانی کے لئے مفید ہے۔ جنگ چھڑنے کے تھوڑے
دن بعد جب میں انگلستان آیا تو میں بھی بے سوچے سمجھے اس میں شرکت
کرنے کو تیار ہو گیا اور آگے چل کر جب مجھے پسلنے کے ورم کی وجہ سے
ہندوستان جانا پڑا تو میں اپنی جان پر کھیل کر رنگروٹ بھرتی کرتا رہا۔
جس سے میرے بعض ساتھیوں کو سخت صدمہ ہوا۔ میری آنکھیں سنہ ۱۹۱۹ء
میں کھلیں جب ظالمانہ رولٹ ایکٹ پاس ہوا اور حکومت نے ان
سختیوں کی معمولی تلافی کرنے سے انکار کر دیا جو پوری طرح ثابت ہو چکی
تھیں۔ اس طرح سنہ ۱۹۲۰ء میں مَیں باغی بن گیا۔ اس وقت سے مجھے یقین
ہوتا جاتا ہے کہ جو چیزیں لوگوں کے لئے بنیادی اہمیّت رکھتی ہیں،
وہ صرف دلیل سے حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے لئے تکلیفیں اٹھانے
کی ضرورت ہے۔ اپنے اوپر تکلیفیں اٹھانا انسانوں کا قانون ہے۔ لڑائی

جنگل کا قانون ہے۔ لیکن تکلیف اُٹھانا دشمن کو دوست بنانے میں اور اس کے کان کھولنے میں جو عقل کی آواز نہیں سُنتے جنگل کے قانون سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔ غالباً کسی نے نہ مجھ سے زیادہ عرضیاں لکھی ہوں گی اور نہ مجھ سے زیادہ بیکسوں کی حمایت میں فریاد کی ہو گی لیکن میں اس قطعی نتیجے پر پہونچا ہوں کہ اگر آپ واقعی کوئی بڑی چیز چاہتے ہیں تو صرف عقل کی تسکین کرنا کافی نہیں ہے، دل پر بھی اثر ڈالنا چاہیئے۔ عقلی دلیل سے زیادہ تر دماغ متاثر ہوتا ہے، لیکن دل میں جو چیز اُترتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان تکلیف اٹھائے۔ اس سے دیکھنے والوں کی چشم بصیرت کھل جاتی ہے۔ نوع انسانی کا طغرائے امتیاز تلوار نہیں بلکہ تکلیف اٹھانا ہے۔

مہاتما گاندھی اور میڈم مانٹیسوری کی ملاقات اہل دل کی روحانی صحبت کا مرقع ہے۔ یہ خاتون اس سے اس درجہ متاثر ہوئیں کہ لکھتی ہیں "گاندھی مجھے انسان نہیں، روح محض معلوم ہوتے ہیں۔ سالہا سال سے ان کا خیال میرے دل میں بسا ہوا تھا۔ میں ان سے دور تھی، مگر میری روح ان کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ ان کی خوش خوئی اور نرمی کو دیکھ کر دل یہ کہتا تھا کہ دنیا میں درشتی اور سختی کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ اس بے تکلفی سے، ایسے کھلے دل سے ملے گویا ان کے لئے کوئی رکاوٹ کوئی قید نہیں۔ ان کا روحانی اثر سورج کی کرنوں کی طرح بلا واسطہ پڑ رہا تھا اور اس میں وہی گرمی، وہی تیزی تھی مجھے خیال ہوا کہ اس محترم بزرگ سے ان معلموں کو بہت فیض پہنچ سکتا ہے جن کی میں تربیت کر رہی ہوں معلم کے لئے ضروری ہے کہ صاف دل اور عالی ظرف ہو اور طبیعت کو اس طرح بدلے کہ بڑوں کی پرشور دنیا سے، جس میں انسانی زندگی کو قدم قدم رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے نکل کر بچوں کی دنیا میں پہنچ جائے۔ خدا کرے ان کی صحبت سے ہمارے معلموں کو اس مقصد میں مدد ملے کہ روحانی وسائل سے انسانوں کے دل میں بچپن کی معصومیت قایم رکھیں۔"

ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لئے گدوں اور تکیوں کا انتظام تھا۔ اور اسلنگٹن کے غریبوں کے حلقے کے چھوٹے چھوٹے لڑکے، پیارے پیارے، صاف ستھرے، فرشتوں کی طرح معصوم سادہ لباس پہنے، ننگے پیر، گاندھی جی کو بالکل ہندوستانی طریقے سے نمسکار کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان بچوں نے ہمیں نرت کرتب[1]، باجا بجانے، اور توجہ اور ارادے کے چھوٹے چھوٹے کام

---

[1] rhythmical exercises.

دکھائے۔ اور پھر خاموشی میں اپنا کمال دکھا دیا جو ان چیزوں سے کم نہ تھا۔ جتنے لوگ موجود تھے سب پر بہت اثر ہوا۔

میڈم مانٹیسوری کو ان بچوں کے مجمع میں، جو تمام مخلوقات سے بڑھ کر اپنے خالق سے قریب بلاتے ہیں، دیکھنے سے بچوں کی ایک آزاد دنیا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ میڈم مانٹیسوری تعلیم کے جو حوصلے رکھتی ہیں۔ وہ پورے نہ بھی ہوں تو ان کی یہ خدمت نوع انسانی کے لئے کچھ کم نہیں، کہ اُنھوں نے معلموں کو اور والدین کو بچوں کی قابل احترام صفات کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ میم صاحب نے میٹھی اور سُریلی اطالوی زبان میں گاندھی جی کا خیر مقدم کیا اور ان کے سکرٹری نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا۔ اس ترجمے ہی کو پڑھ کر انسان کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے :-

"میں اپنے شاگردوں کو اور دوسرے صاحبوں کو، جو یہاں موجود ہیں، مخاطب کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سے ایک بہت بڑی بات کہنا ہے۔ آج ہمارے درمیان گاندھی کی روح، وہ مہاآتما جس سے ہر شخص خوب واقف ہے، مجسم موجود ہے۔ یہ آواز، جسے سننے کا شرف ہمیں حاصل ہو گا، وہ آواز ہے جو ساری دنیا میں گونجتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محبت سے کہتے ہیں اور اپنا پیام صرف اسی آواز سے نہیں، بلکہ اپنی ساری زندگی سے ادا کرتے ہیں یہ ایسی انوکھی چیز ہے کہ جب اس کا موقع آتا ہے تو ہر شخص کان لگا کر سنتا ہے۔"

"میرے محترم گرو! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ وہ آواز جسے آج آپ کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا ہے، لاطینی نسل کے ایک فرد کی آواز ہے۔ یہ اس عظیم الشان شہر روما کی آواز ہے جو مغرب کے مذہبی خیالات کا گہوارہ ہے۔ کاش میں یہاں مغرب کے افکار اور زندگی کو مجسم کر کے مشرق کی خدمت میں پیش کر سکتی!

اس وقت میں اپنے شاگردوں کو آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ ان کے علاوہ ان کے دوست، ان کے دوستوں کے دوست اور عزیز بھی یہاں جمع ہیں۔ میرے شاگردوں میں بہت سی قوموں کے لوگ ہیں۔ یہاں انگلستان کے فراخدل علم جمع ہیں۔ ہندوستان، اطالیہ، ہالستان، جرمنی، ڈنمارک سوئیڈن، چکوسلوواکیا، آسٹریا، ہنگری، امریکا، آسٹریلیا، نیوزلستان، جنوبی افریقہ، کناڈا اور آئرستان کے طالب علم موجود ہیں:

اے میرے گرو! عالمگیر تمدن اور بچوں کی محبت، یہی وہ کڑیاں ہیں جو ہم سب کو جوڑتی ہیں اور جن کی بدولت ہم سب آپکے سامنے حاضر ہیں۔ ہم بچوں کو زندگی بسر کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ روحانی زندگی بسر کرنا جس کے سوا کسی اور چیز پر عالمگیر امن کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ طالب علم یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اس شخص کی آواز سنیں جو زندگی کے فن کا استاد ہے۔ اور ہم سب کے لئے جن میں طالب علم بھی شامل ہیں اور ان کے دوست بھی، آج کا دن عمر بھر یادگار رہے گا۔ یہ چوبیس چھوٹے چھوٹے انگریز بچے جنھوں نے آپ کے لئے کام کیا ہے اور تیاری کی ہے، آنے والی نسلوں کی جیتی جاگتی نشانیاں ہیں۔ ہم سب آپ کی آواز کے منتظر ہیں۔"

اس تقریر کا یہ زبردست اثر پڑا کہ اس نے مضراب بن کر گاندھی جی کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ جن سے وہ نغمہ پیدا ہوا جو اس موقع کے شایان شان تھا۔ یہ ساری دنیا کے بچوں اور ان کے والدین کے لئے پیام بھی تھا اور آزادی کا منشور بھی۔ میں اسے حرف بہ حرف نقل کرتا ہوں۔

"خاتون محترم، آپ کے الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ میں نہایت عاجزی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی ذات کو

سراپا محبت بنانے کی بُری بھلی کوشش جو مجھ سے ہوسکتی ہے کرتا ہوں میرے دل سے لگی ہے کہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کردں۔ میرے نزدیک وہ عین حق ہے اور مجھ پر اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ اگر حق کی معرفت حاصل کرنا ہے تو مجھے چاہیئے کہ محبت کے قانون پر چلوں۔ چاہے اس میں میری جان بھی کام آجائے اور چونکہ خدا نے مجھے بچے عطا کئے ہیں اس لئے مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محبّت کا قانون جیسی اچھی طرح چھوٹے بچوں سے سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے کسی اور طریقے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ بچوں میں خلقی طور پر وہ شرارت نہیں ہوتی جو بُری کہی جاسکے۔ اگر والدین بچے کی نشو ونما کے زمانے میں، یعنی اس کی پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد اچھا سبھاؤ رکھیں تو یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بچہ خود بخود حق کے قانون اور محبت کے قانون پر چلے گا۔ میں آپ کے سامنے یہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ میری پرشور زندگی میں کیا کیا دور گذرے ہیں۔ لیکن میں سچائی اور عاجزی سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ جس حد تک میں نے اپنی زندگی کے اندر خیال، قول اور فعل میں محبت کو برتا اسی حد تک مجھے "وہ سکون قلب جو حد ادراک سے باہر ہے" حاصل ہوا۔ میرے دوست اکثر میرے سکون قلب کو دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔ وہ مجھ پر رشک کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ انمول چیز کیسے پائی میں انھیں اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکا کہ جو سکون آپ کو میرے دل میں نظر آتا ہے وہ میری اس کوشش کی بدولت ہے کہ محبت کے قانون پر، ہماری فطرت کا سب سے برتر قانون ہے، عمل کروں۔

مجھے آپ کے کام سے پہلے پہل ۱۹۱۵ء میں جب میں جنوبی افریقہ

سے ہندوستان پہنچا، واقفیت ہوئی۔ ایک مقام پر جو امریلی کہلاتا ہے، میں نے مانٹیسوری طرز کا ایک چھوٹا سا مدرسہ دیکھا۔ آپ کا نام میں اس سے پہلے بھی سن چکا تھا۔ مجھے فوراً پتہ چل گیا کہ مدرسہ میں آپ کی تعلیم کا ڈھانچہ تو موجود ہے مگر وہ روح سے خالی ہے اگرچہ کوشش کم و بیش دیانتداری سے ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ظاہری ٹیم ٹام بہت تھی۔

"اس کے بعد میں نے اس طرز کے اور مدرسے دیکھے اور جوں جوں میرا سابقہ ان سے بڑھتا گیا مجھے یہ اندازہ ہوتا گیا کہ ان کا اصول بڑا اچھا اور بڑا شاندار ہے۔ بہ شرطیکہ بچوں کو قانون فطرت کے مطابق تعلیم دی جائے وہ فطرت جس میں انسانیت کی شان ہے، وہ نہیں جو بہائم کے اندر پائی جاتی ہے۔ میں نے بچوں کی تعلیم کا طریقہ دیکھ کر خود بخود یہ سمجھ لیا کہ اگرچہ تعلیم جس طرح دی جا رہی ہے قابل اطمینان نہیں ہے لیکن اس کا اصل، خاکہ ضرور اس بنیادی قانون کے مطابق ہوگا۔ اس کے بعد مجھے آپ کے کئی شاگردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں سے ایک نے تو اٹلی کی زیارت کر کے آپ کی قدمبوسی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ مجھے ان بچوں سے اور آپ سب لوگوں سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ان کا تھوڑا سا حال پہلے سے معلوم کر لیا تھا۔ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے برمنگھم میں ہو چکا ہے وہاں کے مدرسے میں اور اس مدرسے میں فرق ہے۔ مگر وہاں بھی مجھے یہی نظر آیا کہ انسانی فطرت بیتابی سے اظہار کی راہ ڈھونڈھ رہی ہے اور یہاں بھی میں نے یہی چیز دیکھی۔ میرے لئے یہ نہایت مسرت کی بات ہے کہ ان بچوں کو بچپن سے خاموشی کی خوبیاں سمجھائی جاتی ہیں۔ ابھی اپنے معلم کی ایک جنبش لب میں یہ لڑکے

کس خاموشی سے ایک ایک کرکے آگے آئے تھے ! مجھے ان کے خوشنما نرت کرتب بہت پسند آئے اور جب میں ان کی یہ خوش فعلیاں دیکھ رہا تھا تو مجھے ہندوستان کے دیہات کے کروروں بھوکے بچوں پر بڑا قلق آیا اور میں نے اپنے دل میں کہا کیا یہ ممکن ہے کہ ہیں ان بچوں کو بھی وہ تربیت دے سکوں جو آپ کے طریقے کے مطابق یہاں کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ ہم بھی ہندوستان کے غریب سے غریب بچوں کی تعلیم کے تجربے کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہمیں کہاں تک کامیابی ہو گی۔ مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ان بچوں کو جو چوہے کے سے بلوں میں رہتے ہیں، سچی جاندار تعلیم دی جائے مگر اس کے مادی وسائل ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

لے دے کے ہمیں معلموں کی رضا کارانہ مدد کا آسرا ہے۔ لیکن جب میں معلموں کی تلاش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم ہیں۔ خصوصاً اس قسم کے معلم جن کی ضرورت ہے کہ ہمدردی سے ہر بچے کی طبیعت کا مطالعہ کرکے اسے اپنے بل کھڑا کرکے، اسے ذاتی عزت کا احساس دلا کر اس کی بہترین صفات کو ابھاریں۔ آپ یقین کیجئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے دل میں مجھ سے اور آپ سے زیادہ عزت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ہم عجز و انکسار سے کام لیں، تو ہم زندگی کے بڑے بڑے سبق سن رسیدہ اور عالم فاضل حضرات سے نہیں بلکہ انھیں بچوں سے جو نادان کہلاتے ہیں، سیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے اقوال میں یہ قول سب سے بلند و برتر حقیقت رکھتا ہے کہ حکمت شیر خوار بچوں کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے اور میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ اگر ہم شیر خوار بچوں کے سامنے عاجزی اور معصومیت کے ساتھ جائیں تو ہم ان سے حکمت کے نسخے سیکھ سکتے ہیں۔

اب آپ کا زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں۔ میں نے آپ کے سامنے بس وہی بات کہی ہے جو اس وقت میرے دل میں چبھ رہی تھی یعنی اس نازک مسئلے کے انسانی پہلو کا ذکر کیا ہے کہ ان کروڑوں ہندوستانی بچوں کی بہترین صفات کس طرح ابھاری جائیں لیکن میں نے اگر کوئی سبق سیکھا ہے تو یہ ہے کہ جو چیز انسان کے نزدیک محال ہے وہ خدا کے آگے بچوں کا کھیل ہے۔ اگر ہم اس خالق پر اعتقاد رکھتے ہیں جو اپنے عاجز سے عاجز مخلوق کی قسمت کا خود فیصلہ کرتا ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے اور اسی آخری امید کے سہارے پر میں جیتا ہوں اور اس کی مرضی پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ جس طرح آپ بچوں کی محبت میں اپنے متعدد مدرسوں کے ذریعے ان کی بہترین صفات کو ابھارنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اسی طرح خدا چاہے گا تو ہمارے ملک میں نہ صرف دولتمندوں اور خوش حال لوگوں کے بچے، بلکہ کنگالوں کے بچے بھی اس قسم کی تعلیم پا سکیں گے۔ آپ نے بڑی سچی بات کہی کہ اگر ہم دنیا کو حقیقی امن کی تلقین کرنا اور لڑائی کے خلاف سچ مچ لڑائی لڑنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ بچوں سے ابتدا کریں۔ اگر ان کی نشو و نما فطری معصومیت کی حالت میں ہو تو ہمیں اس جد و جہد کی ضرورت ہو گی نہ بیکار ریزولیوشن پاس کرانا پڑیں گے بلکہ ہمارا ہر قدم محبت سے محبت اور امن سے امن کی طرف اُٹھے گا اور دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک امن اور محبت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ جس کی آج ساری دنیا بھوکی ہے۔ چاہے اسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔"

ضمیمۂ الف

مُعَاہدہ دہلی - ۵ مارچ ۱۹۳۱ء

ہم ذیل کی ضروری دفعات اس معاہدے سے نقل کرتے ہیں جو وائسرائے اور گاندھی جی کی باہمی گفتگو کے بعد ہوا تھا اور جس کی پابندی کے خیال سے کانگریس نے سول نافرمانی کو روک دیا تھا اور گول میز کانفرنس میں شرکت پر راضی ہو گئی تھی۔

دفعہ ۲۔ جہاں تک دستور اساسی کے مسائل کا تعلق ہے ملک معظم کی مجلس وزرا کی رضامندی سے دائرہ بحث یہ قرار دیا گیا ہے کہ گول میز کانفرنس کے اندر ہندوستان کی دستوری حکومت کے متعلق جس تجویز پر بحث ہوئی تھی اس پر مزید غور کیا جائے جس تجویز کا خاکہ وہاں پیش کیا گیا تھا اس کے اہم عناصر یہ ہیں:-

وفاقی نظام، ہندوستان کو ذمہ دار حکومت دیا جانا اور ہندوستان کے مفید مطلب تحفظات اس قسم کے مسائل میں جیسے حفاظت ملک، امور خارجہ، اقلیتوں کی حیثیت، ہندوستان کی ساکھ مالی اعتبار سے قرضوں کی ادائگی۔

دفعہ ۶۔ جہاں تک غیر ملکی اشیا کے مقاطعے کا تعلق ہے اس مسئلے کے دو پہلو ہیں ایک تو مقاطعے کی نوعیت اور دوسرے وہ طریقے جو اسے عمل میں لانے کے لیۓ اختیار کئے جائیں۔ حکومت کا خیال اس معاملے میں یہ ہے وہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کو پسند کرتی ہے اس حیثیت سے کہ یہ ایک جز ہو۔ اس معاشی اور صنعتی تحریک کا جس کا مقصد ہندوستان کی مادی حالت کی اصلاح ہے وہ اس پر چار یا ترغیب یا اشتہار کی مخالف نہیں ہے جو اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے اور افراد کی آزادی عمل اور امن عامہ میں حائل نہ ہو۔ لیکن سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں بدیسی

مال کا مقاطعہ (سوائے کپڑے کے کہ اس میں کل دیسی کپڑا شامل ہے) تمام تر نہیں، تو زیادہ تر برطانوی مال کے مقاطعے تک محدود رہا اور اس کا مقصد کھلم کھلا یہ ظاہر کیا گیا کہ سیاسی مقاصد کیلئے دباؤ ڈالا جائے۔

یہ مسلّم ہے کہ وہ مقاطعہ جس کی یہ نوعیت ہو اور اس مقصد کے لئے کیا جائے ایسی صورت میں موزوں نہیں کہ کانگریس کے نمائندے اس مباحثے میں شریک ہو رہے ہیں جو دستور اساسی کے مسائل کے متعلق آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ برطانوی ہند دیسی ریاستوں، ملک معظم کے وزرا اور انگلستان کی سیاسی پارٹیوں کے درمیان ہوگا اور جو معاہدہ ہذا کا اصل مقصد ہے اس لئے یہ طے ہوا کہ سول نافرمانی کو روکنے کے معنی ہیں برطانوی مال کا مقاطعہ بطور ایک سیاسی حربے کے ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ جن لوگوں نے سیاسی جوش کے زمانے میں برطانوی مال کا خریدنا یا بیچنا بند کر دیا ہے انھیں قطعی آزادی دی جائے کہ اگر چاہیں تو اپنا رویہ بدل دیں۔

دفعہ ۷۔ جہاں تک بدیسی مال کی جگہ دیسی مال کو رواج دینے اور نشہ کی اشیا کی فروخت روکنے کے طریقوں کا تعلق ہے وہ طریقہ استعمال نہیں کیا جائے گا جو پکٹنگ (پہرا بٹھانے) کی تعریف میں آتا ہو مگر اس حد تک، کہ جہاں تک عام قانون اجازت دیتا ہے اس پکٹنگ (پہرا بٹھانے) میں جبر، زیادتی، دھمکی، سختی، مخالفت کا مظاہرہ، راہ روکنا یا کوئی اور ایسی حرکت نہیں ہوگی جو عام قانون کی رو سے جرم کہلائے۔ اگر کبھی کسی مقام پہ ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ استعمال کیا جائے تو وہاں پکٹنگ (پہرا) اٹھا دیا جائے گا۔

ضمیمہ (ب)

وزیراعظم کے اعلانات

(۱)

(ذیل میں وہ اعلان درج کیا جاتا ہے جو وزیراعظم نے ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس کے ختم ہونے پر کیا تھا)

ملک معظم کی حکومت کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری مرکزی اور صوبوں کی مجالس وضع قوانین پر ہو ان شرطوں کے ساتھ جو زمانہ تغیر کے دوران میں قرضوں وغیرہ کی ادائگی اور بعض خاص معاملات کی ضمانت، کے لئے ضروری ہیں اور ان تحفظات کے ساتھ جو اقلیتوں کو اپنی آزادی اور حقوق کی حفاظت کے لئے درکار ہیں۔

دستور اساسی کے اندر زمانہ تغیر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو تحفظات رکھے جائیں ان میں ملک معظم کی حکومت اس بات کو سب سے مقدم سمجھے گی کہ محفوظ اختیارات ایسے ہوں اور اس طرح استعمال کئے جائیں کہ وہ ہندوستان کے نئے دستور کے ذریعے کامل ذمہ دارانہ حکومت حاصل کرنے میں خلل انداز نہ ہوں۔

ملک معظم کی حکومت یہ اعلان کرتے وقت اس بات کا علم رکھتی ہے کہ بعض شرطیں جو مجوزہ دستور پر عمل کرنے کے لئے ناگزیر ہیں ابھی قطعی طور پر طے نہیں ہوئی ہیں لیکن اس کا خیال ہے کہ جو کام یہاں ہو چکا ہے اس کی بنا پر یہ امید قایم کی جاسکتی ہے کہ مزید گفت وشنید سے جو اس اعلان کے بعد ہوگی اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

ملک معظم کی حکومت اس بات کو سمجھتی ہے کہ کانفرنس کے مشورے اس اصول پر مبنی ہیں اور اسے سب نے تسلیم کرلیا ہے کہ مرکزی حکومت سارے ہندوستان کا ایک وفاقی نظام ہو جس میں ہندوستانی ریاستیں اور برطانوی ہند دونوں شامل ہوں اور اس کی مجلس وضع قوانین دو ایوان رکھتی ہو۔
وفاقی حکومت کی صحیح شکل اور ترتیب والیان ریاست اور برطانوی ہند کے نمائندوں سے مزید گفتگو کرنے کے بعد طے ہونا چاہیئے۔ اس کے دائرہ اختیار میں جو امور ہوں گے ان پر بھی ابھی اور بحث ہوگی کیونکہ وفاقی حکومت کو ریاستوں کے صرف ان معاملات پر اختیار ہوگا جو والیان ریاست وفاقی نظام میں داخل ہوتے وقت معاہدے کی رو سے اس کے حوالے کردیں۔
ریاستوں اور وفاقی حکومت کے تعلقات اس بنیادی اصول کے ماتحت رہیں گے کہ ان تمام معاملات میں جو وہ وفاقی حکومت کے حوالے نہ کریں ان کا تعلق وائسرائے کے واسطے سے ملک معظم سے رہے گا۔
جب مجلس وضع قوانین کی تشکیل وفاقی اصول پر ہوگی تو ملک معظم کی حکومت اس اصول کو تسلیم کرلے گی کہ عاملہ مجلس مقننہ کے آگے جواب دہ ہو۔
موجودہ حالات میں حفاظت ملک اور امور خارجہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں محفوظ رکھے جائیں گے اور اسے وہ اختیارات دئیے جائیں گے، جو ان امور کے انتظام کے لئے درکار ہوں۔ اس کے علاوہ چونکہ گورنر جنرل کو یہ قوت حاصل ہونا چاہیئے کہ ضرورت کے وقت ریاست میں امن قائم رکھے اور اسی کو اس کا ذمہ دار ہونا چاہیئے کہ اقلیتوں کو دستور اساسی میں جو حقوق دیئے گئے ہیں ان پر عمل درآمد کیا جائے اس لئے اس کو ان مقاصد کے لئے بھی اختیارات دیئے جائیں گے۔

جہاں تک مالیات کا تعلق ہے، مالی اختیارات کے منتقل کرنے سے پہلے بعض ایسی شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے جن سے یہ اطمینان ہو جائے کہ وزیر ہند کے حکم سے جو قرضے وغیرہ لئے گئے ہیں وہ ادا کئے جائیں گے اور ہندوستان کا مالی استحکام اور اس کی ساکھ قایم رکھی جائے گی۔ دستور اساسی کی رپورٹ میں اس مسئلے کو حل کرنے کی بعض صورتیں بتائی گئی ہیں، جن میں محفوظ بینک قرضوں کی تحویل اور مبادلے کی پالیسی شامل ہے جس کا حکومت کے نزدیک کسی نہ کسی شکل میں نئے دستور میں ہونا ضروری ہے۔

یہ چیز ہندوستان میں ہر فریق کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، کہ ملک کی ساکھ قایم رکھنے کے لئے یہ شرائط منظور کرلی جائیں۔ ان شرائط کے ساتھ ہندستان کی حکومت کو مالگذاری کے معاملات میں اور ان مصارف میں جو امور منتقلہ[1] کے متعلق ہوں گے کامل اختیارات حاصل ہوں گے۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ موجودہ صورت میں مرکزی مقننہ اور عاملہ میں جن کو دستور اساسی کی ترتیب میں کھپانا پڑے گا۔

ایسی صورت میں بعض اختیارات کا محفوظ ہونا ضروری ہے اور سچ پوچھئے تو اکثر آزاد دستور اساسی ایسے ہیں جن کی نشو ونما میں اس قسم کے محفوظ اختیارات عارضی طور پر رکھے جاچکے ہیں۔ لیکن اس کی پوری پوری کوشش ہونا چاہیے کہ ان کے استعمال کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔ مثلاً یہ کوئی اچھی بات نہیں، کہ وزرا گورنر جنرل کے خاص اختیارات کے بھروسے پر ان ذمہ داریوں سے پہلو بچائیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں اور ان اختیارات سے کام لے کر جو خاص خاص موقعوں کے لئے اٹھا رکھے گئے ہیں، ذمہ دارانہ حکومت کی نشو ونما میں حائل ہوں

---

[1] transferred subjects

یہ بات اچھی طرح صاف ہو جانا چاہیئے۔

گورنروں کے ماتحت جو صوبے ہیں ان کی تشکیل کامل ذمہ داری کے اصول پر ہوگی۔ ان کے وزرا مجلس وضع قوانین سے لئے جائیں گے اور مشترکہ طور پر اس کے آگے جواب دہ ہوں گے۔ صوبہ وارانہ امور کا دائرہ اتنا وسیع رکھا جائے گا کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو سکے۔ وفاقی حکومت کے اختیارات وہیں تک محدود ہوں گے جہاں تک وفاقی امور کے انتظام کے لئے یعنی ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے ضروری ہے جو دستور اساسی میں تمام ہندوستان کے متعلق قرار دیئے گئے ہوں۔

گورنر کے حق میں بس صرف اتنے ہی اختیارات محفوظ ہوں گے جو غیر معمولی صورتوں میں حفظ امن کے لئے اور سرکاری ملازموں اور اقلیتوں کے قانونی حقوق کی ضمانت کے لئے اشد ضروری ہوں۔

آخری چیز یہ ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے نزدیک ذمہ دارانہ حکومت کا اقتضا ہے کہ مجالس وضع قوانین کے اراکین کی تعداد بڑھائی جائے اور رائے دہندوں کا حلقہ بھی وسیع کیا جائے۔

دستور اساسی کی ترتیب میں ملک معظم کی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اس قسم کی شرائط رکھے جس سے اقلیتوں کے لئے سیاسی نمائندگی کے علاوہ اس کی ضمانت ہو جائے کہ صرف مذہب، نسل، فرقے یا ذات کے اختلاف کی بنا پر کوئی شخص ملکی حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

ملک معظم کی حکومت کے نزدیک مختلف فرقوں کا یہ فرض ہے کہ جو مسائل اقلیتوں کی سب کمیٹی میں چھڑے تھے مگر طے نہ ہو پائے ان کے متعلق آپس میں کوئی تصفیہ کرلیں۔ اس گفت وشنید کے سلسلے میں جو اس کے بعد ہوگی یہ تصفیہ ہو جانا

چاہیئے اور حکومت اس معاملے میں جو کچھ مدد کر سکتی ہے کرتی رہے گی۔ کیونکہ اسے نہ صرف اس کی فکر ہے کہ نیا دستور اساسی جلد سے جلد جاری ہو جائے بلکہ اس کی بھی ہے کہ اس کا آغاز تمام فرقوں کی رضامندی اور اعتماد کے ساتھ ہو۔

ان مختلف سب کمیٹیوں نے جو ہندوستان کے مناسب حال دستور اساسی کے اہم تر مسائل پر غور کرتی رہی ہیں اس موضوع کے بہت بڑے حصے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور جن چیزوں کا اب تک تصفیہ نہیں ہوا تھا وہ تصفیے سے زیادہ قریب ہو گئی ہیں۔ مگر ملک معظم کی حکومت نے کانفرنس کی نوعیت اور وقت کی کمی کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ جو کچھ کام ہو چکا ہے، اور مشکلات کو رفع کرنے کی جو تدابیر سوچی گئی ہیں انھیں فی الحال ملتوی کر دے۔ حکومت بلا توقف کسی ایسی تجویز پر غور کرے گی جس کے ذریعے سے ہمارا اتحاد عمل جاری رہے تاکہ ہمارے مکمل کام کا نتیجہ ہندوستان کے نئے دستور اساسی کی شکل میں نظر آ سکے۔ اگر اس عرصے میں اس اپیل کا کچھ اثر ہو جو وائسرائے نے ان لوگوں سے جو آج کل سول نافرمانی میں مصروف ہیں اور دوسروں سے کیا ہے، اور وہ اس اعلان کے عام اصولوں کی بنا پر ہمارے ساتھ اتحاد عمل کرنا چاہیں تو ان کی مدد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔

میرا فرض ہے کہ حکومت کی طرف سے اس خدمت کا تہ دل سے اعتراف کروں جو آپ نے یہاں تشریف لا کر اور اس ذاتی گفت و شنید میں حصہ لے کر نہ صرف ہندوستان کی بلکہ ہمارے ملک کی بھی انجام دی ہے۔ ذاتی ملاقات ان افسوسناک اختلافات اور غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی بہترین تدبیر ہے، جو اس زمانے میں دونوں طرف کے بہت سے لوگ پھیلا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی نیت، اور ایک دوسرے کی مشکلات کا اندازہ جو ایسی صورتوں میں ہو جاتا

ہے۔ اختلافات کو مٹانے اور مطالبات کو پورا کرنے کی تدابیر سوچنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ ملک معظم کی حکومت یہ کوشش کرے گی کہ آپس میں اس حد تک اتفاق رائے ہو جائے کہ نیا دستور اساسی برطانوی پارلیمنٹ میں منظور ہو کر دونوں ملکوں کے لوگوں کی عملی ہمدردی کے ساتھ جاری ہو جائے۔

(۲)

(ذیل میں وہ بیان درج ہے جو وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے ختم ہونے کے دن یعنی یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو کانفرنس کے سامنے دیا تھا)

۱۔ اب گول میز کانفرنس کے دو اجلاس ہو چکے ہیں اور وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس اہم کام کا جائزہ لیں جو کانفرنس نے انجام دیا ہے اس کام کا ایک پہلو تو ان مسائل کو پیش کرنا ہے جو ہمیں ہندوستان کے دستور اساسی کی ترتیب میں حل کرنا پڑیں گے اور دوسرے انھیں حل کرنے کی تدابیر سوچنا۔ جو رپورٹیں ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں انھوں نے ہمیں اس راہ کی جسے ہم سب مل کر طے کر رہے ہیں، دوسری منزل تک پہنچا دیا ہے۔ اب ہمیں ایک جگہ ٹھہر کر یہ دیکھنا ہے کہ ہم نے کیا کیا کر لیا ہے۔ کن کن رکاوٹوں کو دور کیا ہے اور جو کام باقی ہے اسے جلد سے جلد بہ خیر و خوبی انجام دینے کے کیا طریقے ہیں۔ میرے نزدیک ہمارے آپس کے مباحثے اور ملاقاتیں بڑی قدر و قیمت رکھتی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ان کی بدولت ہندوستان کے دستور اساسی کی ترتیب کا مسئلہ وضع دستور کی اصطلاحی بحثوں کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اس لئے کہ ہم میں باہمی عزت و اعتماد کے وہ تعلقات پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے ہمارے کام کو پر امید سیاسی اتحاد عمل کا رنگ دے دیا ہے۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ یہ صورت آخر تک قایم رہے گی۔ بس اتحاد عمل ہی ایک ذریعہ ہماری کامیابی کا ہے۔

۲۔ اس سال کے آغاز میں میں نے حکومت وقت کی پالیسی کا اعلان کیا تھا اور مجھے موجودہ حکومت کی طرف سے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ آپ حضرات کو اور ہندوستان کو صریح الفاظ میں یقین دلاؤں کہ اس کی بھی یہی پالیسی ہے۔ میں

اس اعلان کے خاص خاص جملوں کو یہاں نقل کرتا ہوں :-

ملک معظم کی حکومت کی رائے ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری مرکزی اور صوبہ دار مجالس وضع قوانین کی طرف منتقل کردی جائے ان شرائط کے ساتھ جو زمانہ تغیر میں قرضوں وغیرہ کی ادائگی اور دوسرے مخصوص امور کا بندوبست کرنے کے لئے ضروری ہیں اور ان تحفظات کے ساتھ جو اقلیتوں کو اپنے سیاسی حقوق کی تامین کے لئے درکار ہیں۔

"ان دستوری تحفظات میں جو زمانہ تغیر کے دوران میں قائم رکھے جائیں گے ملک معظم کی حکومت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھے گی کہ محفوظ اختیارات اس طرح تجویز کئے جائیں اور عمل میں لائے جائیں کہ ہندوستان کو نئے دستور کے ذریعے کامل ذمہ دارانہ حکومت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

۳۔ مرکزی حکومت کے بارے میں میں نے اس بات کو صاف کردیا تھا، کہ بعض معینہ شرائط کے ساتھ ملک معظم کی حکومت اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے کہ عاملہ مجلس مقننہ کے آگے ذمہ وار ہو اگر دونوں کی تشکیل کل ہندوستان کے نظام وفاقی کی بنا پر ہوئی ہو۔ ذمہ وار حکومت کے ساتھ یہ قید لگائی گئی تھی کہ موجودہ حالات میں ملک کی حفاظت اور امور خارجہ کے اختیارات گورنر جنرل کے لئے محفوظ ہوں اور مالیات میں ایسی شرائط رکھی جائیں کہ جو قرضے وغیرہ ذریعہ ہند کے حکم سے لئے گئے ہیں ان کو ادا کرنے اور ہندوستان کا مالی استحکام اور اس کی ساکھ قائم رکھنے کی ضمانت ہو جائے۔

۴۔ اس کے علاوہ ہماری رائے یہ تھی کہ گورنر جنرل کو ضروری اختیارات ملنا چاہئیں کہ وہ اقلیتوں کے لئے دستوری حقوق حاصل کرنے کے معاملے میں اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اور جب موقع پڑجائے تو ملک میں امن قائم

رکھ سکیں۔

۵۔ یہ ہے خلاصہ ہندوستان کے نئے دستور کا جو گذشتہ کانفرنس کے اختتام کے وقت ملک معظم کی حکومت کے پیش نظر تھا

۶۔ جیسا میں کہہ چکا ہوں۔ جو حضرات موجودہ حکومت میں میرے رفیق ہیں وہ میرے گذشتہ جنوری کے اعلان کو پوری طرح قبول کرتے ہیں اور جو پالیسی اس میں ظاہر کی گئی تھی اسے اپنی پالیسی قرار دیتے ہیں۔ خصوصاً وہ اس کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے نزدیک بھی تمام ہندوستان کا وفاقی نظام ہی وہ چیز ہے جس سے ہندوستان کے دستور اساسی کی مشکل حل ہوسکتی ہے۔ وہ استقلال کے ساتھ اس تجویز پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کرنے میں اپنا پورا زور لگا دیں گے۔ اس اعلان کو پوری پوری ذمہ دارانہ حیثیت دینے کی غرض سے میرا بیان سرکاری یادداشت کے طور پر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں گشت لگائے گا اور اسی ہفتہ حکومت پارلیمنٹ سے اس کی منظوری کی درخواست کرے گی۔

۷۔ گذشتہ دو مہینے میں جو مباحثہ ہوتا رہا ہے اس سے یہ فائدہ ہو چکا کہ ہم حل طلب مسائل سے زیادہ صحت کے ساتھ واقف ہو گئے اور ان میں سے بعض کے حل کرنے کی طرف ہم نے قدم بڑھایا۔ مگر اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ بعض مسائل اور گہرے مطالعے کے محتاج ہیں اور ہم سب کو مل کر ان پر مزید غور کرنا چاہیئے۔ مثلاً وفاقی مجلس وضع قوانین کی ترکیب اور اختیارات کے بارے میں ابھی تک اختلاف رائے ہے اور مجھے افسوس ہے کہ اس بنیادی مسئلے کے طے نہ ہوسکنے کے سبب سے کہ ذمہ دارانہ مرکزی حکومت کے ماتحت اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کیونکر ہوگی۔ کانفرنس

اس پر پوری طرح غور نہیں کرسکی کہ وفاقی عاملہ کی نوعیت کیا ہوگی اور اس کا تعلق مقننہ سے کیا رہے گا۔ اسی طرح ابھی تک ریاستیں آپس میں یہ طے نہیں کر پائیں کہ وفاقی نظام کے اندر ان کی جگہہ کیا ہوگی اور ان میں باہم کیسا تعلقات ہوں گے۔ وہ مقصد جو ہم سب کے پیش نظر ہے اس طرح حاصل نہیں ہوسکتا کہ ہم ان واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں یا یہ سمجھ لیں کہ ان میں جو مشکلات ہیں وہ کسی طرح آپ ہی حل ہو جائیں گی کہ مجمل اور کلی مقاصد سے ایک قابل عمل دستور اساسی کا مفصل نقشہ مرتب کرنے کے لئے ابھی مزید غور و فکر، بحث مباحثے، اور مختلف خیالات میں مصالحت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ بات ناممکن ہے یا ہمارا کام بند ہو جائے گا۔ میں تو آپ کو صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے ایسے کام میں ہاتھ ڈالا ہے جو ملک معظم کی حکومت اور ہندوستانی لیڈروں دونوں سے احتیاط، ہمت اور فرصت کا طالب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے انجام پانے کے بعد الجھن اور مایوسی ہو اور سیاسی ترقی کا رستہ کھلنے کے بجائے بالکل بند ہو جائے ہمیں ہوشیار کاریگروں کی طرح اچھا اور پکا کام کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کے جو حقوق ہم سب پر ہیں وہ ہم سے اس بات کے طالب ہیں۔

۸۔ اب سوال یہ ہے کہ جو مقاصد ہم سب کے پیش نظر ہیں انھیں حاصل کرنے کا عملی پروگرام کیا ہے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ عام الفاظ میں کوئی اور اعلان کروں۔ اس سے کام نہیں چلتا۔ جو اعلان پہلے ہو چکا ہے اور جس کا آج اعادہ کیا گیا ہے، وہ اس کے لئے کافی ہے کہ ہمیں حکومت کی نیک نیتی کا یقین دلادے اور جن

کمیٹیوں کا میں ذکر کروں گا ان کے اصول عمل کا کام دے۔ میں تو بس کام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کل ہندوستان کے وفاقی نظام کی عظیم الشان تجویز اب تک موجود ہے۔ یہ اصول کہ ذمہ دار وفاقی حکومت ہو جس کے ساتھ دورِ تغیر میں بعض تحفظات کی شرط رکھی جائے بدستور قایم ہے۔ اس پر بھی ہم سب متفق ہیں کہ آئندہ ان صوبوں میں جو گورنروں کے ماتحت ہوں ذمہ دار حکومت ہو وہ اپنے دائرۂ عمل میں اپنی پالیسی اختیار کرسکیں اور بیرونی مداخلت سے جتنے زیادہ آزاد رہ سکیں رہیں۔

۹۔ اس آخری نکتے کے سلسلے میں مجھے اسی جگہ یہ تصریح کردینا چاہیئے کہ ہماری تجویز ہے کہ نئے نظام میں صوبہ سرحدی دوسرے گورنری صوبوں کے مساوی گورنری صوبہ بنا دیا جائے البتہ اس میں سرحد کی مخصوص ضروریات کا لحاظ رکھا جائے اور دوسرے صوبوں کی طرح یہاں بھی گورنر کو حفظ امن کے لئے معقول اور مؤثر اختیارات دیئے جائیں۔

۱۰۔ ملک معظم کی حکومت اصولاً اس تجویز کو قبول کرتی ہے کہ سندھ ایک علحدہ صوبہ بنا دیا جائے بشرطیکہ اس کی مالیات کا کوئی قابل اطمینان انتظام ہو جائے اس لئے ہماری تجویز ہے کہ حکومت ہند سندھ کے نمائندوں سے مشورہ کرکے ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے جس کی طرف ماہرین فن کی کمیٹی نے اپنی تازہ رپورٹ میں توجہ دلائی ہے۔

۱۱۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد میں اصل مسئلے پر آتا ہوں کہ مسلّمہ اصول کے ماتحت عملی پروگرام کیا ہونا چاہیئے۔ مسلّمہ اصول یہ ہیں :-

ہمارا مقصود وفاقی نظام ہے اور اس کا اساس صوبوں کی اور ریاستوں کی خود مختاری۔ میں کہہ چکا ہوں، کہ ہمارے آپس کے مباحثوں سے ثابت ہوگیا

کہ وفاقی نظام مہینے دو مہینے میں قایم نہیں ہونے کا۔ ابھی بہت کچھ تعمیری کام
باقی ہے اور بہت سے اہم معاملات پر اتفاق رائے ہونے کی ضرورت ہے
کہ یہ تعمیر تکمیل اور استحکام کو پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اس کے مقابلے میں صوبوں
کی ذمہ دارانہ حکومت کا نظام ترتیب دینا آسان کام ہے اور جلد انجام
پا سکتا ہے۔ جو اختیارات اب مرکزی حکومت کو حاصل ہیں، ان میں یقیناً
ترمیم و تغیر کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے بغیر صوبوں کو حقیقی خود مختاری حاصل نہیں
ہو سکتی۔ مگر اس میں کوئی ایسی مشکلات حائل نہیں ہیں جو حل نہ ہو سکیں۔ اس
لئے حکومت سے بہ اصرار کہا گیا تھا کہ وفاقی نظام کے حاصل کرنے کا سب سے
اچھا اور سب سے قریب کا راستہ یہی ہے کہ ان تجاویز پر فوراً عمل کیا جائے
اور صوبوں کو کامل ذمہ دارانہ حکومت دینے میں ایک دن کی بھی ضرورت
سے زیادہ دیر نہ ہو۔ مگر یہ بھی معلوم ہے کہ کسی جزوی اصلاح کو آپ لوگ
پسند نہیں کرتے۔ آپ نے اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا ہے کہ دستور اساسی
میں جو کوئی تبدیلی ہو وہ ایک ہمہ گیر قانون کے ذریعے سے ہو جس میں سب
باتیں آجائیں اور ملک معظم کی حکومت یہ نہیں چاہتی کہ زبردستی آپ کو
(صوبہ وار) ذمہ دارانہ حکومت دیدے۔ جسے آپ خواہ کسی وجہ سے بھی ہو
فی الحال قبل از وقت اور نامناسب سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ رائے بدلے اور
واقعات میں تغیر ہو اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ اسی وقت قطعی فیصلہ کر دیا
جائے ہم اپنی طرف سے پہلے بھی چاہتے تھے اور اب بھی چاہتے ہیں کہ نظام
وفاقی کی تجویز کو جلد سے جلد عمل میں لائیں۔ بہرحال یہ کسی طرح جائز نہیں،
کہ جو فیصلہ اس وقت ہوا ہے وہ صوبہ سرحد کی فوری دستوری اصلاحات میں
حائل ہو اس لئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جب تک نیا دستور جاری ہو، اس

وقت تک کے لئے صوبہ سرحد میں گورنری صوبوں کا موجودہ قانون فوراً نافذ کر دیا جائے۔

۱۴۔ البتہ یہ ہم سب کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ترقی کی راہ میں خواہ وہ صوبے کی ہو یا مرکز کی ایک زبردست رکاوٹ ہے اور وہ فرقہ وارانہ مسائل کی گتھی ہے۔ مجھے یقین ہے اور میں نے اپنے اس خیال کو آپ سے چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ یہ مسئلہ خاص طور پر آپ حضرات کے آپس میں طے کرنے کا ہے۔ ایک خود مختار کا سب سے پہلا حق اور سب سے پہلا فرض اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ جمہوری نمائندگی کا اصول کس طرح عمل میں آئے یعنی کن لوگوں کی نمایندگی ہو اور کس طرح ہو۔ اس کانفرنس نے دو بار اسے طے کرنے کی کوشش کی اور دونوں دفعہ ناکامیاب رہی۔ میرے خیال میں آپ ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ ہم ان ناکامیوں کو بالکل قطعی سمجھ لیں۔

۱۵۔ مگر وقت بہت کم ہے ہم بہت جلد دیکھیں گے کہ اگر اس مسئلے کا کوئی تصفیہ جو سب فرقوں کے لئے قابل قبول ہو نہ ہوا جس کی بنیاد پر ہم آگے کام کر سکیں تو ہمارے مقاصد میں رکاوٹ پیش آئے گی بلکہ سچ پوچھئے تو ابھی سے پیش آرہی ہے۔ اس صورت میں ملک معظم کی حکومت اس پر مجبور ہوگی کہ ایک عارضی تجویز پر عمل کرے کیونکہ اس نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس وقت کو بھی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے دے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک معظم کی حکومت نہ صرف آپ کی نمائندگی کے مسائل کا تصفیہ کرے گی بلکہ جہاں تک ممکن ہے دانشمندی اور انصاف کے ساتھ یہ بھی طے کر دے گی کہ اصول جمہوریت کے بے قید اور خلاف انصاف استعمال سے جس کی بدولت اکثریت کو کل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اقلیتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے دستور اساسی میں روک تھام

کی کیا کیا صورتیں ہونا چاہئیں۔ یہ میں آپ سے کہہ دیتا ہوں کہ اگر حکومت کو عارضی طور پر بھی آپ کے دستور کا یہ حصہ مرتب کرنا پڑا جو آپ خود نہیں کر سکتے تو باوجود اس کے کہ وہ پورے اہتمام سے اقلیتوں کے لئے کافی تحفظات رکھے گی تاکہ ان میں سے کسی کو بے توجہی کی شکایت نہ رہے یہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی قابل اطمینان صورت نہیں ہوگی۔ یہ بھی سُن لیجئے کہ اگر اس معاملے میں آپ کے آپس میں کوئی تصفیہ نہ ہوا تو یہاں ہر حکومت کو جو ہندوستان کے دستور اساسی کے بارے میں ہماری ہم خیال ہو بڑی مشکلیں پیش آئیں گی اور اس کی وجہ سے آپ کے دستور کا مرتبہ دوسرے ملکوں کے دستور سے گھٹ جائے گا۔ اس لئے میں آپ سے ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ آپس میں گفتگو کرنے کے جو موقعے ملیں ان سے فائدہ اٹھائیے اور کوئی فیصلہ کر کے ہمارے سامنے پیش کیجئے۔

۱۴۔ ہم بہرحال آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اب ہم اس معاملے کو جو ہمیں درپیش تھا معینہ مسائل کی صورت میں لے آئے ہیں جن کا مطالعہ سب سے پہلے ایسی جماعتوں کو نہایت غور و تعمق سے کرنا چاہیئے جو بڑی بھاری کانفرنس نہ ہوں بلکہ کمیٹیوں کی حیثیت رکھتی ہوں اس لئے ہمیں وہ ادارے قائم کرنا چاہئیں جن کی اس کام کے لئے ضرورت ہے۔ اس لئے آپ کی اجازت سے میری یہ تجویز ہے کہ باضابطہ طور پر ایک کمیٹی ترتیب دی جائے جس میں ہر خیال کے نمائندے موجود ہوں۔ یہ اس کانفرنس کی مجلس عاملہ ہو جو ہندوستان میں موجود رہے اور ہم وائسرائے کے توسط سے اس کے ساتھ برابر مبادلہ خیالات کرتے رہیں۔ میں اس وقت پوری طرح اس کا تعین نہیں کر سکتا کہ یہ کمیٹی کس طرح اپنا کام انجام دے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت

ہے اور اس کا انحصار ایک حد تک ان کمیٹیوں کی رپورٹ پر ہے جنھیں ہم قایم کرنا چاہتے ہیں۔ آخر میں ہمیں ایک بار پھر جمع ہونا پڑے گا کہ ساری اسکیم پر آخری نظر ڈالیں۔

۱۵۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ان کمیٹیوں کو فوراً مقرر کردیں جن کے تقرر کی کانفرنس نے سفارش کی ہے تاکہ وہ (الف) حق رائے دہندگی اور حلقہ ہائے انتخاب کے مسائل کی تحقیقات کریں اور ان کے متعلق مشورہ دیں۔

(ب) وفاقی مالیاتی سب کمیٹی کی سفارشات کو بجٹ کے اعداد و شمار کے لحاظ سے جانچیں۔

(ج) مالیات کی ان مخصوص مشکلات پر مزید غور کریں جو بعض بعض ریاستوں کے معاملے میں درپیش ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ یہ کمیٹیاں ہندوستان میں انگلستان کے مشہور پبلک لیڈروں کے زیر صدارت اپنا کام سال نو کے آغاز میں جس قدر جلد ممکن ہو شروع کردیں۔ یہاں آپ نے اور اہم وفاقی مسائل پر جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان پر فوراً غور کیا جائے گا اور تمام ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی کہ ان مسائل میں مفاہمت اور اتفاق رائے ہوسکے۔

۱۶۔ ملک معظم کی حکومت نے اس تجویز کو ذہن نشین کرلیا ہے جو وفاقی دستوری کمیٹی کی رپورٹ کی دفعہ ۲۶ میں اس غرض سے پیش ہوئی ہے کہ ریاستوں کو مجالس وضع قوانین میں جتنی نشستیں ملیں ان کی تقسیم کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جیسا میرے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے اور سب لوگوں کی طرح اس کمیٹی کی بھی یہ خواہش ہے کہ ریاستیں آپس میں اس مسئلے کا جلد سے جلد فیصلہ کرلیں اور ملک معظم کی حکومت انھیں اس بارے میں ہر قسم کا مشورہ دینے کو تیار رہے۔ اگر حکومت نے دیکھا کہ ان کے باہمی فیصلے میں بہت دیر ہورہی

ہے تو وہ خود ایسی تدابیر اختیار کرے گی جن سے کام چلانے کے لائق تصفیہ کرنے میں مدد ملے۔
۱۷۔ میں ایک اور امر کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جس کا آپ کی نظر میں اہم ہونا اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے۔ آپ کو یہ توقع ہوگی کہ میں اس کا ذکر کر دوں۔ فرقہ وارانہ مسئلے کا وہ حل جس کا تعلق صرف کونسلوں کی نمائندگی سے ہو ان حقوق کی حفاظت کے لئے کافی نہیں ہے جنھیں میں فطری حقوق کہتا ہوں۔ جن شرائط کا ذکر ہو چکا ہے ان کے بعد بھی اقلیتیں بدستور اقلیتیں رہیں گی اس لئے دستور اساسی میں ایسی دفعات کی ضرورت ہے جن سے ہر عقیدے اور طبقے کے لوگوں کو پورا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت کی حکومت اس طرح استعمال نہیں کی جائے گی کہ جس سے انھیں ہیئت سیاسی کے اندر اخلاقی یا مادّی نقصان پہنچ جائے حکومت اس وقت یہ تصریح نہیں کر سکتی کہ اس کے لئے کیا شرطیں ہونا چاہئیں ان کی نوعیّت اور ان کے دائرے کو معین کرنے کے لئے بہت کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف تو اس کا یقین ہو کہ وہ اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے کافی ہیں اور دوسری طرف یہ اطمینان ہو کہ وہ سیاسی ذمہ دارانہ حکومت کے اصولوں میں اس حد تک مداخلت نہیں کرتیں کہ انھیں باطل کر دیں۔ اس میں مشورتی کمیٹی کو خاص طور پر دخل ہونا چاہیئے کیونکہ نشستوں کے تناسب اور طریق انتخاب کے مسائل کی طرح اس معاملے میں بھی دستور کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ اس کی ترتیب باہمی مفاہمت کی بنیاد پر ہو۔
۱۸۔ آئیے ایک بار اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ لیں ہم نے اپنی منزل کا اتنا بڑا حصّہ طے کر لیا ہے جو بڑے سے بڑے رجائی[1] کے اندازے سے بھی زیادہ ہے

---

[1] optimist

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج کی بحث میں یکے بعد دیگرے بہت سے مقررو ں
نے یہی رائے ظاہر کی۔ یہی رائے صحیح ہے۔ ہماری راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیش
آئیں مگران رکاوٹوں میں سے ایک نے جن کی بدولت نوع انسانی کی اکثر
ترقیاں عمل میں آئی ہیں کہا ہے " رکاوٹیں اسی لئے ہوتی ہیں کہ دور کی جائیں"
ہمیں اپنا کام اسی ہمت اور ولولے کے ساتھ شروع کرنا چاہیئے اور اس خوش
دلی کے ساتھ جو ہمت کا نتیجہ ہے۔ میرا تجربہ اس قسم کی کانفرنس کے متعلق خاصا
وسیع ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ ابتدا میں مفاہمت کی راہ ناہموار اور
رکاوٹوں سے معمور ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلی منزلوں میں انسان کے چھکے چھوٹ
جاتے ہیں مگر دفعتہً اور اکثر خلاف توقع رستہ ہموار ہو جاتا ہے اور ہم بخیر و
خوبی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ میری نہ صرف یہ دعا ہے کہ یہاں
بھی یہی صورت پیش آئے بلکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت پیہم
کوشش کرتی رہے گی کہ ہماری آپ کی محنت اس طرح ٹھکانے لگے۔

تلاشِ حق

یعنی

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی اور ان کے قیمتی تجربات

زندگی کے نشیب و فراز کا ایک مرقع

دو جلدوں میں متعدد فوٹو

قیمت قسم اوّل عـہ، دوم عـہ